دعوت و عزیمت

حصہ پنجم

تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

احیاءِ دین، اشاعتِ کتاب و سنت، اسرار و مقاصدِ شریعت کی توضیح و تنقیح، تربیت و ارشاد اور ہندوستان میں ملتِ اسلامی کے تحفظ اور تشخص کے بقا کی اُن عہد آفریں کوششوں کی روداد، جن کا آغاز حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے اخلاف و خلفاء کے ذریعہ ہوا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام

۱-کے-۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱ کراچی ۱۸

تاریخ دعوت و عزیمت

حصہ پنجم

تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

احیاء دین، اشاعتِ کتاب و سنت، اسرار و مقاصد شریعت کی توضیح و
تنقیح، تربیت و ارشاد اور ہندوستان میں ملت اسلامی کے تحفظ اور تشخص
کے بقا کی ان عہد آفریں کوششوں کی روداد، جن کا آغاز حکیم الاسلام
حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے اخلاف و خلفاء کے ذریعہ ہوا،

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

مجلس نشریاتِ اسلام
۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد، کراچی ۱۸

جملہ حقوق طباعت واشاعت پاکستان میں
بحق فضل ربی ندوی محفوظ ہیں۔

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
اپنی حیات میں مندرجہ ذیل اداروں کے ذمہ دار رہے

- ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
- رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند
- صدر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ
- صدر مجلس انتظامی ومجلس علمی دارالمصنفین اعظم گڑھ
- رکن عربی اکادمی دمشق
- رکن مجلس شوریٰ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ
- رکن مجلس تاسیس رابطۂ عالم اسلامی مکہ معظمہ
- رکن مجلس عاملہ موتمر عالم اسلامی بیروت
- صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ
- صدر رابطۃ الادب الاسلامی العالمیۃ
- رکن مجلس انتظامی اسلامک سینٹر جنیوا
- سابق وزٹنگ پروفیسر دمشق یونیورسٹی ومدینہ یونیورسٹی
- صدر آکسفورڈ سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز آکسفورڈ یونیورسٹی آکسفورڈ۔

نام کتاب ــــــــ تاریخ دعوت وعزیمت (حصہ پنجم)
تصنیف ــــــــ مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
طباعت ــــــــ احمد برادرز پرنٹنگ پریس۔ کراچی
ضخامت ــــــــ ۴۴۸ صفحات
ٹیلیفون : ۶۶۰۱۸۱۷

اسٹاکسٹ، مکتبہ ندوہ قاسم سینٹر اردو بازار کراچی

ناشر

فضل ربی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام ۱۔ کے۔ ۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱ کراچی ۴۶۰۰

تاریخ دعوت

و

عزیمت

حصۂ پنجم ۵

اردو ـــــــــــــــ لکھنؤ وکراچی

عربی بنام " رجال الفکر والدعوۃ فی الاسلام " الجزء الرابع

انگریزی بنام "SAVIOURS OF ISLAMIC SPIRIT VOL. IV"

فہرست عناوین

"تاریخ دعوت و عزیمت حصہ پنجم"

پیش لفظ ۹ ـ ۱۴

باب اول عالم اسلام بارہویں صدی ہجری میں ۱۵ ـ ۴۱

بارہویں صدی کے اسلامی ممالک کے حالات اور انقلابات کے مطالعہ کی اہمیت ۱۵
ہندوستان پر ایران کے ثقافتی و تہذیبی اثرات ۱۸
سلطنت عثمانیہ کی عظمت و اہمیت ۱۹
عالم اسلام کی سیاسی حالت ۲۰
سلطنت عثمانیہ بارہویں صدی میں ۲۰
حجاز کی صورت حال ۲۲
یمن ۲۴
ایران ۲۵
نادر شاہ افشار ۲۶
ایران نادر شاہ کی وفات کے بعد ۲۸
افغانستان اور احمد شاہ ابدالی ۲۹
افغانستان احمد شاہ ابدالی کے بعد ۳۰
عالم اسلام کی علمی و دینی حالت ۳۰
بارہویں صدی کے اہل کمال ۳۱
عالم اسلام کے علمی ادبی و روحانی ذوق پر ایک نظر ۳۴
ایران میں علوم عقلیہ کا غلبہ اور اس کا ہمسایہ ممالک پر اثر ۳۵
عام اخلاقی، معاشرتی اور اعتقادی حالت ۳۸

باب دوم ہندوستان ۴۲ ـ ۶۴

سیاسی حالت ۴۲
اورنگ زیب عالمگیر ۴۳
اورنگ زیب کے کمزور جانشین ۴۵
شاہ عالم بہادر شاہ اول ۱۱۱۹ھ ـ ۱۱۲۴ھ ۴۷
فرخ سیر ۵۰
محمد شاہ بادشاہ (م ۱۱۶۱ھ) ۵۱
شاہ عالم ثانی ۵۷
علمی و روحانی حالت ۵۸
اخلاقی و معاشرتی پستی. ۶۱
اعتقادی کمزوری اور شرک و بدعات کا زور ۶۲

باب سوم شاہ صاحب کے اجداد و والد بزرگوار ۶۵ ـ ۹۶

شاہ صاحب کے اجداد ۶۵
شجرۂ نسب ۶۶

خاندان کی ہندوستان آمد	۶۷
رہتک کا قیام	۶۸
شیخ شمس الدین مفتی سے شیخ وجیہ الدین تک	۶۹
شاہ صاحب کے دادا شیخ وجیہ الدین شہید	۷۱
شاہ صاحب کے نانا شیخ محمد پھلتی	۷۵
شاہ صاحب کے عم محترم شیخ ابوالرضا محمد	۷۶
والد بزرگوار حضرت شاہ عبدالرحیم	۷۸
تعلیم	۸۱
اخلاق وشمائل ومعمولات	۸۶
حمیتِ اسلامی و دور اندیشی	۸۷
ازدواج واولاد	۸۸
وفات	۸۸
حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی نظر میں	۸۹
ہندوستان کے عربی النسل خاندان اور ان کی خصوصیات وروایات	۹۰
باب چہارم مختصر حالات زندگی	۹۷-۱۲۹
ولادت	۹۷
تعلیم	۹۹
شاہ صاحب کا پڑھا ہوا نصاب	۹۹
والد ماجد کی شفقت وتربیت اور اجازت وخلافت	۱۰۲
شادی	۱۰۴
دوسرا عقد	۱۰۵
سفر حج	۱۰۷
شاہ صاحب کے مشائخ واساتذۂ حرمین	۱۰۹
شاہ صاحب کا درس حدیث	۱۱۴
حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی زبانی حضرت شاہ صاحب کے بعض خصائص ومعمولات	۱۱۷
وفات	۱۱۸
مدفن	۱۲۸
باب پنجم شاہ ولی اللہ صاحب کے تجدیدی کارنامے، اصلاح عقائد ودعوت إلی القرآن	۱۳۰ — ۱۶۸
شاہ صاحب کے دائرۂ تجدید کی وسعت اور تنوع	۱۳۰
عقائد کی اہمیت	۱۳۲
عقیدۂ توحید کی از سر نو تبلیغ وتشریح کی ضرورت	۱۳۵
مرض کا علاج اور اصلاحِ حال کا مؤثر طریقہ، اشاعتِ قرآن	۱۴۰
شاہ صاحب کے بعد کے اردو تراجم	۱۴۸
درس قرآن	۱۵۰
"الفوز الکبیر"	۱۵۰
مسئلۂ توحید کی علمی تنقیح وتحقیق	۱۵۴
عقائد کی تفہیم وتشریح کتاب وسنت کی روشنی میں اور صحابہؓ وسلف کے مسلک کے مطابق	۱۶۳

باب ششم حدیث و سنت کی اشاعت و ترویج اور فقہ و حدیث میں تطبیق کی دعوت و سعی ۱۶۹ — ۲۱۴

حدیث کی اہمیت اور ہر ملک اور ہر دور میں اس کی ضرورت ۱۶۹
حدیث امت کے لئے صحیح میزان و معیار ۱۷۰
تاریخ اسلام میں اصلاح و تجدید کی تحریکیں علم حدیث سے وابستہ ہیں ۱۷۲
علم حدیث اور عرب ۱۷۶
ہندوستان میں علم حدیث کا عروج و زوال ۱۷۷
شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا کارنامہ ۱۸۰
ایک مجدد کی ضرورت ۱۸۱
حدیث کے بارے میں شاہ صاحب کے خیالات و جذبات ۱۸۴
ہندوستان میں علم حدیث سے بے اعتنائی کا شکوہ ۱۸۶
خدمت و اشاعتِ حدیث کی سرگرمی ۱۸۹
شاہ صاحب کی تصنیفی خدمات ۱۹۲
تطبیق بین الفقہ والحدیث ۱۹۶
اجتہاد و تقلید کے درمیان نقطۂ اعتدال ۲۰۴
قرون اولیٰ میں مسلمانوں کا طرز عمل ۲۰۵
تقلید کی جائز اور فطری شکل ۲۰۸
مذاہبِ اربعہ کی خصوصیت ۲۱۰
ہر زمانہ میں اجتہاد کی ضرورت ۲۱۳

باب ہفتم شریعتِ اسلامی کی مربوط و مدلل ترجمانی اور اسرار و مقاصد حدیث کی نقاب کشائی "حجۃ اللہ البالغہ" کے آئینہ میں ۲۱۵ — ۲۴۸

"حجۃ اللہ البالغہ" کا امتیاز و انفرادیت ۲۱۵
موضوع کی نزاکت ۲۱۷
مستقل تالیف کی ضرورت اور علمائے متقدمین کی ابتدائی کوششیں ۲۱۹
تمہیدی و بنیادی مضامین، تکلیف و مجازات ۲۲۱
اعمال کی اہمیت اور ان کے اثرات ۲۲۳
ارتفاقات ۲۲۴
ارتفاق کی اہمیت ۲۲۵
شہری و اجتماعی زندگی کی اہمیت اور ان کی تشکیل ۲۲۶
مکاسب اور وجوہ معاش کی محمود و مذموم شکلیں ۲۲۸
سعادت اور اس کے اصول چہارگانہ ۲۳۰
عقائد و عبادات ۲۳۱
سیاساتِ ملی اور انبیاء کی ضرورت ۲۳۳
بعثتِ مقرونہ ۲۳۴
ایرانی و رومی تمدن میں اخلاقی و ایمانی قدروں کی پامالی اور انسانیت کی زبوں حالی ۲۳۵
بعض دوسری مفید بحثیں ۲۳۷

حدیث وسنت کا مقام اور ان کے بارے میں امت کا طرزِ عمل	۲۳۸
فرائض و ارکان کے اسرار و حِکَم	۲۳۹
کتاب کی جامعیت	۲۴۴
احسان و تزکیۂ نفس	۲۴۴
جہاد	۲۴۶

باب ہشتم ۸

نظامِ خلافت کی ضرورت و افادیت، خلفائے راشدین کی خلافت کا ثبوت اور ان کے احسانات کتاب "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" کے آئینہ میں ۲۴۹ — ۲۷۴

کتاب "ازالۃ الخفا" کی اہمیت و انفرادیت	۲۴۹
"حجۃ اللہ" اور "ازالۃ الخفا" کا باہمی تعلق	۲۵۱
چند قدیم تصنیفات	۲۵۵
اسلام میں خلافت کی حیثیت و مقام	۲۵۸
خلافت کی جامع و مانع تعریف	۲۶۱
خلفائے راشدین کی خلافت پر قرآن سے استدلال	۲۶۳
کتاب کے دوسرے قیمتی مضامین	۲۶۹
وفاتِ نبوی کے بعد کے تغیرات و فتن کی نشاندہی	۲۷۲
کتاب کی طباعت و اشاعت	۲۷۳

باب نہم ۹

سیاسی انتشار اور حکومتِ مغلیہ کے دورِ احتضار میں شاہ صاحب کا مجاہدانہ و قائدانہ کردار ۲۷۵ — ۳۲۲

تین نوخیز جنگجو طاقتیں	۲۷۵
مرہٹے	۲۷۵
سکھ	۲۸۱
جاٹ	۲۸۷
دہلی کی حالت	۲۸۹
حملۂ نادری	۲۹۱
ناساعد و زلزلہ انگیز حالات میں تدریس و تصنیف کی یکسوئی	۲۹۱
سیاسی انتشار اور حکومتِ مغلیہ کے دورِ احتضار میں مجاہدانہ و قائدانہ کردار	۲۹۴
شاہ صاحب کا احساس و اضطراب	۲۹۵
مغل بادشاہوں اور ارکانِ سلطنت کو نصیحت و مشورہ	۲۹۸
نواب نجیب الدولہ	۳۰۵
احمد شاہ ابدالی	۳۱۱

باب دہم ۱۰

امت کے مختلف طبقات کا احتساب اور ان کو دعوتِ اصلاح و انقلاب ۳۲۳ — ۳۴۲

شاہ صاحب کا امتیاز ۳۲۳
مختلف طبقاتِ امت سے خصوصی خطاب ۳۲۵
سلاطین اسلام سے خطاب ۳۲۶
امراء و ارکانِ دولت سے خطاب ۳۲۸
فوجی سپاہیوں کو خطاب ۳۲۹
اہل صنعت و حرفت سے خطاب ۳۳۰
مشائخ کی اولاد یعنی پیرزادوں سے خطاب ۳۳۱
غلط کار علماء سے خطاب ۳۳۳
دین میں تنگی پیدا کرنے والے واعظوں اور کنج نشیں زاہدوں سے خطاب ۳۳۴
عام امتِ مسلمہ سے جامع خطاب، امراض کی تشخیص اور علاج کی تجویز ۳۳۶
اصلاحِ رسوم و تطہیر معاشرہ ۳۳۹

باب یازدہم ۱۱
فرزندانِ گرامی قدر، خلفائے عالی مرتبت، نامور معاصر ۳۴۳ - ۳۹۷

لائق فرزندان و جانشین ۳۴۳
عجیب مماثلت ۳۴۴
حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ ۳۴۶
شاہ صاحب کے خصوصی کاموں کی توسیع و تکمیل ۳۵۴
اشاعت و تبلیغ قرآن ۳۵۵
حدیث کی تدریس و ترویج ۳۵۸
نصرتِ سنت و ردِّ شیعہ ۳۶۱
انگریزی اقتدار کی مخالفت اور مسلمانوں کا ملی تحفظ ۳۶۵
مردانِ کار کی تربیت ۳۷۳
حضرت سید احمد شہیدؒ ۳۷۳
مولانا عبدالحی بڑھانویؒ اور مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ ۳۷۷
مولانا شاہ محمد اسحاق صاحبؒ و شاہ محمد یعقوب صاحبؒ ۳۷۹
اجلۂ علماء و اساتذۂ کبار ۳۸۰
شاہ رفیع الدین دہلویؒ ۳۸۲
شاہ عبدالقادر دہلویؒ ۳۸۵
شاہ محمد عاشق پھلتی ۳۸۷
خواجہ محمد امین کشمیری ولی اللہیؒ ۳۹۰
شاہ ابو سعید حسنی رائے بریلویؒ ۳۹۱
ایک نامور معاصر و مصلح شیخ محمد بن عبدالوہابؒ ۳۹۴

باب دوازدہم ۱۲
حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تصنیفات
۳۹۸ — ۴۱۵

کتب و رسائل ۳۹۸
انڈکس۔ مرتبہ از محمد غیاث الدین ندوی ۴۱۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین
وخاتم النبیین محمد وآلہ وصحبہ اجمعین ومن تبعھم باحسان
ودعا بدعوتھم الی یوم الدین

مصنف کتاب کا قلب "تاریخ دعوت وعزیمت" کے پانچویں حصہ کی تسوید سے فارغ ہو کر پیش لفظ کی ان سطور کے لکھتے وقت جذبۂ حمد وشکر سے معمور اور اس کا قلم اپنے اور کاتب کے خالق کے حضور میں سر بسجود ہے کہ اس نے اس سلسلہ کو اس حصہ تک جو حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے اخلاف وخلفاء کی دینی وعلمی خدمات اور ان کے مجددانہ ومجاہدانہ کارناموں کی تاریخ وروئیداد سے مخصوص ہے پہونچانے کی توفیق عطا فرمائی۔

محرم ۱۳۷۲ھ (ستمبر ۱۹۵۲ء) میں چند تقریروں کی ایک مختصر یادداشت کو سامنے رکھ کر جب "تاریخ دعوت وعزیمت" کے سلسلہ کا آغاز کیا گیا تھا، اور اس کو سیدنا امام حسن بصریؒ اور خلیفۃ المسلمین حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے شروع کیا گیا تھا، تو اس وقت اس کا تصور کرنا بھی مشکل تھا کہ یہ سلسلہ پہلی دوسری صدی کے مصلحین ومجددین سے لے کر تمام درمیانی مراحل اور عالم اسلام کی زمانی ومکانی وسعت ورقبہ کو طے کرتا ہوا گیارہویں بارہویں صدی

کی دو عظیم تجدیدی شخصیتوں حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ تک پہونچ سکے گا، عمر کی بے ثباتی، صحت کے نشیب و فراز، حوادث کی کثرت، اشاغل کے ہجوم، عزم و ہمت کی کوتاہی، اسفار کے تسلسل، نئی نئی ضرورتوں اور محرکات کے پیش آنے، پھر نگاہ کی اس کمزوری اور معذوری کے باوجود (کہ مصنف مسلسل چودہ سال تک براہ راست مطالعہ اور خود لکھنے سے معذور رہا) یہ سلسلہ اس منزل تک پہونچے گا، یہ محض قدرت و توفیق الٰہی کا کرشمہ ہے، جس پر مصنف خدا کا جتنا بھی شکر ادا کرے کم ہے، مصنف اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا کہ قرآن مجید کی اس آیت کے ذریعہ یہ فرض ادا کرنے کی کوشش کرے :-

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ	اے پروردگار! مجھے توفیق عطا فرما کہ
الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ	جو احسان تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ
وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ	پر کئے ہیں ان کا شکر کروں اور ایسے
وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِکَ فِیْ عِبَادِکَ	نیک کام کروں کہ تو ان سے خوش
الصّٰلِحِیْنَ ○	ہو جائے اور مجھے اپنی رحمت سے
(النمل - ۱۹)	اپنے نیک بندوں میں داخل فرما۔

نیز حدیث کے یہ الفاظ دہرائے :-

الحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ	اس خدا کا شکر ہے جس کی عزت وجلال
تتم الصالحات۔	سے نیک کاموں کی توفیق و تکمیل ہوتی ہے۔

اس جلد پر حقیقتاً صالحین کے تذکرہ کے اس سلسلہ کا اور اس حیثیت سے اس عمل صالح کا اتمام ہوتا ہے کہ یہ حصہ بارہویں صدی ہجری کی ان اصلاحی و تجدیدی کوششوں اور کارناموں پر مشتمل ہے، جن کے مبارک اثرات ابھی تک باقی ہیں، اور کم سے کم برصغیر ہند کے

دینی ادارے، علوم دینیہ کے مراکز، اسلام کی سربلندی کی کوششیں اور تحریکات، اور دینی، علمی و تصنیفی سرگرمیاں اُن مساعی کے نتائج سے ابھی تک متمتع ہو رہی ہیں، اور ان کے سایہ میں اپنا سفر طے کر رہی ہیں، اور اس لئے بھی یہ بات خلافِ واقعہ نہیں ہے کہ مصنفِ "سیرت سید احمد شہیدؒ" (۱-۲) کی تالیف کے ذریعہ جو ۱۹۳۹ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی، اس سلسلہ کو تیرھویں صدی کے آخر تک (اور جہاں تک اس تحتی برِّ اعظم کا تعلق ہے) چودھویں صدی کی کئی دینی شخصیتوں اور داعیوں (جن میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں) کی سوانح مرتب کر کے اس سلسلہ کو اپنے زمانہ تک پہونچا چکا ہے، اس طرح درحقیقت "تاریخ دعوت وعزیمت" کا چھٹا حصہ بھی اور ساتویں حصہ کا بڑا حصہ بھی مرتب ہو چکا ہے، اب یہ اس کے بعد کے مصنفین اور تحقیقی کام کرنے والوں کا کام ہے کہ تیرھویں صدی ہجری کے عالم اسلام کے علمبرداران اصلاح و دعوت اور دینی قائدین کی خدمات اور کارناموں پر روشنی ڈالیں، جو عالم اسلام کے مختلف حصوں میں پیدا ہوئے اور انھوں نے دعوت و اصلاح اور جہاد فی سبیل اللہ کا کام انجام دیا، پھر چودھویں صدی ہجری کی (عالم اسلام کے پیمانہ اور سطح پر) اصلاحی علمی و فکری اور دعوتی کوششوں کا جائزہ لیں اور اس کی روئیداد مرتب کریں کہ "تاریخ دعوت وعزیمت" کا موضوع کسی خاص عہد اور ملک سے مخصوص نہیں، اس کا سلسلہ دعوتی و اصلاحی کوششوں، فکر اسلامی کی تجدید، علوم دینیہ کے احیاء و اشاعت، اپنے اپنے زمانہ کے مغالطوں اور تحریفات کا پردہ چاک کرنے اور دین کی حقیقت، روح اور جوہر کو بے نقاب کرنے، اپنے اپنے زمانہ کے فتنوں اور ضلالتوں کے مقابلہ اور ان کے ازالہ کی کوششوں کے ساتھ اس وقت تک چلتا رہے گا جب تک یہ دین

باقی ہے اور یہ دنیا قائم ہے اس لئے کوئی شخص بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے اس موضوع کا حق ادا کردیا، اور اس سلسلہ کو اختتام تک پہونچا دیا کہ حدیث کے الفاظ ہیں:۔

یحمل هذا العلم من کل خلف عدولہٗ ینفون عنہ تحریف الغالین، وانتحال المبطلین، وتأویل الجاھلین۔[1]	اس علم کے ہر نسل میں ایسے عادل و متقی حامل و وارث ہوں گے، جو اس دین سے غلو پسند لوگوں کی تحریف اہل باطل کے غلط انتساب و دعوے اور جاہلوں کی دوراز کار تاویلات کو دور کرتے رہیں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی اصلاح و تجدید کا دائرہ چونکہ اپنے اندر بڑی وسعت اور تنوع رکھتا تھا، اور اس میں علمی و فکری رنگ غالب تھا، اس کے حدود میں تدریس و تصنیف، اشاعتِ کتاب و سنت، تطبیق بین العقل والنقل اور توفیق بین المذاھب الفقھیۃ، اسرار و مقاصدِ شریعت کی توضیح، آنے والے عقلی دور کی رعایت، تربیت وارشاد، ہندوستان میں اسلامی اقتدار کی حفاظت، سیاسی تبدیلیوں اور ابھرتی ہوئی طاقتوں کا حقیقت پسندانہ جائزہ اور ان میں ملت کے تحفظ اور تشخص کے بقا کی ممکنہ تدبیریں، علوم اسلامیہ میں مجتہدانہ فکر و نظر، اور اس کی طبقۂ علماء کی طرف منتقلی کی کوششیں سب شامل تھیں اس لئے مصنف کو اس میں اس مطالعہ و فکر و نظر کی ضرورت پیش آئی جو کم حصوں میں پیش آئی تھی، اسی کے ساتھ دوسری مصروفیتیں اور

---

[1] مشکوٰۃ شریف۔

ذمہ داریاں بھی عناں گیر رہیں، پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ اس حصہ کی تکمیل میں وہ طویل وقفہ نہیں ہوا، جو اس سے پہلے دو حصوں کے درمیان عموماً پیش آتا تھا۔

مصنف اپنے اُن عزیز رفقائے کار و معاونین کا شکر گذار ہے، جنھوں نے مآخذ کی فراہمی، بعض طویل فارسی و عربی عبارتوں کے ترجمہ اور کتاب کی تسوید و تبییض اور نظر ثانی میں مدد کی، نیز مطبوعہ اور قلمی کتابوں اور ان کے ایڈیشنوں کی تحقیق میں ان کی محنت اور کوشش شامل ہے، ان میں مولوی شمس تبریز خاں رفیق "مجلس تحقیقات ونشریات اسلام" مولانا محمد برہان الدین سنبھلی استاذ تفسیر و حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء، مولوی عتیق احمد صاحب مدرس دار العلوم ندوۃ العلماء، مولانا ابو العرفان صاحب ندوی استاد دار العلوم ندوۃ العلماء، مولوی سید محمد مرتضیٰ صاحب الحسنی نقوی ناظر کتب خانہ ندوۃ العلماء اور مولوی محمد ہارون سلمہ انچارج شعبۂ مخطوطات کتب خانہ ندوۃ العلماء، اور عزیزی مولوی نثار الحق ندوی خاص طور پر قابل ذکر و شکر ہیں، عزیز گرامی مولوی نور الحسن راشد صاحب کاندھلوی خاص طور پر شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے شاہ صاحبؒ کے خاندانی حالات و اخلاف کے سلسلہ میں بعض قیمتی معلومات فراہم کیں، اور بعض مآخذ کی نشاندہی کی، عزیزان مولوی غفران ندوی و مولوی غیاث الدین ندوی نے حسب سابق کتابت و طباعت کی تکمیل اور انڈکس کی تیاری میں پوری ذمہ داری اور انہماک کے ساتھ حصہ لیا، فجزاھم اللہ خیراً۔

آخر میں مصنف کی یہ دعا اور تمنا ہے کہ یہ حصہ کسی درجہ میں بھی (یہ تو کہنے کی جرأت نہیں کی جا سکتی کہ اس بلند و بالا شخصیت کے شایان شان ہو جس سے اس کا تعلق ہے) موضوع و مقصد کے لحاظ سے مفید، ہمت آفریں، فکر انگیز، مزید مطالعہ اور تحقیق کے لئے محرک اور سعی و جہد کے لئے شوق انگیز ہو کہ اس دورِ انقلاب اور اس عہدِ پُر فتن میں

اس سے خاص طور پر رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

وما ذلک علی اللہ بعزیز

ابوالحسن علی ندوی

۹۔ بے نظیر بلڈنگ بائی کلہ بمبئی

۱۲ ربیع الثانی سنہ ۱۴۰۴ھ
۱۶ جنوری سنہ ۱۹۸۴ء
دوشنبہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بابِ اوّل

عالمِ اسلام بارہویں صدی ہجری میں

بارہویں صدی کے اسلامی ممالک کے حالات اور انقلابات کے مطالعہ کی اہمیت

"تاریخ دعوت و عزیمت" کی جلد چہارم کے آغاز میں (جو مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ (۹۷۱ھ – ۱۰۳۴ھ) کی سوانح حیات ان کے عہد اور ان کے عظیم تجدیدی و انقلابی کارنامہ کی شرح و تفصیل کے ساتھ مخصوص ہے) دسویں صدی ہجری کے (جس میں حضرت کی ولادت ہوئی اور آپ کا ذہنی و علمی نشو و نما ہوا) تاریخی مطالعہ کی اہمیت بیان کرتے ہوئے مصنف نے لکھا تھا:۔

"ہم کو اس تاریخی حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا کہ ایک عہد اس عہد کی دنیا، اور انسانی معاشرہ ایک بہتے ہوئے دریا کی طرح ہوتا ہے جس کی ہر موج دوسری موج سے مربوط و متصل ہوتی ہے اس لئے کوئی ملک خواہ وہ باقی دنیا سے کتنا ہی کٹا ہوا اور الگ تھلگ زندگی گذار رہا ہو گرد و پیش کی دنیا میں پیش آنے والے اہم واقعات، انقلابات، باہم نبرد آزما طاقتوں اور طاقتور تحریکوں سے یکسر غیر متاثر اور غیر متعلق نہیں رہ سکتا، خاص طور پر جب یہ واقعات، و انقلابات اس کے ہم جنس، ہم مسلک اور ہم عقیدہ پڑوسی ممالک میں پیش آرہے ہوں، اس بنا پر اس تاریخی جائزہ میں ہندوستان کے دائرہ کے اندر محدود رہنا درست نہیں ہوگا، ہم کو دسویں صدی ہجری کی پوری دنیائے اسلام اور خاص طور پر

گردوپیش کے مسلم ممالک پر بھی نظر ڈالنی ہوگی جن سے اگرچہ ہندوستان کے سیاسی روابط نہ تھے لیکن دینی، تہذیبی اور علمی روابط تھے اور وہاں جو سرد گرم ہوائیں چلتی تھیں ان کے جھونکے بُعد مسافت کے باوجود ہندوستان تک بھی پہونچ جاتے تھے۔[1]

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ اور ان کے تجدیدی کارنامہ پر روشنی ڈالنے کے سلسلہ میں اس تاریخی حقیقت کو پیش نظر رکھنے اور اس اصول پر عمل کرنے کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے کہ ان کی ذہنی و علمی تربیت میں حجاز مقدس کا بنیادی حصہ تھا، جہاں انھوں نے (۱۱۴۳ھ تا ۱۱۴۵ھ) ایک سال سے زیادہ[2] قیام فرمایا، اور اس وقت کے فن حدیث میں مرجع خلائق اور امام فن شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی سے فن حدیث کی تکمیل کی، جن کے حلقۂ درس میں بلاد و امصار کے طالبین حدیث مجتمع تھے، اور علمائے حرمین سے (جو مختلف ممالک اسلامیہ اور عربیہ سے تعلق رکھتے تھے) ان کی طویل صحبتیں رہیں، اس وقت حجاز سلطنت عثمانیہ کی تولیت اور انتظام میں تھا، اور شرفائے مکہ سلاطین آل عثمان کے نائب کی حیثیت سے امارت کے منصب پر سرفراز تھے، حج کے علاوہ بھی (جو ہر سال عالم اسلام کے بہترین دل و دماغ اور شمع حرم کے پروانوں کو ایک جگہ جمع کر لیتا ہے) اس دور میں حرمین شریفین اور خاص طور پر مدینہ طیبہ علم حدیث کا سب سے بڑا مرکز بنا ہوا تھا، جہاں اس علم کے شائقین دنیا کے گوشہ گوشہ سے اکٹھا ہوتے تھے، وہاں بیٹھ کر پورے عالم اسلام کی روحانی، علمی، اخلاقی، تمدنی، معاشرتی اور سیاسی حالت کا جائزہ بآسانی لیا جا سکتا تھا، ان تمام حیثیتوں سے مختلف ممالک اسلامیہ و عربیہ کی ترقی و انحطاط اور عروج و زوال کا بآسانی اندازہ کیا جا سکتا تھا، اور وہاں کی مختلف شخصیتوں، باکمال افراد، اصلاحی تحریکوں و دعوتوں اور

---

[1] تاریخ دعوت و عزیمت، حصہ چہارم، ص ۲۲ [2] شاہ صاحب ۱۱۴۳ھ کے آخر میں حجاز پہونچے تھے، اور ۱۱۴۵ھ کے آغاز میں مراجعت فرمائی، شاہ صاحب نے دو حج کیے۔

انتشار انگیز کوششوں اور سازشوں سے واقفیت حاصل کی جا سکتی تھی، بلکہ عالم اسلام کی نبض حیات کی رفتار اور قلب اسلام کی دھڑکنوں کو سنا جا سکتا تھا، اور شاہ ولی اللہ صاحب جیسے بیدار مغز اور دردمند دل رکھنے والے انسان نے جس کو تدبیر الٰہی تجدید و احیائے دین کے کار عظیم کے لیے تیار کر رہی تھی، اس سے ضرور فائدہ اٹھایا اور اثر لیا ہوگا، اور انھوں نے اس سے اپنے فکر و نظر کی توسیع اور اپنی دعوت اور فلسفہ کی آفاقیت میں پورا کام لیا ہوگا۔

مزید برآں ہند ’ ن صدیوں سے وسط ایشیا کی تورانی و افغانی نسل کے ترک تازوں کی جولان گاہ اور سیاسی و انتظامی حیثیت سے ان کے زیر اثر رہ چکا تھا اور وقتاً فوقتاً اسکے نظم و نسق کے ڈھانچہ اور اس کی حکومتوں کے اثر پذیر جسم میں وہیں سے تازہ اور گرم خون آتا اور اس کے رو بزوال انتظامیہ اور فوجی طاقت میں نئی توانائی اور رعنائی پیدا کرتا تھا، اور جب ہندوستان میں مدت دراز سے حکومت کرنے والا خاندان "پیری و صد عیب" کی منزل پر پہونچ جاتا، تو درۂ خیبر یا درۂ بولان کے راستے سے ایک تازہ دم عسکری طاقت ہندوستان میں قدم رکھتی، اور اس سلسلۂ حکومت میں، جس کا ایک ہی دین (اسلام) ایک ہی مذہب (اہل سنت والجماعۃ) ایک ہی آئین (شریعِ محمدیؐ) ایک ہی زبان (ترکی و فارسی) اور ایک ہی تہذیب (عربی، ایرانی، ترکی، ہندوستانی اثرات کا آمیزہ) تھی، طاقت کا ایک انجکشن دیتی اور اس کو زندگی کی ایک نئی قسط عطا کر دیتی۔

پھر اس حقیقت کو بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ بابر کے تسخیر ملک اور سلطنت مغلیہ کے قیام کے بعد سے افغانستان اور اس کے اہم ترین صوبے کابل و قندھار عظیم ہندوستانی مسلمان سلطنت کا ایک حصہ اور اس کا بیرونی قلعہ اور "بالا حصار" رہے ہیں، شاہ صاحب ہی کے عہد میں نادر شاہِ ایران کی ہندوستان میں آمد اور دہلی پر حملہ ہوا، اور آپ ہی کے عہد میں والیٔ قندھار احمد شاہ ابدالی نے کئی بار ہندوستان کا رخ کیا، اور بالآخر ۱۱۷۴ھ (۱۷۶۱ء) میں پانی پت کے

میدان میں مرہٹوں کو شکست فاش دے کر واقعات کا دھارا اور تاریخ کا رُخ بدل دیا، اور سلطنت مغلیہ کو سنبھلنے، اور ہندوستان کے مسلم معاشرہ اور طبقۂ امراء کو نیا کردار ادا کرنے کا موقع دیا جس کو وہ اپنی نااہلی سے ادا نہیں کر سکے، یہ سب واقعات نہ صرف شاہ صاحب کے عہد کے ہیں، بلکہ آخر الذکر واقعہ میں ان کی رہنمائی شامل ہے[1]، یہ دونوں حملہ آور ایران و افغانستان سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے شاہ صاحب کے عہد اور بارہویں صدی کے جائزہ میں ان دونوں کے حالات اور انقلابات سلطنت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ہندوستان پر ایران کے ثقافتی و تہذیبی اثرات

پھر جس طرح ہندوستان پانچویں صدی ہجری سے سیاسی اور فوجی حیثیت سے ترکستان و افغانستان کے زیر اثر رہا ہے، اسی طرح وہ علمی، ادبی، ثقافتی، تہذیبی اور فکری حیثیت سے کم و بیش ایران کے زیر اثر رہا ہے؛ وہاں کا ادب و شاعری، تصوف کے سلاسل و طرق، اور آخر میں وہاں کا نصاب درس اور طریقۂ تعلیم، اور وہاں کے علماء اور اساتذۂ فن کی تصنیفات ہندوستان کے ذہن و دماغ پر سایہ فگن رہی ہیں، بالخصوص ہمایوں کے ایران جانے اور وہاں کی مدد سے سلطنتِ ہندوستان کے دوبارہ حصول کے بعد سے، پھر دورِ اکبری میں امیر فتح اللہ شیرازی اور حکیم علی گیلانی کی آمد کے بعد سے ہندوستان اپنے نصاب، طریقۂ تعلیم، معیارِ فضیلت کے تعین اور "معقولات و علوم حکمت" کے میدان میں ایران کا کُلّیۃً خوشہ چیں بلکہ باج گذار اور غاشیہ بردار بن گیا، اور اس سلسلہ میں حقیقتاً ایران کا ہندوستان پر "اقتدارِ اعلیٰ" قائم ہو گیا، اس حقیقت کے پیش نظر ہم اس تاریخی جائزہ میں ایران اور اس میں پیش آنے والے واقعات سے کسی طرح صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔

---

[1] اس کی تفصیل بعد کے ابواب میں آئیگی۔

سلطنت عثمانیہ کی عظمت و اہمیت

افغانستان و ایران کے پڑوسی ملکوں کے ماسوا ہم اس سلطنت عثمانیہ سے بھی (جس نے دسویں صدی کے اوائل سے خلافت کا منصب سنبھال رکھا تھا) آنکھیں نہیں بند کرسکتے جس کا مستقر اگرچہ جغرافیائی اعتبار سے ہندوستان سے بہت دور یورپ اور ایشیا کے چوک میں واقع تھا، لیکن تقریباً تمام عرب ممالک (مصر، شام، عراق، یمن، نجد و حجاز اور شمالی افریقہ کا ایک بڑا حصہ) اس کے ماتحت تھے، حرم و مقامات مقدسہ کے پاسبان و متولی ہونے، خلافت اسلامی کے حامل و امین، ایک بڑی طاقت اور شہنشاہی کی حیثیت سے بھی اور مغرب اور مخالف اسلام طاقتوں کی نگاہ میں اسلامی طاقت کا نشان اور بہت سے اسلامی مقامات کا محافظ و پاسبان ہونے کی بناء پر بھی تمام دنیا کے مسلمان اس کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے، اور وہاں پیش آنے والے واقعات سے نہ صرف دلچسپی رکھتے تھے، بلکہ اثر لیتے تھے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسا عالمی ذہن رکھنے والا انسان جس کی تاریخ اسلام پر گہری نظر تھی سلطنتِ عثمانیہ سے صرفِ نظر نہیں کرسکتا تھا، وہ خلافت کی شرعی حیثیت اور سیاسی و اجتماعی اہمیت کے رمز آشنا تھے، اور دین و اخلاق اور صالح معاشرہ اور صحت مند تمدن و معیشت کے لئے آزاد حکومت و غیر فاسد سیاسی طاقت کو ضروری سمجھتے تھے، اور مسلمانوں کو نہ صرف اپنے ملک بلکہ بساطِ عالم پر ایک مؤثر اور صاحب امر و نہی طاقت کے طور پر دیکھنے کے آرزومند تھے، وہ مسلمانوں کی سب سے بڑی سلطنت کے عروج و زوال اور اس کے داخلی سکون و انتشار کی طرف سے کیسے آنکھیں بند کرسکتے تھے، خصوصاً جبکہ وہ ایک سال سے زائد اس کے محبوب ترین اور معزز ترین دائرہ حکومت حجاز میں کھلی ہوئی آنکھوں، بیدار دماغ اور حساس دل کے ساتھ قیام کرچکے تھے، اور اس کے مقبوضات اور زیر انتظام ملکوں مصر و شام و عراق سے آنے والوں کی زبانی ان اثرات کا جائزہ لے چکے تھے، جو سلاطین آل عثمان، ان کے وزراء

شیوخ اسلام اور علمائے ترکی کے رجحانات و نفسیات کے نتیجہ میں ان ملکوں کے علمی و دینی حلقوں پر پڑ رہے تھے، اس لئے ہمیں بارہویں صدی ہجری (اٹھارویں صدی عیسوی) میں سلطنت عثمانیہ، اس کے اپنے پڑوس کے عیسائی مغربی ممالک سے تعلقات، شکست و ریخت اور عزل و نصب اور سیاسی طاقت کے مدوجزر پر بھی ایک اجمالی نگاہ ڈالنی ہوگی۔

عالم اسلام کی سیاسی حالت

ہم پہلے اس وقت کے عالم اسلام کی سیاسی حالت، حکومتوں کے انقلابات اور اہم حوادث پر نظر ڈالیں گے، پھر عالم اسلام کا علمی، دینی، اخلاقی روحانی جائزہ لیں گے۔

سلطنت عثمانیہ بارہویں صدی میں

شاہ صاحبؒ ۱۱۱۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۷۶ھ میں انھوں نے وفات پائی، اس عرصہ (۶۲ سال) میں سلطنت عثمانیہ کے تخت پر پانچ سلاطین، مصطفےٰ ثانی (م ۱۱۱۵ھ) احمد ثالث (م ۱۱۴۳ھ) محمود اول (م ۱۱۶۸ھ) عثمان ثالث (م ۱۱۷۱ھ) اور مصطفےٰ ثالث (۱۱۷۱ھ–۱۱۸۷ھ / ۱۷۵۷ء–۱۷۷۴ء) آئے اور گئے۔

شاہ صاحبؒ کے زمانۂ شعور اور فکر و عمل میں احمد ثالث، محمود اول، عثمان ثالث اور مصطفےٰ ثالث نے عنان سلطنت و خلافت سنبھالی، لیکن اہم مدت (شاہ صاحبؒ کے آخری پانچ سال کا زمانہ) مصطفےٰ ثالث کے عہد میں گذری۔

مصطفےٰ ثالث نے سولہ برس آٹھ مہینے حکومت کی، ان کے زمانہ میں سلطنت عثمانیہ اور روس کے درمیان جنگ چھڑی، سلطنت عثمانیہ کو اس جنگ (۱۱۷۹ھ) میں شکست ہوئی، جس پر روس کا کوئی

کارنامہ نہ تھا بعض حوادث اور انتظامات کی کمی کو دخل تھا۔[۱] الفنسٹن روسی جنرل نے قسطنطنیہ پر بھی حملہ کا ارادہ کیا، لیکن اس کو باز رکھا گیا، مصطفےٰ خاں نے فوج کی تقویت اور عسکری اصلاحات کی طرف بھی قدم اٹھایا اور کچھ فوجی کامیابیاں بھی حاصل کیں، روس نے صلح کے لئے کچھ شرطیں پیش کیں، جو توہین آمیز تھیں، بخارسٹ میں ۱۳ر شعبان ۱۱۸۶ھ (شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی وفات کے دس سال بعد) ۹ر نومبر ۱۷۷۲ء میں کانفرنس ہوئی جس میں کچھ شرطیں پیش کی گئیں، سلطنت عثمانیہ نے ان کو ٹھکرا دیا، اور ترکی افواج کو جنگ شروع کرنے کا حکم دیا، جنگ کے نتیجہ میں روس کو شکست فاش ہوئی، روسیوں کی مرعوبیت کا یہ حال تھا کہ عثمانی افواج جب بازارجق (اب جو TOBULKHIN کہلاتا ہے) سے گذریں تو شہر کی پوری آبادی شہر چھوڑ کر چلی گئی، مؤرخ ہمر (HEMER) لکھتا ہے کہ "عثمانیوں نے آگ پر چڑھی ہوئی ہانڈیاں پائیں جن میں گوشت تھا" ۸ر ذی قعدہ ۱۱۸۷ھ (۲۱ر جنوری ۱۷۷۴ء) کو سلطان مصطفےٰ ثالث نے وفات پائی، مؤرخین اس کے عدل اور امور خیر کی خواہش و کوشش کی تعریف کرتے ہیں، اس نے اپنے زمانہ میں بہت سے مدارس اور خانقاہیں قائم کیں۔[۲]

شاہ صاحبؒ کا عہد شباب تھا کہ سلطنت عثمانیہ میں مطبعوں کا رواج ہوا، اور پہلا مطبعہ قسطنطنیہ میں قائم ہوا، اسی عہد میں نجد و حجاز میں شیخ محمد بن عبد الوہاب (۱۱۱۵ھ-۱۲۰۶ھ) کی تحریک نے فروغ پایا[۳] عثمان ثالث کے

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ" از محمد فرید بک المحامی۔ طبع بیروت

[۲] "تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ" ص ۳۳۹-۳۴۰

[۳] بعد میں سعود بن عبد العزیز (۱۱۶۳ھ-۱۲۲۹ھ) امیر نجد نے اسی دعوت مجاہدانہ جوش اور فوجی تنظیم کی طاقت سے ۱۲۱۸ھ میں حجاز اور جزیرۃ العرب کے بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا، ۱۲۳۳ھ میں خدیو محمد علی والی مصر کی کوشش سے اس حصہ پر دوبارہ ترکی سلطنت کا مکمل قبضہ ہوا، نجدی امیر عبد اللہ بن سعود بن عبد العزیز قسطنطنیہ بھیج دیئے گئے، جہاں وہ قتل کر دیئے گئے۔

زمانہ میں علی بے (الملقّب بہ شیخ البلد) مصر کی حکومت و انتظامات پر پورے طور پر حاوی ہو گئے، انھوں نے روسی جنرل کے ساتھ جو بحرِ روم پر متعین تھا، سازش کرلی اور شرط کی کہ وہ ذخائر اور اسلحہ سے ان کی مدد کرے گا، تاکہ مصر خود مختار ہو جائے، اس کی مدد سے علی بے غزہ، نابلس، قدس، یافہ اور دمشق پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوا، وہ اناطولیہ کے حدود کی طرف رخ کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ مملوک سرداروں میں سے ایک سردار محمد بے مشہور بأبی الذہب نے اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا، جس کی وجہ سے علی بے کو مصر واپس آنا پڑا، اور اس نے شکست کھائی، اس اندرونی جنگ اور انتشار کے نتیجہ میں بیروت پر روسی جہازوں نے آتش باری کی جس سے تین سو کے قریب مکانات برباد ہو گئے، مصر میں محرم ۱۱۸۸ھ میں علی بے اور محمد بے کی فوجوں کا مقابلہ ہوا، ابوالذہب کامیاب ہوا، اور علی بے گرفتار ہوا، اور زخمی حالت میں اس نے انتقال کیا، اس کا سر کاٹ کر چار روسی افسروں کے ساتھ عثمانی گورنر خلیل پاشا کے پاس بھیج دیا گیا جس نے ان کو قسطنطنیہ روانہ کر دیا، اور مصر دوبارہ سلطنت عثمانیہ کے کُلّی قبضہ میں آ گیا۔

حجاز کی صورت حال

شاہ صاحب نے جب حجاز کا سفر کیا، اور حرمین شریفین میں طویل قیام فرمایا، تو اس وقت سلطان محمود اول (۱۱۴۳ھ تا ۱۱۶۷ھ) کی سلطنت و خلافت کا زمانہ تھا، اس وقت حجاز میں سلطنت عثمانیہ کے نائب و نمائندہ امیرِ حجاز (جو شریف مکہ کہلاتے تھے) محمد بن عبداللہ[1] بن سعید بن زید بن محسن الحسنی (م ۱۱۶۹ھ) والیٔ حجاز تھے، جو اپنے والد کی وفات پر ۱۱۴۳ھ میں امارتِ حجاز

---

[1] بعض کتابوں میں ان کا نام محمد بن عبداللہ بھی آیا ہے، شاید لفظی مماثلت سے بچنے کے لئے ادباً ایسا کیا گیا۔

پر متعین ہوئے[۱]، ان کا زمانہ خانہ جنگیوں اور امارت کے لئے خاندانی کشمکش کا زمانہ تھا، ۱۱۳۵ھ میں ان کے چچا مسعود بن سعید نے ان کو ہٹا کر امارت حجاز پر قبضہ کر لیا، لیکن ۱۱۴۶ھ میں انھوں نے دوبارہ یہ منصب حاصل کیا، لیکن پھر چچا نے ان کو معزول کر دیا، اور ۱۱۶۵ھ تک حینِ حیات وہی اس پر قابض و متصرّف رہے، ان کے زمانہ میں حجاز میں سکون اور امن و امان قائم رہا، مورخین ان کو بیدار مغز اور سیاسی سوجھ بوجھ کا آدمی بتاتے ہیں[۲]۔

بارہویں صدی کے اس عہدِ وسطیٰ میں راستوں کی بدامنی، بدوؤں کی غارت گری، اور بدانتظامی کی شکایت تاریخ کی کتابوں اور حج کے سفرناموں میں عام طور پر ملتی ہے، جو سلطنت کے مرکز (قسطنطنیہ) کی دوری، ترکوں کی حجاز کے اندرونی معاملات میں امکانی حد تک دخل دینے سے احتراز کی پالیسی اور شرفائے مکہ کے (جو مسلّم النسب حسنی سادات میں سے تھے) معاملہ میں ضرورت سے زیادہ لحاظ و مروّت، عربوں کے معاملہ میں غلو کی حد تک احترام و عقیدت، اور ان کی زیادہ تعویل سے

---

[۱] امرائے مکہ کا (جو حسنی سادات میں سے منتخب ہوتے تھے اور اسی کی وجہ سے ان کو "اشراف" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا) سلسلہ چوتھی صدی ہجری کے ثلث اول سے شروع ہو گیا تھا، پہلے شریف مکہ کا تقرر عباسی خلیفہ المطیع للہ (۳۳۴ھ تا ۳۶۳ھ) کے عہد میں ہوا، سلطان سلیم کے شام و مصر پر قبضہ اور حرمین شریفین کو اپنی تولیت و انتظام میں لینے کے وقت تک شرفائے مکہ کا تقرر مصر کے ملوک خاندان کے فرمانرواؤں کی طرف سے ہوتا تھا، سلطان سلیم نے اس وقت کے شریف مکہ السید برکات اور ان کے فرزند سید ابو نمی کو اپنے منصب پر برقرار رکھا، اور وہ بدستور امیر مکہ رہے، اس کے بعد سے یہ سلسلہ شریف حسین کی امارت تک جاری رہا جنھوں نے (جون ۱۹۱۶ء) شعبان ۱۳۳۴ھ میں عثمانیوں کے خلاف بغاوت کی اور جنوری ۱۹۲۶ء میں سلطان ابن سعود کے قبضہ کے بعد حجاز سے بے دخل ہوئے۔ [۲] الاعلام ج ۸ ص ۱۱۱-۱۱۲ (بحوالہ خلاصۃ الکلام و عنوان المجد) و تذییل شفاء الغرام لأخبار البلد الحرام ج ۲ ص ۳۰۹-۳۱۰ "باب ولاۃ مکۃ"

چشم پوشی کی سیاست' پھر مزید برآں امارت حجاز کے موروثی اور ایک ہی خاندان میں محدود ہونے کا قدرتی نتیجہ تھا، یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب نے ان غیر اطمینان بخش حالات منصب امارت کے لئے رقیبانہ و حریفانہ کشمکش اور نظم و نسق کی کمزوری کو اپنی چشم بصیرت سے دیکھا بھی ہوگا، اور دینی حمیت سے معمور قلب سے محسوس بھی کیا ہوگا، چچا بھتیجہ کی منصب امارت کے لئے معرکہ آرائی جو ۱۱۴۳ھ میں پیش آئی عجب نہیں کہ ان کے زمانۂ قیام میں ہوئی ہو اور انھوں نے اس سے دور رس نتائج اور اخلاقی زوال کے شواہد اخذ کئے ہوں۔

یمن

یمن میں بھی تقریباً اسی طرح کا نظام نافذ تھا کہ سیاسی و خارجہ پالیسی کے اعتبار سے سلطنت عثمانیہ کے ماتحت' اور والی ترکی (گورنر) کے جو سلطنت کی طرف سے متعین کیا جاتا تھا، موجود ہونے کے ساتھ وہاں امامت کا نظام نافذ تھا، جو یمن میں تیسری صدی ہجری کے وسط سے چلا آرہا تھا، اور جس پر نسباً سادات اور مذہباً زیدی[1] حضرات فائز ہوتے تھے' اہل یمن ان کے

---

[1] علامہ محمد ابوزہرہ نے اپنی کتاب "تاریخ المذاھب الإسلامیۃ" میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ زیدی شیعہ فرقوں میں اہل سنت والجماعت سے قریب تر اور معتدل ہیں' انھوں نے ائمہ کو مرتبۂ نبوت تک نہیں پہونچایا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد صرف ان کی افضلیت کے قائل ہیں' وہ صحابہؓ کی تکفیر نہیں کرتے' ان کا یہ بھی خیال ہے کہ جس امام کی آپؐ نے وصیت فرمائی تھی، اس کی تعیین نام و شخصیت سے نہیں کی تھی' بلکہ اوصاف بیان کئے تھے' جو حضرت علیؓ پر منطبق ہوتے ہیں' علامہ ابوزہرہؒ کی تحقیق ہے کہ اس فرقہ کے بانی امام زید ابن امام زین العابدین، شیخین (حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ) کی امامت کے قائل تھے' اور ان کی خلافت کو صحیح مانتے تھے (ص۱۴۷-۱۴۹)

ہاتھ پر خلافت کی بیعت کرتے تھے، اور وہ امام کہلاتے تھے، جو اس منصب پر فائز ہو اس کا درجۂ اجتہاد تک پہونچا ہوا ہونا، اور اپنے مذہب کا مسلّم و متبحّر عالم ہونا مفروغ عنہ سمجھا جاتا تھا، یمن سلطان سلیمان قانونی ابن یاؤز سلیم کے زمانۂ حکومت میں سلطنت عثمانیہ میں شامل ہوا، اس وقت ائمۂ یمن کے فرزند و جانشین السید المطہر (ابن الامام شرف الدین (م ۹۸۰ھ) حاکم و امام یمن تھے، ترکی حاکم اور قائد سنان پاشا اور ان کے درمیان جنگ ہوئی، اور یمن سلطنت عثمانیہ کے زیر نگین ہو گیا،[1] لیکن ترکوں نے حجاز کی طرح یہاں بھی امارت کا نظام قائم رکھا، اور ایک طرح کی داخلی خود مختاری دے دی، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ جب حجاز میں تھے تو اس وقت یمن میں الامام المنصور باللہ الحسین بن المتوکل علی اللہ قاسم بن حسین امام یمن تھے، جن کا عہد امامت و حکومت ۱۱۳۹ھ سے ۱۱۶۱ھ تک قائم رہا، مذہب زیدی کی حکومت اور فروغ کے باوجود رعایا زیادہ تر سُنّی اور مذہباً شافعی تھی، یمن بارہویں اور تیرہویں صدی میں علم حدیث کا اہم مرکز رہا ہے، جہاں بارہویں صدی میں محمد بن اسماعیل الامیر (م ۱۱۸۲ھ) صاحبِ سبل السلامؒ، اور تیرہویں صدی میں علامہ محمد بن علی الشوکانی (م ۱۲۵۵ھ) صاحبِ نیل الاوطارؒ پیدا ہوئے، حجاز کے قیام میں شاہ صاحبؒ قربِ مکانی اور روابط علمی کی بناء پر علمائے یمن کی تصنیفات اور ان کی محدثانہ خدمات سے ضرور واقف ہوں گے۔

ایران

ایران میں خاندان صفوی کی سلطنت پر دو صدیاں گذر چکی تھیں، اور قانونِ قدرت

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "البرق الیمانی فی الفتح العثمانی" از علامہ قطب الدین نہروالی (مکی) حنفی

کے مطابق اس پر پیری و اضمحلال کا وہ دور آگیا تھا جو فلسفی مؤرخ ابن خلدون کے بقول آ کے بعد جانے کا نام نہیں لیتا" إن الهرم اذا نزل بدولة لا يرتفع[1] " اس حالت کو دیکھ کر ہمسایہ ملک افغانستان نے فائدہ اٹھایا، اور اپنے حوصلہ مند حکمراں محمود خاں غلزئی کی قیادت میں ۱۱۳۴ھ میں ایران پر حملہ کیا اور اصفہان کو فتح کر لیا، حسین شاہ گرفتار ہوا، افغانوں نے باقی ملک کو بھی فتح کرنے کا ارادہ کیا، لیکن ان کی تعداد اس قدر نہ تھی کہ پورے ملک کو اپنے قبضہ میں رکھ سکتے، محمود خاں تین سال سلطنت کرنے کے بعد ۱۱۳۷ھ/۱۷۲۴ء میں راہیِ ملکِ بقا ہوا، اس کے جانشین اشرف خاں کے زمانہ میں ملک میں بدنظمی پھیل گئی، اس وقت روس کے فرمانروا پیٹرِ اعظم نے ایران کے شمالی اضلاع پر حملہ کیا، صلح کے نتیجہ میں ایران کو اپنے بہت سے زرخیز اور اہم اضلاع سے دستبردار ہونا پڑا، شاہِ ایران قید میں تھا، خوش قسمتی سے اس کے شاہزادہ طہماسپ کو ایک لائق صاحبِ عزم و تنظیم قائد مل گیا، جو خاندانی طور پر معمولی حیثیت کا مالک ہونے کے باوجود اپنی صلاحیتوں کی بناء پر اس گروہ میں شامل تھا، جو نئی سلطنتوں کی بنیاد رکھتے ہیں، یہ نادر شاہ افشار تھا۔

نادر شاہ افشار

نادر نے طہماسپ کو اس کے آبائی تخت پر بٹھا دیا، دولت صفویہ زوال سے دوچار تھی، اور اس کے دوبارہ عروج کے آثار نہ تھے، سارے ملک میں انتشار اور بے اعتمادی پھیلی ہوئی تھی، نادر نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر ایک نئی عسکری طاقت کی تنظیم کی، اس کی حوصلہ مندی اور مردانگی نے ایرانیوں میں ایک نئی روح پھونک دی، وہ آندھی پانی کی طرح اٹھا اور سارے ملک پر چھا گیا، اس نے ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء میں افغانوں کو ایران سے بالکل بے دخل کر دیا، ۱۱۴۶ھ/۱۷۳۳ء میں اس نے

[1] جب کسی سلطنت پر بڑھاپے کا دور آتا ہے تو پھر اس کی جوانی واپس نہیں آتی۔ (مقدمہ ابن خلدون)

روسیوں کو بحیرۂ خزر (CASPIAN SEA) پر روک کر باعزت اور خوددارانہ صلح کی، اہل عرب کو ملک کے مغربی حدود پر روک دیا، سلطان روم کو شمال سے پسپا ہونے پر مجبور کیا، اور قدیم سلطنت ایران کے صوبے غیر ملکیوں سے واپس لئے، ۱۱۴۸ھ ۱۷۳۵ء میں ایران کی سلطنت کو ایسی وسعت حاصل ہوگئی کہ اس کی سرحدیں اپنے قدیمی صورت پر واپس آگئیں اور ۱۱۵۰ھ ۱۷۳۶ء میں خاندان صفویہ کا خاتمہ ہوگیا، نادر شاہ افشار اس وقت ایران کا واحد تاجدار تھا۔[1]

انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم کے مصنف کے بیان کے مطابق[3] نادر نے تخت سلطنت اس شرط پر قبول کیا تھا کہ ایرانی شیعیت سے دستبردار ہوجائیں، وہ خود نسلاً ترک اور مذہباً سنی تھا لیکن ایرانیوں سے سنیت قبول کرانے میں وہ کامیاب نہ ہوسکا، اس کے جرنیلوں نے ۱۷۳۶ء میں بلوچستان اور بلخ لئے، ۱۷۳۸ء میں قندھار پر قبضہ کیا، وہاں سے تسخیر ہند کے لئے روانہ ہوکر کابل پشاور اور لاہور کو تسخیر کیا، ۱۷۳۹ء میں دہلی کے قریب کرنال میں مغل شاہنشاہ کی بہت بڑی فوج کو شکست دی، دہلی پر قبضہ کیا اور وہاں خوفناک قتل عام کرایا[2]، نادر نے مغل بادشاہ سے تخت نہیں لیا مگر پچاس کروڑ ڈالر کا تاوان وصول کیا، نیز دریائے سندھ کے شمال و مغرب میں جتنے علاقے تھے اپنی سلطنت میں شامل کرلئے، بخارا و خوارزم (خیوہ) کی (۱۷۴۰ء میں) تسخیر عمل میں آئی، یہ اس کے مقبوضات میں وسعت کی آخری حد تھی، اور یہیں سے اس کی زندگی میں انقلاب شروع ہوا، وہ بلاشبہ بہت بڑا سالار تھا لیکن نہ حقیقی تدبر جانتا تھا، اور نہ اس میں کوئی انتظامی قابلیت تھی، شیعیت کو ختم کرنے کے لئے اس کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے چینی بڑھنے لگی، اور اسے دبانے کے لئے وہ ظلم و جور سے

---

[1] ملخص از کتب تاریخ ایران و ہندوستان۔ [2] ان واقعات کی تفصیل بعد کے صفحات میں دیکھی جائے۔

[3] مغربی مورخین اور بعض مسلمان مصنفین کے اس بیان میں کہ نادر شاہ نے ایران سے شیعیت کے خاتمہ کی سنجیدہ اور باعزم کوشش کی اور یہ کہ وہ اصلاً سنی تھا، اس شبہ کی گنجائش ہے کہ یہ عقیدہ کی تبدیلی کا معاملہ تھا یا سیاسی تدبیر؟ دہلی پر حملہ اور مہم کے دوران نادر شاہ کی بحث سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ مذہباً سنی ہے اور ایران کو سنیت کے جھنڈے کے تلے لانا چاہتا ہے۔

کام لینے کا عادی بن گیا، انجام کار اس نے اپنے گرانقدر محصولوں اور جابرانہ تحصیلات سے ملک کو تباہ کر ڈالا۔ ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ اپنے ہی قبیلہ کے ایک آدمی کے ہاتھ سے مارا گیا۔[1]

ایران نادر شاہ کی وفات کے بعد

نادر شاہ کی موت کے بعد ایران میں ابتری پھیل گئی، اور طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوا، اس کی فوج کے سالار اپنی اپنی سلطنت کے قیام کا خواب دیکھنے لگے، اس کی وفات کے بعد اس کا بھتیجہ علی قلی عادل شاہ (۱۷۴۷ء اور ۱۷۴۸ء) تخت نشین ہوا، اس نے اپنے خاندان کو قتل کروا دیا، صرف شہزادہ شاہ رخ مرزا بچا جس کی عمر اس وقت چودہ برس تھی، عادل شاہ ایک سال کے اندر اندر اپنے بھائی ابراہیم کے ہاتھوں معزول ہوا، اور اندھا کر دیا گیا، لیکن ابراہیم کی فوج میں بغاوت ہو گئی، فوجی افسروں نے اس کو شکست دے کر قید میں قتل کر دیا، اس کے بعد عادل شاہ کو بھی قتل کر دیا گیا، اس کے بعد زند خاندان ایران پر غالب آیا، اور کریم خاں زند (۱۱۶۴ھ/۱۷۵۰ء تا ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء) نے انیس برس تک ایران پر حکومت کی، اس نے شیراز کو اپنا پایہ تخت بنایا، وہ انصاف اور رحم دلی کی صفات سے متصف تھا، اس نے ایران کو خونریز جنگوں کے بعد سکون و آرام کا موقعہ دیا، اس لئے اس کی موت پر بڑا سوگ منایا گیا، متعدد کمزور جانشینوں کے بعد لطف علی کے عہد میں خاندان زند کا زوال مکمل ہو گیا، لطف علی ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء میں قتل ہوا، اور ایران کا تخت خاندان قاچار کے لئے خالی ہوا، چونکہ یہ عہد شاہ صاحب کے بعد کا ہے، اس لئے ہم اس سے تعرض نہیں کرتے۔

---

[1] انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم جلد اول تالیف ولیم ایل لینگر، ترجمہ وتہذیب مولانا غلام رسول مہر۔

افغانستان اور احمد شاہ ابدالی

اٹھارویں صدی سے پیشتر افغانستان کا ایک حصہ ایران کے ماتحت تھا، دوسرا ہندوستان کے ماتحت اور تیسرے حصہ پر بخارا کے خوانین حکمران تھے۔ ۱۷۰۸ء میں قندھار آزاد و خود مختار ہوگیا۔ ۱۷۳۸ء میں نادر شاہ نے افغانوں کو قندھار کی حکومت سے بے دخل کیا، اور افغانستان نیز مغربی ہند پر قبضہ کرلیا۔

اس وقت ایک شخص احمد خاں نامی جنگی قیدی کی حیثیت سے اس کے پاس لایا گیا، نادر شاہ اس سے بہت متاثر ہوا اور اس کو اپنے ذاتی خدمت گاروں میں شامل کرلیا، احمد خاں برابر ترقی کرتا گیا، اور بادشاہ کا اعتماد اس نے بیش از بیش حاصل کیا، نادر کے قتل پر اس نے افغانی صوبوں کی عنان حکومت سنبھال لی، وہ ابدالی قبیلہ کے دُرّانی (سدوزئی) شاخ سے تعلق رکھتا تھا، اس نے دُرِّ دوراں کا لقب اختیار کیا، اور اسی نسبت سے اس کا خاندان دُرّانی کہلایا۔

احمد شاہ نے دُرّانی خاندان کی حکومت اور دُرّانی سلطنت کی بنیاد رکھی، اس کی وفات پر افغان سلطنت شرقی ایران (مشہد) پورے افغانستان مکمل بلوچستان اور مشرقی سمت میں کشمیر اور پنجاب پر مشتمل تھی، وہ حقیقتاً اٹھارویں صدی کے وسط کے عظیم بانیانِ سلطنت، آزمودہ کار اور عالی ہمت سپہ سالاروں، اور خدا ترس و کریم النفس حکمرانوں میں شامل کئے جانے کے قابل اور بحیثیت مجموعی (ماحول، ابتدائی زندگی اور بے سر و سامانی کو سامنے رکھتے ہوئے) عبقری (GENIUS) شخصیتوں میں شمار کئے جانے کا مستحق ہے، ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء تک اس نے محمود غزنوی کی طرح ہندوستان کو اپنی ترک تازیوں کا میدان بنایا، اس کے تدبر،

عسکری صلاحیت، مذہبیت، علم دوستی اور شرافتِ نفس کا اعتراف اس کے متعدد نامور معاصرین نے کیا ہے اس نے عرصۂ دراز کے بعد افغان علاقہ کو جو اس وقت چھوٹی چھوٹی اکائیوں پر مشتمل تھا، ایک مضبوط طاقت میں منسلک کر کے ایک بڑی اور مضبوط اکائی میں تبدیل کر دیا۔[1]

افغانستان، احمد شاہ ابدالی کے بعد

احمد شاہ ابدالی نے ۱۱۸۶ھ (۲۳ اکتوبر ۱۷۷۲ء) کو قندھار میں وفات پائی، افسوس ہے کہ عالمگیر اعظم کی طرح اس کے جانشین بھی کمزور نا اہل تھے (اور یہ المیہ اکثر عظیم بانیانِ سلطنت اور کامیاب فاتحین و حکمرانوں کے ساتھ پیش آیا ہے) تیمور شاہ کو جو اس کا جانشین اور اس زرخیز اور عظیم سلطنت کا وارث ہوا، اپنے نامور اور صاحبِ عزم باپ سے کوئی نسبت نہ تھی، بیس سال کمزوری کے ساتھ سلطنت کرنے کے بعد جس میں اس جواں سال سلطنت کے اندر زوال کے آثار نمایاں ہو چکے تھے ۱۷۹۳ء میں اس نے انتقال کیا، اس کے فرزند محمود کی بادشاہی کے زمانہ ہی میں سلطنت بارک زئی خاندان میں منتقل ہو گئی،[2] جو انقلاب افغانستان ۱۹۷۵ء تک افغانستان میں حکمراں رہا۔[3]

عالم اسلام کی علمی و دینی حالت

عالم اسلام کا سیاسی و انتظامی جائزہ لینے کے بعد اب ہم اس کا علمی و دینی جائزہ

---

[1] مزید تفصیل باب نہم میں احمد شاہ ابدالی کے تذکرہ میں آئیگی۔ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہید" حصہ اول "درانی خاندان کا زوال اور اس کے اسباب" صفحہ ۴۲۲-۴۲۳ [3] اسی خاندان کے حکمرانوں سے حضرت سید احمد شہید اور ان کے رفقاء کو سابقہ پڑا، اور اسی کی آخری شاخ ظاہر شاہ پر ۱۹۷۳ء میں ختم ہوئی۔

لیتے ہیں کہ اس کا شاہ صاحب کی زندگی، ان کے موضوع و ذوق اور ان کے کارِ تجدید و اصلاح سے قریبی تعلق ہے۔

بارہویں صدی کے اہلِ کمال

مسلمانوں کی علمی و فکری تاریخ، اور ان کی تصنیفی و تحقیقی سرگرمیوں کی طویل روداد کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی علمی و فکری زندگی و نشاط، اور ان کی تصنیفی و تحقیقی سرگرمیاں، سیاسی عروج اور سلطنتوں کی ترقی و فتوحات سے مربوط و وابستہ نہیں رہی ہیں، جیسا کہ اکثر غیر مسلم اقوام و ملل کی تاریخ میں نظر آتا ہے کہ ان کے سیاسی زوال، انقلابِ سلطنت، اور بدنظمی و انتشار کے ساتھ ان کو علمی زوال اور قحط الرجال سے بھی واسطہ پڑتا ہے، سلطنتوں کی ہمت افزائی و سرپرستی، اور قوموں میں خود اعتمادی و احساسِ برتری کے فقدان کے ساتھ ان کے ذہن و فکر کے سوتے خشک، مسابقت کا جذبہ سرد، اور محرکاتِ عمل کمزور پڑ جاتے ہیں۔

مسلمانوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے، بارہا ان کے سیاسی زوال اور اندرونی انتشار کے زمانہ میں ایسے ممتاز اہلِ کمال پیدا ہوئے، جو دورِ زوال و انحطاط کی پیداوار نہیں معلوم ہوتے، ساتویں صدی کے آخر میں سقوطِ بغداد اور تاتاریوں کے ان حملوں کے بعد جنھوں نے مشرقی دنیائے اسلام کو زیر و زبر کر دیا تھا، اور ان ممالک میں خاک اڑ گئی تھی جو صدیوں سے علم کا مرکز چلے آ رہے تھے، آٹھویں صدی کے اوائل ہی میں شیخ الاسلام تقی الدین ابن دقیق العید (م ۷۰۲ھ) جیسے محدث علامہ علاء الدین الباجی (م ۷۱۴ھ) جیسے اصولی و متکلم، شیخ الاسلام ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) جیسے امام و مجتہد، علامہ شمس الدین الذہبی (م ۷۴۸ھ) جیسے محدث و مورخ، اور علامہ ابوحیان نحوی (م ۷۴۵ھ) جیسے ماہرِ فن علماء نظر آتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ علوم دینیہ میں کمال پیدا کرنے اور ان کی خدمت و اشاعت کے محرکات اس امت کے اندرون اور باطن میں پائے جاتے ہیں، نہ کہ بیرون (حکومتوں کی سرپرستی و قدردانی) میں، اور وہ محرکات ہیں رضائے الٰہی کا حصول، نیابتِ انبیاء کے فرض کی ادائیگی، اور دین کی حفاظت کی ذمہ داری کا احساس، اس لئے یہ عہد اگرچہ مجموعی طور پر سیاسی انتشار کا عہد ہے، اور بڑی بڑی مسلم حکومتوں حتیٰ کہ سلطنت عثمانیہ کے زوال کے آثار شروع ہو گئے تھے، ملکوں یہاں تک کہ مرکز اسلام حجاز تک میں حکومت و امارت کے حصول کے لئے باہمی کشمکش اور نبرد آزمائی تھی، لیکن مصر، شام، عراق، حجاز و یمن، ایران و ہندوستان میں ہر جگہ علماء درس و تدریس میں مشغول علمی ذوق رکھنے والے تصنیف و تالیف میں سرگرم، اور مشائخ طریقت تزکیۂ نفس و اصلاح باطن میں منہمک، اور کمالات روحانی اور ترقیات باطنی سے آراستہ و متصف تھے، اور ان میں سے بعض بعض نے ایسا امتیاز پیدا کیا تھا کہ اس کی نظیر ماضی قریب میں بھی دور تک نہیں ملتی۔

فن حدیث کو لیجئے، تو اس میں علامہ ابوالحسن السندی الکبیر (م ۱۱۳۸ھ) جیسے محدث نظر آتے ہیں جنھوں نے مدت تک حرم شریف میں حدیث کا درس دیا، صحاح ستہ پر ان کے حواشی الھوامش الستۃ کے نام سے مشہور ہیں، مولانا محمد حیات سندی (م ۱۱۶۳ھ) بھی اسی عہد کی زیب و زینت ہیں، شام میں شیخ اسماعیل العجلونی المشہور بالجراحی (م ۱۱۶۲ھ) پایہ کے محدث تھے، ان کی کتاب "کشف الخفاء ومزیل الالباس، عما اشتہر من الأحادیث علی ألسنۃ الناس" (ج ۱-۲) بڑی مفید اور جامع کتاب ہے، جو ضعیف و موضوع احادیث کا غالباً سب سے بڑا مجموعہ[1] ہے، کتاب سے ان کی وسعت نظر اور انصاف کا اندازہ ہوتا ہے، ضعیف و موضوع احادیث کے علاوہ وہ حدیثیں بھی ہیں جو زبان زد خلائق ہیں، اور ان کی تخریج عام طور پر معلوم نہیں۔

---

[1] یہ کتاب مکتبۃ التراث الاسلامی حلب نے شائع کی ہے۔

تدریس حدیث کا بڑا مرکز حرمین شریفین تھے جہاں شیخ ابو الطاہر الکورانی الکردی، و شیخ حسن العجیمی درس دیتے تھے، یمن میں سلیمان بن یحیی الاہدل (م ۱۱۹۶ھ) دیار یمن کے محدث جلیل اور اپنے عہد کے بڑے خادم و ناشر حدیث تھے، محمد بن احمد السفارینی (م ۱۱۸۸ھ) حدیث اور اصول کے بڑے عالم اور "الدرر المصنوعات فی الاحادیث الموضوعات" کے مصنف تھے، یمن میں الامیر محمد بن اسماعیل الحسنی الصنعانی (م ۱۱۴۲ھ) جلیل القدر محدث و محقق تھے جن کی یادگار بلوغ المرام کی مشہور شرح "۔۔ السلام" اور تنقیح الانظار کی شرح توضیح الافکار ہے، اسی صدی میں علامہ محمد سعید السنبل (م ۱۱۷۵ھ) کا نام نظر آتا ہے، جن کے اوائل کتب حدیث پر[1] شیوخ حدیث کی اجازت حدیث کا اکثر و بیشتر اعتماد و انحصار ہے، مورخین نے علامہ محمد بن عبد الباقی الزرقانی (م ۱۱۲۲ھ) کو "خاتمۃ المحدثین بالدیار المصریۃ" لکھا ہے۔[2]

علمی تبحر، کثرت تدریس و افادہ و کثرت تصنیف و تالیف کے لحاظ سے شیخ عبد الغنی النابلسی (م ۱۱۴۳ھ) اس عہد میں نمایاں ہیں، جن کے تلامذہ اور مسترشدین کثرت سے نظر آتے ہیں اور ان کو الاستاذ الاعظم کا خطاب دیتے ہیں، ان کی تصنیفات کی تعداد دو سو تیئیس ۲۲۳ بتائی جاتی ہے، اسی عہد میں علامہ اسماعیل حقی (م ۱۱۲۷ھ) بھی تھے، جو "روح البیان فی تفسیر القرآن" کے مصنف ہیں، جو تفسیر حقی کے نام سے مشہور ہے، بغداد کے علماء میں عبد اللہ بن حسین السویدی (م ۱۱۷۴ھ) صاحب تصانیف کثیرہ ہیں۔[3]

جامع ازہر مصر، جامع الزیتونۃ تونس، اور جامعۃ القرویین فاس کے قدیم مدارس کے

---

[1] الاوائل السنبلیۃ فی اوائل کتب الحدیث [2] ان معلومات کا ماخذ "البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع" (تصنیف علامہ محمد بن علی الشوکانی صاحب نیل الاوطار) اور سلک الدرر فی اعیان القرن الثانی عشر للمرادی ہے۔ [3] سلک الدرر، البدر الطالع۔

علاوہ مدارس میں دمشق کے مدرسۂ حافظیہ، المدرسۃ الشبلیۃ اور المدرسۃ العذراویۃ کے نام ملتے ہیں[1]، طرق میں سے نقشبندی، خلوتی، شاذلی، قادری، رفاعی کا بار بار تذکرہ آتا ہے اور ان کے مشائخ ترکی سے لے کر انڈونیشیا تک پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔

عالم اسلام کے علمی ادبی وروحانی ذوق پر ایک نظر

اس زمانہ کے اہل علم پر غالب ذوق ادب، شاعری، علم مجلسی اور الغاز[2] و لطائف کا ہے، اس میں بھی کوئی بڑا تفوق اور ندرت نہیں معلوم ہوتی، سجع اور قوافی کی کثرت اور تکلفات عام ہیں، ترکی حکومت کے اثرات[3] علمی وادبی حلقہ پر بھی نمایاں ہیں کوئی بڑا محقق اور صاحب نظر ڈھونڈھنے سے نظر آتا ہے، مرادی کی سلک الدرر[1] کی چار جلدیں قصائد، غزلیات اور ابیات و مقطوعات سے بھری ہوئی ہیں، مکاشفات، خوش عقیدگی اور کرامات کا بہت تذکرہ ملتا ہے، سلطنت عثمانیہ کے ماتحت ممالک کے علماء اور اہل کمال دارالخلافہ (قسطنطنیہ) جاتے ہیں اور حکومت کے مناصب پر فائز ہوتے ہیں، معقولات، حساب و ہندسہ، علوم بلاغت، فقہ و حدیث نصاب کے اہم اجزاء ہیں، تعویذ و نقوش کا رواج عام ہے، بعض علماء نے فقہی متون قدوری وغیرہ کو نظم کیا ہے، متعدد عرب اہل علم فارسی اور ترکی سے بھی واقف تھے، سلطنت کی زبان ہونے کی وجہ سے ترکی سے (بالخصوص شام میں) لوگوں کو مناسبت تھی، ترک علماء کی ایک بڑی تعداد تھی جو شام میں مقیم تھی، وہ فصیح عربی بولتے تھے، جامع اموی دمشق میں مسند درس پر بیٹھنا بڑے فخر

۱؎ سلک الدرر ۲؎ معمّے اور پہیلیاں ۳؎ ترک مزاجاً و فطرتاً سیاسی، منتظم اور فوجی قوم (MARTIAL RACE) ہیں، ان کے طویل دور اقتدار میں علامہ ابو السعود، طاش کبری زادہ، خلیفہ چلپی جیسے چند ممتاز عالم و محقق و مصنف نظر آتے ہیں۔

کی بات سمجھی جاتی تھی، بعض مشائخ و علماء "فتوحات مکیہ" کا، اور بعض اساتذہ "فصوص الحکم" کا درس دیتے تھے، شرح جامی، اور مختصر المعانی شام میں بھی پڑھی جاتی تھی، تصوف کا مذاق عام تھا، حتیٰ کہ علماء و محدثین میں بھی، شیخ عبدالغنی النابلسی اور متعدد علماء و مشائخ وحدۃ الوجود کا ذوق رکھتے تھے۔[1]

ایران میں علوم عقلیہ کا غلبہ اور اس کا ہمسایہ ممالک پر اثر

دسویں صدی ہجری کی ابتداء ہی میں اسماعیل صفوی (۹۰۵-۹۳۰ھ) نے ایران میں عظیم الشان صفوی حکومت قائم کی، اور پہلی مرتبہ شیعیت کو ملکی مذہب بنایا، اور سنی مذہب کو تقریباً ایران سے مٹا کر رکھ دیا، ایران جس نے امام مسلم، امام ابوداؤد، امام نسائی، امام ابن ماجہ، جیسے مسلم امام فن اور ایوان حدیث کے چار ستون، دوسری طرف بلند پایہ فقیہ اور متبحر عالم علامہ ابو اسحاق شیرازی، امام الحرمین ابو المعالی عبدالملک جوینی، اور حجۃ الاسلام ابو حامد محمد الغزالی جیسی سرآمد روزگار شخصیتیں پیدا کیں، تقریباً سوا دو سو برس کی باجبروت سلطنت میں اس کا رابطہ حدیث و فقہ اور علوم نافعہ سے منقطع ہو کر رہ گیا، شاہان ایران کا رجحان فلسفہ و حکمت کی طرف زیادہ تھا کہ شیعیت کو شروع ہی سے اعتزال و عقلیت اور فلسفہ سے مناسبت رہی ہے، مشہور حکیم و ریاضی داں خواجہ نصیر الدین طوسی (م ۶۷۲ھ) مصنف "شرح اشارات ابن سینا" جو خود شیعہ اور معتزلی تھے، ہلاکو خاں کے خاص معتمد و مشیر تھے،[2] اس شاہی تقرب و اعتماد کی وجہ سے پوری تاتاری قلمرو میں (جس میں ترکستان، ایران و عراق

---

[1] ملاحظہ ہو "سلک الدرر" ۱-۲-۳-۴

[2] ملاحظہ ہو "تاریخ اخبار و آثار خواجہ نصیر الدین طوسی" شائع کردہ طہران یونیورسٹی۔

شامل تھے) فلسفہ و حکمت و ریاضیات کا رجحان غالب آگیا، صفوی سلطنت کے دوسرے ہی حکمراں شاہ طہماسپ (م ۹۸۴ھ) کے زمانہ ہی میں میر غیاث الدین منصور (م ۹۴۸ھ) کا ستارۂ اقبال بلند ہوا، جو ایک اشراقی حکیم اور فلسفی[۱]، اور شیراز کے مدرسۂ منصوریہ کے بانی تھے، شاہ طہماسپ صفوی کے زمانہ میں ان کو عرصہ تک منصب صدارت تفویض رہا، ہندوستان تک ان کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ پھیل گئے، انھیں کے شاگرد امیر فتح اللہ شیرازی (م ۹۹۷ھ) دسویں صدی کے آخر میں ہندوستان آئے، اکبر نے ان کو صدارت کا منصب دیا، انھوں نے ہندوستان کے نصاب درس اور طریق تعلیم پر عقلیت کی ایسی گہری چھاپ لگا دی جو تیرہویں صدی ہجری تک باقی رہی، مولانا آزاد بلگرامی کے بقول وہی صدر الدین شیرازی، میر غیاث الدین منصور اور فاضل مرزا جان (م ۹۹۴ھ) کی تصنیفات ہندوستان لائے، اور ان کو داخل نصاب کیا۔

گیارہویں صدی کے وسط میں میر باقر داماد (م ۱۰۴۱ھ) کی شخصیت ابھری، جس نے ایران سے لے کر ہندوستان تک کے علمی و تعلیمی حلقہ پر اپنی ذہانت، عقلیت و ادبیت کا سکہ قائم کر دیا، شاہ عباس صفوی (م ۱۰۳۷ھ) کے دربار میں وہ نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، ان کی کتاب "الافق المبین" درسی حلقوں کی بلند پروازیوں کا منتہی سمجھا جانے لگا، ان کے بعد ہی علامہ صدر الدین شیرازی (م ۱۰۵۰ھ) کی شخصیت نمایاں ہوئی، جو اشراقی حکیم اور آزاد خیال فلسفی تھے، ان کی دو کتابیں "الاسفار الأربعۃ" اور "شرح ھدایۃ الحکمۃ"

---

[۱] انھوں نے شہاب الدین سہروردی مقتول کی کتاب "ھیاکل النور" کی شرح "اشراق ھیاکل النور" کے نام سے لکھی ہے، اس میں محقق دوانی کا بہت رد کیا ہے۔

معروف بصدرا[1]، عالمگیر شہرت رکھتی ہیں' ایران کے نسلی ذوق نے جو صدیوں سے رائی کا پربت اور نبات کا بنگڑ بنانے کا عادی تھا، اس عقلی رجحان کا پورا ساتھ دیا، اور لفظی موشگافیاں، اور دعاوی و مفروضات کی بھول بھلیاں' ایران کی مغربی سرحد سے لے کر ہندوستان کی مشرقی سرحد تک پھیلا دیں' جو "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کے مرادف تھیں دسویں صدی کے نجم سے بارہویں صدی کے غرب تک تدریسی و تصنیفی حلقہ پر "علوم حکمت" کی حکومت قائم تھی' اور ان مصنفین کی عبارتوں کے سمجھنے اور ان کے شرح و تحشیہ کے سوا اظہار کمال، بلکہ اپنی ذہانت کا ثبوت دینے کا کوئی ذریعہ نہ تھا، اور ان کی افادیت میں ادنیٰ قیل و قال جہالت و جہالت کا ثبوت دینا تھا۔

ایران کا اثر قدرتی طور پر افغانستان پر اور افغانستان کے بھی مغربی شہر ہرات پر پڑا وہاں اس شہر کے ایک عالم قاضی محمد اسلم ہروی کابلی (م ۱۰۶۱ھ) منطق و حکمت میں اساتذۂ ایران اور ائمۂ فن کے اس ملک میں سفیر تھے' ان کے صاحبزادہ قاضی محمد زاہد شہیر بزاہد[2] (م ۱۱۰۱ھ) نے اس کمال میں اور چار چاند لگائے' انھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ ہندوستان میں گزارا "شرح مواقف" "شرح تہذیب" اور "رسالہ قطبیہ" پر ان کے تین حواشی نے جو "زواہد ثلاثہ" کے نام سے مشہور ہیں' ہندوستان کے درس و تدریس کے حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی، علوم عقلیہ میں اس کمال کے باوجود وہ فقہ و حدیث اور علوم دینیہ میں پایۂ بلند نہیں رکھتے تھے' یہاں تک کہ "شرح وقایہ" جیسی فقہ کی متوسط کتاب کے درس میں بھی ان کو اپنے اوپر پورا اعتماد نہیں تھا، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے

---

[1] صدرا ہندوستان کے نصاب درس میں گیارہویں صدی ہجری سے داخل ہے اس کے حصول اور اس میں مہارت کے بغیر طالب علم فارغ التحصیل اور فاضل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ [2] صحیح زاہد

ملفوظات میں ہے کہ:۔

امیرے شرح وقایہ می خواند بحضور جد بزرگوار سبق نمی فرمود[1] — ایک امیر میرزاہد سے شرح وقایہ پڑھتا تھا (لیکن نقہ میں اپنے اوپر اعتماد نہ ہونے کی وجہ سے) وہ اس وقت تک سبق نہیں پڑھاتے تھے، جب تک کہ دادا صاحب (شاہ عبدالرحیم صاحب جو معقولات میں خود ان کے شاگرد تھے) نہ آجاتے۔

اس کے مقابلہ میں معقولات میں ایسا توغّل تھا کہ فرماتے تھے:۔

تقریر مرزا جان جان من است، — مرزا جان کی تقریر تو میری جان ہے،
وتقریر اخوند جان جان من است[2]، — اور اخوند کی تقریر میری جان جاناں ہے

ایران کا یہ اثر نہ صرف افغانستان اور ہندوستان پر، بلکہ شام وعراق تک پڑ رہا تھا، اور وہاں بھی معقولات کے علماء کو عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، اور ان علوم کا ذہن پر رعب و اثر تھا، اور اس کی کتابیں نصاب تعلیم میں شامل ہوتی جاتی تھیں۔

عام اخلاقی، معاشرتی اور اعتقادی حالت

علمی اشتغال، کثیر التعداد اہل کمال، سلاسل وطرق کی مقبولیت، حدیث نبویؐ سے اعتناء، اور حکّام کی دینداری، اور ان مسلم حکومتوں کی موجودگی میں جن کا

---

[1] ملفوظات۔ ۸۲ [2] ایضاً۔ ۸۳

عقیدہ اسلام پر اور عملی زندگی کے بہت سے شعبوں اور عائلی قانون میں شریعت پر تھا، مدارس آباد اور مسجدیں معمور تھیں، جمہور اور عوام اسلام پسند، دین دوست علماء کے قدردان، مشائخ اور بزرگوں کے معتقد، دین کے ارکان و فرائض پر عامل تھے، اور ان کے دل حمیتِ اسلامی سے بھی خالی نہ تھے، عالم اسلام میں عمومی طور پر جمود و تنزل پایا جاتا تھا، اخلاق و معاشرت میں فساد آچکا تھا، اہل عجم اور غیر مسلموں کے بہت سے شعائر اور ان کے عادات مسلمانوں نے اختیار کر لئے تھے، حکام میں خودسری، اور سلطنتوں میں مطلق العنانی پائی جاتی تھی، امراء اور اغنیاء کا طبقہ دولت اور تمول کے بُرے اثرات سے متاثر اور بہت جگہ "مترفین" کے اخلاق و رجحانات کو اختیار کر چکا تھا، معاشرہ کے بہت سے طبقوں پر کسل مندی، تعطل، سرکار دربار سے وابستگی اور تملق و خوشامد کی عادت غالب آگئی تھی، بہت سے حلقوں میں توہمات کا زور تھا، توحید خالص کے حدود سے تجاوز، اولیاء کی تقدیس اور حد سے بڑھی ہوئی تعظیم اور قبر پرستی، اور کہیں کہیں شرک جلی کے نمونے بھی نظر آتے تھے۔

امریکی مصنف ڈاکٹر لوتھراپ اسٹاڈرڈ (LOTHROP STODDARD) نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب (NEW WORLD OF ISLAM) (جدید دنیائے اسلام) میں اٹھارویں صدی کی اسلامی دنیا کا نقشہ کھینچا ہے، جس میں اگرچہ کہیں کہیں مبالغہ اور بے اعتدالی پائی جاتی ہے، لیکن مجموعی طور پر وہ اس وقت کے عالم اسلام کی یکسر غلط تصویر نہیں ہے[1]، اور اس میں اس کے وہ بہت سے گوشے آگئے ہیں، جو اندر رہنے والوں اور ہر وقت کے دیکھنے والوں کو اکثر نظر نہیں آتے،

---

[1] نامور مسلمان مفکر و مورخ امیر شکیب ارسلان نے اس کتاب کے عربی ترجمہ (جو "حاضر العالم الاسلامی" کے نام سے شائع ہوا ہے) کے شہرۂ آفاق حواشی میں عالم اسلام کا اجمالی جائزہ اور تصویر کشی کی تصویب و تحسین کی ہے، اور اس کو واقعہ کے مطابق بتایا ہے۔

اور نئے آنے والے اور پہلی بار دیکھنے والے کو اپنی طرف ملتفت کر لیتے ہیں اس کی صحت کی پوری ذمہ داری لئے بغیر اس کا بیان نقل کرنا غلط اور بے محل نہ ہوگا، وہ لکھتا ہے:۔

"اٹھارویں صدی تک اسلامی دنیا اپنے ضعف کی انتہا کو پہونچ چکی تھی، کہیں قوت کے آثار کسی جگہ نہیں پائے جاتے تھے، ہر جگہ جمود و تنزل نمایاں تھے، آداب و اخلاق قابل نفرت تھے، عربی تہذیب کے آخری آثار مفقود ہو کر ایک قلیل تعداد وحشیانہ عشرت میں اور عوام وحشیانہ ذلت میں زندگی بسر کرتے تھے، تعلیم مردہ ہوگئی تھی اور چند درسگاہیں جو ہولناک زوال میں باقی تھیں وہ افلاس و عسرت کی وجہ سے دم توڑ رہی تھیں، سلطنتیں مطلق العنان تھیں، اور ان میں بدنظمی اور خون ریزی کا دور دورہ تھا، جگہ جگہ کوئی بڑا خود مختار جیسے سلطانِ ترکی یا ہند کے شاہان مغلیہ کچھ شاہی شان قائم کئے ہوئے تھے، اگرچہ صوبہ جات کے امراء اپنے آقاؤں کی طرح آزاد سلطنتیں جو ظلم و استحصال بالجبر پر مبنی تھیں، قائم کرنے کے بہت کوشاں تھے، اسی طرح امراء متواتر سرکش، مقامی رئیسوں اور قطاع الطریق کی جماعتوں کے خلاف جو ملک کو آزار پہونچاتے تھے، برسرپیکار رہتے، اس منحوس طرز حکومت میں رعایا لوٹ مار اور ظلم و پامالی سے نالاں تھی، دیہاتیوں اور شہریوں میں محنت کے محرکات مفقود ہو گئے تھے، لہذا تجارت و زراعت دونوں اس قدر کم ہو گئی تھیں کہ محض سد رمق کے لئے کی جاتی تھیں۔

مذہب بھی دیگر امور کی طرح پستی میں تھا، تصوف کے طفلانہ توہمات کی کثرت نے خالص اسلامی توحید کو ڈھک لیا تھا، عوام و جہال تعویذ، گنڈے اور مالائیں پہن کر گندے فقراء اور دیوانے درویشوں سے اعتقاد رکھتے تھے، اور بزرگوں کے مزاروں پر زیارت کو جاتے تھے اور ان کی پرستش بارگاہ ایزدی کے شفیع و ولی کے طور پر کی جاتی تھی،

کیونکہ ان جہاں کا خیال تھا کہ خدا ایسا برتر ہے کہ وہ اس کی طاعات بلا واسطہ نہیں ادا کرسکتے، قرآن مجید کی اخلاقی تعلیم کو نہ صرف پس پشت ڈال رکھا تھا، بلکہ اس کی خلاف ورزی بھی کی جاتی تھی، افیون اور شراب خوری عام ہو رہی تھی، زناکاری کا زور تھا، اور ذلیل ترین اعمال قبیحہ کھلم کھلا بے حیائی کے ساتھ کیے جاتے تھے۔[1]

---

[1] "سیرت سید احمد شہید" جلد اول ص۱۹تا۲۰، مقتبس از "جدید دنیائے اسلام" مترجمہ جمیل الدین صاحب بدایونی علیگ۔

بابِ دوم

ہندوستان

سیاسی حالت

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی ولادت سلطان اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۱۱۸ھ) سے چار سال پہلے (۱۱۱۴ھ میں) ہوئی، عالمگیر اس تحتی برّاعظم کا اس ملک کی معلوم ومحفوظ تاریخ کی روشنی میں اشوک کے بعد (اگر اس کی سلطنت کی وسعت وعظمت سے متعلق بیانات صحیح اور قابلِ اعتماد ہیں) ہندوستان کا سب سے بڑا فرمانروا اور اس کی سلطنت ہندوستان میں قائم ہونے والی سلطنتوں میں سب سے زیادہ وسیع تھی، کیمبرج ہسٹری کے مصنفین لکھتے ہیں کہ:۔

"اس کی حکومت غزنی سے چاٹگانگ تک اور کشمیر سے کرناٹک تک وسیع تھی۔"[۱]

دوسرے مؤرخ لکھتے ہیں:۔

"قدیم زمانہ سے انگریزوں کے عروج تک ہندوستان میں اتنی طویل وعریض حکومت کبھی قائم نہیں ہوئی تھی۔"[۲]

اسی کے عہد میں اور اسی کے ایماء پر میر جملہ نے صدیوں کے بعد پہلی مرتبہ آسام کو (جو اپنی زبان،

---

[۱] CAMBRIDGE HISTORY OF INDIA, V. 4 P 316

MUSLIM RULE IN INDIA, D.P. MAHAJAN, DELHI. 1971

[۲] CAMBRIDGE HISTORY OF THE WORLD, P. 175, DELHI, 1970

تہذیب، مذہب اور نسل میں ہندوستان سے الگ ایک آزاد منطقہ رہا ہے) فتح کر کے ایک بار سلطنتِ مغلیہ میں شامل کر لیا[1]، تمام مغربی اور غیر مسلم ہندوستانی مؤرخین کے ان تنقیدی و اختلافی تبصروں کے باوجود جن کا محرک دراصل اورنگ زیب کی حمیت و حمایت اسلام ہے[2]، اس کی بے نظیر قوتِ ارادی، استقلالِ طبیعت، انتظامی صلاحیت، سادہ بلکہ زاہدانہ زندگی اور شجاعت و بہادری ایک مسلّم تاریخی حقیقت ہے[3]۔

اورنگ زیب عالمگیر

اورنگ زیب نے زمامِ سلطنت ہاتھ میں لینے کے بعد اپنی پوری توجہ عہدِ اکبری کے مخالفِ اسلام اثرات کو مٹانے، شیعیت کے اثر کو کم کرنے (جس کا بڑا مرکز جنوب تھا، اور اسی لئے اس نے اپنی زندگی اور توانائی کا بڑا حصہ اس کی تسخیر میں صرف کیا) ایران کے ان مجوسیت آمیز تہذیبی اثرات کو جو دورِ اکبری میں قائم ہو گئے تھے، اور جو ایرانی تقویم اور جشنِ نوروز کی شکل میں پائے جاتے تھے، ختم کرنے کے اقدامات کئے، محتسب کا شرعی عہدہ قائم کیا، تاکہ وہ خلقِ خدا کو منہیات و محرمات سے منع کرے، حکومت کی بیش قرار نامشروع آمدنیاں موقوف کیں، سرود و رقاصی اور جھروکہ درشن کو بند کیا، شرعی قاضی مقرر کئے اور ان کو اعلیٰ اختیارات دیئے، پوری سلطنت میں شرعی قانون و آئین جاری کرنے، اور قاضیوں کی آسانی کے لئے مسائلِ فقہیہ کی تدوین و ترتیب کا بیڑا اٹھایا جس کے نتیجہ میں "فتاویٰ عالمگیری" کے نام سے ایک ایسا مجموعہ تیار ہوا جو عصرِ تمام و ترکی میں بھی

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "مآثرِ عالمگیری" از محمد ساقی مستعد خاں ص ۳۰۰-۳۰۱، کلکتہ ۱۸۷۱ء، نیز وقائع سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر DR. BERNIER ص ۲۹۳

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ چہارم ص ۳۲۲-۳۲۳

[3] ملاحظہ ہو اسٹینلی لین پول کی کتاب "اورنگ زیب" AURANGZEB، اور ظہیر الدین فاروقی کی کتاب AURANGZEB & HIS AGE، نیز جادو ناتھ سرکار کی کتاب HISTORY OF AURANGZEB، اور مولانا شبلی کے مضامین عالمگیر۔

(جہاں وہ الفتاویٰ الھندیۃ کے نام سے مشہور ہے) قانون اسلامی کا ایک بڑا اور مستند ماخذ سمجھا گیا، کورنش وآداب کے غیر اسلامی اور غیر موحدانہ طریقے منسوخ کئے، اور سلام مسنون کا اجرا کیا۔ قصہ مختصر بقول اقبال ؎

شعلۂ توحید را پروانہ بود
چوں براہیم اندریں بت خانہ بود

ن اصلاحی وانقلابی کارناموں کے ماسوا جو دینی قدر وقیمت کے حامل ہیں اس کی سب سے نمایاں صفت اس کی بیدار مغزی، مستعدی، فرض شناسی اور امور سلطنت میں جزو کل سے واقفیت اور نظم ونسق پر کلّی طور پر حاوی ہونے کی کوشش ہے، جو اس خداداد وسیع سلطنت کے فرماں روا کے لئے شرط اول ہے، اس نے اپنے والد شاہجہاں بادشاہ کو ایک خط میں لکھا تھا، اور تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے کہ "کاہلی وجودی کا الزام مجھ پر عائد نہیں ہو سکتا"[1] ایک امیر کو جواب دیتے ہوئے (جس نے یہ مشورہ دیا تھا کہ شہنشاہ کاروبار سلطنت میں محنت شاقہ سے کام نہ لیں کہ اس سے اندیشہ ہے کہ ان کی صحت پر برا اثر پڑے) کہا تھا کہ "مجھکو پروردگار نے دوسروں کے واسطے محنت کرنے کے لئے بھیجا ہے" اور شیخ سعدیؒ کا یہ شعر پڑھا ؎

الا تا بغفلت نہ خسپی کہ نوم
حرام است بر چشم سالار قوم[2]

مملکت کی اس وسعت کے باوجود اس کے نظم ونسق پر بذات خود مطلع اور حاوی ہونا اسی شخص کا کام ہے، جو آہنی عزم، فولادی جسم، حد درجہ کا احساس ذمہ داری اور خوف خدا رکھتا ہو، حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کی نظر جتنی ملکی کلیات اور مہمات سلطنت پر تھی اتنی ہی

۱؎ ملاحظہ ہو ظفر نامہ شاہجہاں　　۲؎ اورنگ زیب از اسٹینلی لین پول صـ ۷۲-۷۳

جزئیات پر، وہ دکن میں تھا، مگر شمال مغرب اور مشرق کی خبر رکھتا تھا، اپنی ذاتی اطلاعات اور پرچہ نویسوں کی مدد سے امور انتظامی کی باریک سے باریک تفصیلات جانچتا تھا جس کی وجہ سے عمّالِ سلطنت جہاں بھی رہتے چوکنا اور مستعد رہتے، وہ ادنی ادنی تحریروں کا تقرر خود کرتا تھا[1] اس کا یہ شعر اس کے دل کی صحیح ترجمانی اور اس کے احساس ذمہ داری اور اس کے نتیجہ میں اس کی مشکلات کی صحیح تصویر ہے، وہ اکثر اپنا ہی یہ شعر پڑھتا تھا ؎

غم عالم فراوان است و من یک غنچہ دل دارم
چساں در شیشہ ساعت کنم ریگ بیابان را[2]

کبھی کبھی یہ شعر بھی پڑھتا اور اس پر اس کا عمل تھا ؎

من نمی گویم زیاں کن یا بفکرِ سود باش
اے ز فرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

اورنگ زیب کے کمزور جانشین

لیکن اورنگ زیب کے بعد اس کے عظیم اور پُرجلال تخت پر (جو ماحی دین بننے کے بجائے حامی دین اور ہادم ملت کے بجائے خادم ملت بن گیا تھا) اس کی اولاد میں وہ لوگ آئے جنھوں نے گویا قسم کھائی تھی کہ عالمگیر سے حمایت و حفاظتِ اسلام، احیاء دین اور اجراء سنت کی جو "غلطی" ہوئی تھی، وہ اس کی تلافی کریں گے، نیز اس نے سلطنت کے حدود میں جو توسیع کی تھی، ہندوستان کے نظم و نسق کو اپنی بیدار مغزی، مستعدی، اور فرض شناسی سے جو استحکام بخشا تھا، عوام اور فتنہ پردازوں پر جو رعب و اثر قائم کیا تھا، وہ اپنی تعیش پسندی،

---

[1] اورنگ زیب از اسٹینلی لین پول ص ۹۰ [2] تاریخ ہندوستان ص ۴۷۵ ج ۸

کاہلی وناہلی، اندرونی اختلاف وکشمکش، خود غرض وجاہ پسند ارکانِ سلطنت ووزراء پر کُلّی اعتماد، اور امور سلطنت سے غفلت کے ذریعہ اس "گناہ" کا جو عالمگیر اعظم سے سرزد ہوا تھا، مسلسل کفّارہ ادا کرتے رہیں گے، چنانچہ یہ مُغل سلطنت ہی نہیں، ملت اسلامیہ ہی نہیں، ہندوستان کی بدقسمتی تھی کہ اس کے تختِ سلطنت پر یکے بعد دیگرے کمزور وناہل حکمراں آتے رہے، اور تاریخ کی یہ بوالعجبی اور خدا کی شان بے نیازی وکبریائی کا ظہور تھا کہ اس کا پہلا ہی جانشین (شاہ عالم بہادر شاہ اول) اپنے نامور باپ کا بالکل ضد تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے عہد (۱۱۱۴ھ - ۱۱۷۶ھ) میں اورنگ زیب کے بعد گیارہ مغل بادشاہ تخت نشین ہوئے، جن کے نام حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ محمد معظم بہادر شاہ (ملقب بشاہ عالم بہادر شاہ اول)

۲۔ مُعزّ الدین جہاندار شاہ۔

۳۔ فرخ سیر ابن عظیم الشان۔

۴۔ نیکو سیر۔

۵۔ رفیع الدرجات ابن رفیع القدر۔

۶۔ رفیع الدولہ بن رفیع القدر۔

۷۔ محمد شاہ ابن جہاں شاہ۔

۸۔ احمد شاہ ابن محمد شاہ۔

۹۔ عزیز الدین عالمگیر ابن جہاندار شاہ۔

۱۰۔ محی السنہ بن کام بخش بن عالمگیر۔

۱۱۔ شاہ عالم ابن عزیز الدین۔

گویا نصف صدی کی مدت میں گیارہ ۱۱ بادشاہ تخت نشین ہوئے، ان میں سے کسی کی مدت حکومت صرف دس ۱۰ مہینے[۱]، کسی کی چار ۴ مہینے[۲] سے کم، کسی کی سلطنت برائے نام[۳]، کسی کی چند دن کی حکومت رہی[۴]، ہم یہاں پر اس کے جانشین اول شاہ عالم بہادر شاہ، فرخ سیر ابن عظیم الشان، محمد شاہ اور شاہ عالم ثانی کے عہد اور ان اہم واقعات وحوادث پر تبصرہ کریں گے جنھوں نے ہندوستان کی تاریخ، اور ہندوستانی مسلمانوں کی تقدیر بنانے میں خاص حصہ لیا۔

شاہ عالم بہادر شاہ اول ۱۱۱۸ھ – ۱۱۲۴ھ

یہ عالمگیر کا سب سے بڑا بیٹا تھا جو دوسرے فرزند محمد اعظم شاہ کو شکست دے کر تخت نشین ہوا، عالمگیر کے مزاج و مسلک سے اس کے اختلاف کا سب سے بڑا اور پہلا ثبوت یہ ہے کہ اس نے شیعی مسلک اختیار کیا، جو نہ صرف عالمگیر کے عقیدہ ومزاج ومذاق کے خلاف تھا، بلکہ پورے تیموری سلسلۂ فرمانروایان سلطنت کے عقیدہ ومذہب اور طرز ومسلک کے خلاف تھا، اور اس سلطنت کے مصالح کے بھی مخالف تھا (جس کی مسلمان آبادی کا نوے ۹۰ پچانوے ۹۵ فی صدی حصہ ہندوستان کے مشرقی حدود بنگالہ سے لے کر سلطنت کے مغربی حدود کابل وقندھار تک سنی فرقہ اور حنفی مذہب کا پیرو کار تھا) اور جس کی ہندوستان میں کامیابی اور مقبولیت کے کوئی امکانات نہ تھے، "سیر المتاخرین" کے مصنف غلام حسین طباطبائی کے بیان کے مطابق (جو خود اثنا عشری فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں، اور جن کی شیعیت تاریخی سیاق وسباق

---

۱ معز الدین جہاندار شاہ ۲ رفیع الدرجات ابن رفیع القدر، مدت حکومت تین ماہ دس روز

۳ رفیع الدولہ ابن رفیع القدر ۴ محی السنۃ ابن کام بخش ابن عالمگیر۔

کے اندر سے بھی جھلکتی نظر آتی ہے) بہادر شاہ کے شیعہ مذہب اختیار کرنے اس مسئلہ پر علماء اہل سنت سے مباحثہ و مناظرہ کرنے خطبہ میں کلمہ "علی ولی اللہ وصی رسول اللہ" کے داخل کرنے کا حکم دینے پر لاہور میں جہاں بادشاہ کا قیام تھا، شورش برپا ہوئی، بلوا ہوا، انھوں نے خود اس کے رواج نہ پکڑنے کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

بہادر شاہ بدستور اصرار باین کار داشتہ	بادشاہ بدستور اس بات پر اصرار کرتا رہا
در ترویج و تقویت مذہب شیعہ می کوشید	اور مذہب شیعہ کی ترویج و تقویت میں
و مدت ہائے دراز در مباحثہ بعلماء باز بود	ساعی و سرگرم رہا، مدتوں تک علماء
اما فائدہ بر آں مترتب نمی شد۔[1]	کے ساتھ مباحثہ کا دروازہ کھلا رہا،
	لیکن اس سے کچھ فائدہ مترتب نہیں ہوا۔

اس تبدیلی کا نتیجہ عوام اور خود فوج میں نیم دلی بلکہ بددلی کی شکل میں نکلا، اور اس میں وہ مذہبی جوش نہیں رہا، جو گزشتہ مغل بادشاہوں کے دور میں ایک بڑی قوتِ محرکہ تھی اس حقیقت کا احساس بعض غیر مسلم مورخوں تک کو ہوا ہے، ڈاکٹر ستیش چندر لکھتے ہیں کہ "حکومت کی پالیسی پر مذہب کا اثر کمزور پڑ گیا"[2]

مولوی ذکاء اللہ صاحب تاریخ ہندوستان میں لکھتے ہیں:۔

"عالمگیر کے مرنے کے بعد سلطنت کے کاموں میں انقلابات عظیم ہوگئے تھے اور تمام تعلقات کی صورت بدل گئی تھی، اور مرہٹوں سے جو سلطنت تیموریہ کے تعلقات تھے، وہ بالکل کایا پلٹ ہوگئے تھے، .... سلطنت مغلیہ کمزور ہو کر قریب المرگ تھی،

---

[1] "سیر المتاخرین" ج ۲ ص [illegible]

[2] DR SATISH CHANDRA PARTIES AND POLITICS IN THE MUGHAL COURT, 1707–40 . ALIGARH, 1959, P 40

مگر مرتے دم تک اپنی نخوت و تکبر سے ہاتھ نہیں اٹھایا۔[1]

وہ عالمگیر جو اورنگ آباد میں ہوتا تو دہلی کا کیا ذکر بہار و بنگال میں بھی کارکنانِ سلطنت پر اس کی ہیبت طاری رہتی، وہ جزئیات سلطنت سے باخبر رہتا، اور بروقت مناسب احکام جاری کرنے میں ذراسی تاخیر سے کام نہ لیتا، اب اس کے جانشین کا حال یہ تھا کہ بقول مؤرخ ہندوستان:۔

"باضابطہ و بے ضابطہ اجراء کار میں فوراً تفاوت ہوتا، بادشاہ کی دستخط کا اعتبار نہیں رہا، بادشاہ اپنے متصدیوں سے فرمایا کرتا کہ سب اہل کار آپس میں مل گئے ہیں جو بہتر جانتے ہیں عمل میں لاتے ہیں، ہمارا فقط اعتبار رہ گیا ہے خلق کے مطلب قبول کرنے کے سوا ہم کو کوئی اور چارہ نہیں ہے۔"[2]

نیز وہ لکھتے ہیں:۔

"ظریف شوخ طبعوں نے اس کی تاریخ جلوس "شہ بے خبر" کہی ہے، راتوں کو جاگتا، دوپہر دن چڑھے تک سوتا جس کے سبب سے خلق اللہ کو سفر کے دن تکلیف ہوتی کہ ان کو اپنے خیموں کی شکل نہ ملتی۔"[3]

نیز:۔

"تیسرا کام اس نے اپنے آئین کے خلاف یہ کیا کہ علماء پر عتاب و خطاب کیا، اور جابجا محبوس کیا، پھر مزاج پر خفقان کا غلبہ ایسا ہوا کہ دارالسلطنت لاہور میں ۱۹ محرم ۱۱۲۴ھ ہجری کو جہان فانی سے رخصت ہوا۔"[4]

طباطبائی بھی شاہ عالم بہادر شاہ کے اخیر عمر میں اختلال دماغ، کتوں کے مارنے کا حکم اور سحر کے اندیشہ کا ذکر کرتے ہیں۔[5]

---

[1] تاریخ ہندوستان، مولوی ذکاء اللہ دہلوی۔ ج ۹ ص ۳۳ [2] ایضاً ص ۳۸ [3] ایضاً [4] ایضاً [5] سیر المتاخرین ص ۳۸۱-۳۸۲

اس طرح عالمگیر کے پہلے ہی جانشین کے زمانہ اور صرف ۶ برس کی مدت سلطنت میں عظیم سلطنت مغلیہ کی چولیں ہل گئیں اور اس کی وہ ساکھ اور دھاک ختم ہو گئی جو مخالف طاقتوں، فتنہ پردازوں اور عوام و خواص کے دماغ پر بابر کے زمانہ سے بیٹھی ہوئی تھی۔

فرخ سیر

فرخ سیر (۱۱۲۵ھ تا ۱۱۳۱ھ) کے زمانہ میں حسین علی خاں، عبداللہ خاں (جن میں سے اول الذکر امیر الامراء کے لقب سے اور ثانی الذکر قطب الملک کے لقب سے ملقب تھے) کا اقتدار بادشاہ اور پوری سلطنت پر قائم ہو گیا، فرخ سیر ان کے ہاتھ میں کھلونا تھا، آخر انھوں نے فرخ سیر کو قید کیا، پھر قید حیات سے بھی رہا کر دیا، مصنف "تاریخ ہندوستان" لکھتا ہے:۔

"اگرچہ محمد فرخ سیر وسیع الاخلاق اور قدردان تھا، ہر ایک کی خدمت اور تردد کے مقابل میں چاہتا تھا کہ بقدر امکان منصب و عمدہ خدمات عنایت کر کے ہم چشموں میں ممتاز کرے، مگر اختیار نہیں رکھتا تھا، اور نہ آزمودہ کار جوان تھا، امور سلطنت سے بے خبر، بہ خورد سالی سے صوبہ بنگالہ میں باپ دادا سے دور نشو و نما پایا، استقامت مزاج اور رسے صائب نہیں رکھتا تھا، اوروں کی رائے پر چلتا تھا، قسمت سے تاج و سلطنت مل گیا تھا، خاندان تیموریہ کا جوہر شجاعت تھا، وہ اس کے خلاف جبن ذاتی رکھتا تھا، صاحب غرض کی سخن کی تہہ پر نہ پہونچتا، ابتدا سے اپنی سلطنت کا، تہ فساد خود ہی بنا"[1]

بادشاہ کے یہاں راجہ رتن سنگھ (دیوان سید عبداللہ خاں) تمام متصدیوں کے تعلق میں دخل دیتا، کسی کا اصلاً اعتبار و استقلال اس نے نہیں رکھا تھا، خصوصاً مقدمات مالی میں ......

---

[1] ایضاً ص ۱۰۹

بادشاہ کی عیاشی، خلوت نشینی علاوہ بے دماغی کے زیادہ ہو گئی تھی خلق اللہ کا کار بند تھا۔[1]

بالآخر دونوں بھائیوں (قطب الملک و امیر الامراء) نے فرخ سیر کی آنکھوں میں سلائی پھیری اور قلعہ کے اندر حبس خانہ میں جو قبر کی صورت تھا، بادشاہ کو قید کیا اور ۶ برس ۴ ماہ حکومت کر کے وہ اس دنیا سے رخصت ہوا ان واقعات نے پورے ملک میں تخت دہلی کے جانشینوں کی بے احترامی اور سلطنت کی بے اعتباری پیدا کر دی۔

محمد شاہ بادشاہ (م ۱۱۶۱ھ)

محمد شاہ نے ۲۹ سال ۶ مہینے حکومت کی اس کا عہد پُر از حوادث و واقعات ہے اسی کے زمانہ میں نادر شاہ کا دہلی پر تاریخی حملہ ہوا لیکن اس وقت سلطنت پر حاوی اور اس کے سیاہ سپید کے مالک یہی دونوں سادات بارہہ قطب الملک عبداللہ خاں اور امیر الامراء حسین علی خاں تھے اس وقت اہل دربار کا تاثر یہ تھا کہ "ان دونوں کے تسلط سے بادشاہ کو سوائے نماز جمعہ کے کسی احکام کے جاری کرنے کا مقدور نہیں...... دونوں بھائی تمام خاندان ایران و توران کی بے آبروئی پر کمر باندھے بیٹھے ہیں اور ترک منصب اور گوشہ نشینی میں رستگاری نہیں اور تمام موروثی خانہ زادوں، اور دور و نزدیک جاں نثار نوکروں کا دل نہایت افسردہ ہو رہا ہے کہ وارث تخت و تاج بے اختیار ہے اور نماز جمعہ اور اجرائے احکام شرع پر قادر نہیں، آگرہ کے نزدیک سے کنارۂ دریائے شور تک ہنود بت خانے بنا رہے ہیں، اور گاؤکشی کو منع کر رہے ہیں۔"[2]

"کل امور مالی و ملکی میں رتن چند کے اختیار سے جو سوائے قوم بارہہ اور قوم بقال[3]

---

[1] ایضاً ص ۱۳۰ [2] تاریخ ہندوستان۔ ج ۹ ص ۱۶۶

کے کسی پر نوازش نہیں کرتا تھا، سب چھوٹے بڑے متنفر تھے، اور ہر دیار کے شرفاء خواری و بے اعتباری سے زیست کرتے تھے۔[1]

"سیر المتاخرین" کا مصنف طباطبائی لکھتا ہے:۔

"بادشاہ چون جوان بے عزم و کم جرأت
بود مشغول عیش و طرب گردیدہ در امرے کہ
اشد ضرور بود توجہ می نمود......
بایں سبب اندک اندک خوف و ہراس
از دل امراء و رؤساء ہر فرقہ بلکہ
عوام الناس برخواستہ ہر کس در دماغ
خود خیالے می پخت و بجا خود نشستہ
در باطن دم در استقلال می زد۔"[2]

بادشاہ چونکہ بے عزم اور کم جرأت
جوان تھا، عیش و عشرت میں مشغول
ہو کر صرف اسی کام پر توجہ دیتا
جو اشد ضروری ہوتا، اس سبب سے
تھوڑا تھوڑا کر کے خوف و ہراس
ہر فرقہ کے امراء و رؤسا بلکہ عوام الناس
کے دل سے نکل گیا، ہر شخص اپنے
دماغ میں ایک خیال پختہ کئے ہوئے
اپنی جگہ بیٹھا ہوا، اپنی آزادی و
خود مختاری کا دم بھرتا تھا۔

اس وقت دربار و ارکین سلطنت میں نظام الملک آصف جاہ ہی کی ایک ایسی ہستی تھی، جو صاحبِ عزم، عالی ہمت ہونے کے ساتھ صاحب تخت کی وفادار، مخلص اور خیر خواہ تھی، لیکن سادات اور ایرانی عنصر کسی طرح ان کی بات چلنے نہیں دیتا تھا، یہ دیکھ کر کہ ان کی وفاداری اور خلوص کی کوئی قدر نہیں ہے، اور یہاں رہنا وقت ضائع کرنا، اور اپنے کو ہر وقت خطرہ میں مبتلا کرنا ہے، انھوں نے عرصہ ہوا دکن کا رخ کیا تھا، اور دہلی کا میدان

---

[1] تاریخ ہندوستان۔ ج ۹ ص ۱۸۲
[2] سیر المتاخرین۔ ج ۲ ص ۴۵۲

اہلِ غرض کے لئے خالی ہوگیا تھا۔

اس کے بعد محمد شاہ پر تعیش کا وہ غلبہ ہوا کہ انھوں نے اس سے پہلے کے عیش پسندوں کو مات کردیا، اور ان کے واقعات بھلادیئے، ہندوستان کے مؤرخین لکھتے ہیں کہ:۔

"محمد شاہ بادشاہ نے مذہب تو نہیں بدلا، لیکن مشرب بدل دیا، ابر سیاہ ان کا نقیب قرار پایا، عام حکم تھا کہ ادھر ہمالیہ کے دامن سے گھٹا اٹھے، بادل گرجے کہ میرا خیمہ و خرگاہ صحرا روانہ ہو۔

می دید صبح کہ لبستہ سحاب — الصبوح الصبوح یا اصحاب

ژالہ بارید بر رُخِ لالہ — المدام المدام یا احباب

کا شور تھا"

بالآخر امیر الامراء سید حسین اور قطب الملک نواب عبداللہ خاں (حسن علی خاں) سادات بارہہ کے اقتدار کا خاتمہ اور زندگی کا جام لبریز ہوا، لیکن اس سے بھی سلطنت مغلیہ کی قسمت نہیں بدلی، اس لئے کہ بادشاہ حکمرانی کی ہر صلاحیت اور خطرات کے سمجھنے کی معمولی بصیرت سے بھی محروم تھا۔

سید ہاشمی فرید آبادی اپنی تاریخ ہند میں لکھتے ہیں:۔

"بادشاہ گر سادات کے خاتمے اور محمد شاہ کی قوت و اختیار حاصل کرنے کی ملک میں عام طور پر خوشی منائی گئی لیکن یہ خوشی اگر جذبۂ بادشاہ پرستی پر نہیں بلکہ آئندہ نظم و نسق کی بہتری اور ملکی رفاہ و بہبود کی امیدوں پر مبنی تھی تو اس کا انجام رنج و مایوسی کے سوا کچھ نہ تھا کیونکہ اکبر و اورنگ زیب کا نیا جانشین، درحقیقت اپنے اقبال مند اجداد کی شاہانہ صفات سے عاری تھا"

اسے اپنے عیش و عشرت کے شغلوں میں معاملات ملک پر توجہ کرنے کی فرصت نہ تھی، وہ محل سرائے شاہی کی بیگمات سے بھی زیادہ سلطنت کے حالات سے بے خبر اور اس کی خرابی کی طرف سے بے پرواہ تھا حتیٰ کہ اس کی دادی (شاہ عالم بہادر شاہ کی ملکہ مہر پرور) کی نسبت ہم جا بجا پڑھتے ہیں کہ وہ بھی اپنے مدہوش پوتے کو بار بار اس خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کرتی تھی، جس کا صریح نتیجہ زوال و ادبار تھا۔[1]

اس موقعہ پر ہم کو جادو ناتھ سرکار کی اس رائے کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے جو انھوں نے محمد شاہ کی کمزوریوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں :۔

"محمد شاہ اگرچہ عزت کا مستحق نہیں، مگر رحم کا مستحق ضرور ہے، حالات نے اسے ایسی جگہ لا کھڑا کیا تھا، جہاں کسی عبقری (GENIUS) کی ضرورت تھی، مگر وہ ایک معمولی انسان تھا، مؤرخ اسے اس بات پر ملامت کرتے ہیں کہ اس نے کاروبار حکومت انجام دینے کے بجائے تعیش میں اپنا وقت صرف کیا، لیکن حالات کی ٹریجڈی یہ تھی کہ اس کے جیسا آدمی اگر کاروبار حکومت پر پوری توجہ دیتا تب بھی وہ حالات کا رخ نہیں موڑ سکتا تھا، رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ جیسے لوگ کٹھ پتلیوں کی طرح اپنی ذلت کے احساس سے بھی عاری تھے لیکن محمد شاہ میں بدترین حالات، اور انھیں سدھارنے میں اپنی لاچاری دونوں کا احساس موجود تھا۔"[2]

---

[1] تاریخ ہند از فرید آبادی کتاب سوم صہ ۲۶۱

[2] FALL OF THE MUGHAL EMPIRE P. 373-74

غرض وہ سلطنت جو بابر کے عزم جہاں کشا اور اس کے استقلال اور جفاکشی سے قائم ہوئی تھی، اور جس کو اس کے جانشینوں نے اورنگ زیب تک اپنے جوہر شجاعت اور غیرت تیموری سے قائم رکھا تھا، اس عیش کوشی اور غفلت اور خود فراموشی کی منزل پر پہونچ گئی، جو موروثی اور مطلق العنان سلطنتوں کی تاریخ بلکہ تقدیر بن گئی ہے، اقبالؔ نے صحیح کہا ہے ؎

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

آخر اس کا نتیجہ وہی نکلا جس کو خود محمد شاہ نے ؎

شامتِ اعمال ما صورت نادر گرفت

کے بلیغ مصرعہ میں ادا کیا۔ ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ نے دہلی کا رخ کیا، اس نے اس سے پہلے محمد شاہ کو کئی خط لکھے تھے، لیکن بقول مؤرخ :-

"یہاں ان دنوں عیش و عشرت کا زور شور تھا، محمد شاہ بہادر صاحب سریر تھا تن آسانی کے سوا کسی کام سے کام نہ تھا، ہر وقت ہاتھ میں جام اور بغل میں دل آرام تھا، کس کو دماغ تھا کہ نامہ کا جواب لکھتا[1]"

نادر شاہ کے حملہ کی تفصیلات ہندوستان کی تاریخوں میں پڑھی جائیں اس کے حملہ کے بعد دہلی کی جو حالت ہوئی (ذہن میں رہے کہ اس وقت حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی عمر ۲۶ سال کی تھی، اور وہ حجاز سے واپس تشریف لا چکے تھے) اس کا نقشہ مصنف تاریخ ہندوستان کی زبان سے سنا جائے۔

"نادر شاہ کے جانے کے بعد شہر مُردوں سے پُر تھا، اور زندوں سے خالی تھا مکانوں پر ویرانی برستی تھی، محلے کے محلے جلے پڑے تھے مُردوں کی سڑاند سے بھیجا نکلا جاتا تھا،

---

[1] تاریخ ہندوستان۔ ج ۹ ص ۲۵۱

نہ کوئی کسی کو کفن دینے والا تھا، اور نہ گور میں دفن کرنے والا تھا، مرکر ہندو مسلمان ایک ہو گئے، ڈھیروں میں جل کر خاکستر ہو گئے۔ یہ تو شہر کی کیفیت تھی، دربار کا حال یہ تھا کہ کچھ دنوں تو وہ بھاری نیند سوتا رہا، اور جب اٹھا تو اس کی آنکھوں میں اس قدر چیپڑ لگا ہوا تھا کہ دیکھنے سے گھن آتی تھی، خزانہ میں پھوٹا یا دام نہ تھا، محاصل اور خراج کا کہیں پتہ نہ تھا، سپاہ تباہ و خستہ حال تھی اس پر مرہٹوں کا بھی خوف بالکل نہیں گیا تھا، جو صوبے ان کے قبضہ میں چلے گئے تھے، وہ ان کے ہاتھ سے تباہ ہو رہے تھے ان سب مصیبتوں اور آفتوں پر درباریوں کا جھگڑا نہ چکا، وہی ایک فریق تورانی امیروں کا تھا جن کے سرتاج آصف جاہ اور قمرالدین خاں وزیر تھے، دوسرا گروہ ان امیروں کا تھا، جو ان کو خارج کرنا چاہتا تھا، اور ان میں بادشاہ بھی شمار ہوتے، اگر بیچ میں مرہٹوں کا جھگڑا نہ آن پڑتا تو ان امیروں نے سلطنت کے ٹکڑے کر کے کبھی کے آپس میں تقسیم کر لئے ہوتے، اور خاندان تیموریہ کو بے نام و نشان کر دیا ہوتا۔[۱]

جب نادر شاہ ہندوستان سے چلا گیا تو اول اس کا اثر یہ ہوا کہ سلطنت دہلی سے تین زرخیز صوبے بنگال، بہار، اڑیسہ علیحدہ ہو گئے، اور ان میں جدا ہی علی وردی خاں کی ایک ریاست قائم ہو گئی۔[۲]

۲۶ ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ (اپریل ۱۷۴۸ء) کو محمد شاہ مرض اسہال میں مبتلا ہو کر دنیا سے رخصت ہوا، اور بقول مصنف "تاریخ ہندوستان" کہ تیس سال سلطنت کر کے خاندان تیموریہ کی تباہی کے کنارہ پر پہونچا گیا۔[۳]

---

[۱] تاریخ ہندوستان ج ۹ ص ۲۴۲ [۲] ایضاً ص ۲۶۲ [۳] ایضاً ص ۲۸۳۔

شاہ عالم ثانی

محمد شاہ کے زمانہ میں اگر سلطنت مغلیہ کو اخلاقی و انتظامی طور پر زوال ہوا، اور ہندوستانی معاشرہ اور طبقۂ امراء کا رجحان الناس علیٰ دین ملوکہم کے اصول کے مطابق عیش و عشرت، تن آسانی اور لذت اندوزی کی طرف تیزی کے ساتھ ہوا، تو شاہ عالم ثانی کے زمانہ میں جو ۱۱۷۳ھ (۱۷۵۹ء) میں تخت نشین ہوا، سیاسی طور پر زوال اپنے آخری مرحلہ تک پہونچ گیا، وہ اپنے ۴۷ سالہ عہد حکومت میں دوسروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا رہا، بکسر کی لڑائی میں اودھ کے نواب وزیر شجاع الدولہ اور میر قاسم کی انگریزوں کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد ۱۷۶۴ء میں شاہ عالم نے انگریزوں کی اطاعت قبول کر لی، اور ایک معاہدہ پرو دستخط کر دیئے، جس کی رو سے وہ انگریزوں کا وظیفہ خوار ہو گیا، ۱۷۶۵ء میں اس نے انگریزوں سے ایک معاہدہ کیا، جس کی رو سے بنگال، بہار، اور اڑیسہ کی دیوانی کے اختیارات محاصل کی تحصیل وصول کا انتظام ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں آگیا، شاہ عالم نے خود کو مرہٹوں کی پناہ میں دے دیا، اور الٰہ آباد اور کڑہ کے اضلاع اُن کی طرف منتقل کر دیئے۔

شاہ عالم ثانی کے عہد سے بہت پیشتر سے پورا ملک مرہٹوں، سکھوں اور دہلی و آگرہ اور راجپوتانہ جاٹوں کے رحم و کرم پر تھے، جو آندھی پانی کی طرح آتے اور پورے علاقہ کو تاراج کر جاتے، ملک میں کوئی طاقت امن و قانون قائم کرنے کے قابل نہ تھی،[1] احمد شاہ ابدالی نے ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست فاش دے کر ملک کو ان کے خطرہ سے محفوظ کر دیا، اس نے شاہ عالم کو دہلی بلانے کی بڑی کوشش کی اور اپنا آدمی بھیجا، مجبور ہو کر اس کی والدہ نواب زینت محل سے بھی خط لکھوایا، اگر سلطنت مغلیہ میں تھوڑی سی بھی جان اور شاہ عالم میں سلطنت کی

---

[1] تفصیل کتاب کے باب نہم میں ملاحظہ ہو۔

صلاحیت ہوتی تو وہ جنگ پانی پت کے نتیجہ سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان میں اپنا اقتدار بحال کر لیتا لیکن سلطنت بے روح، اور بادشاہ عزم و ہمت ہی نہیں، حمیت اور غیرت سے بھی عاری تھا؛ بقول اقبال۔ ع

حمیت نام ہے جس کا، گئی تیمور کے گھر سے

بادشاہ پورے دس برس کے بعد ۱۷۷۱ء میں الٰہ آباد سے دہلی آیا، وقت گذر چکا تھا، اس لئے وہ پانی پت کی اس عظیم الشان فتح اور مرہٹوں کی شکست سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکا، وہ یہاں آکر نئے فتنوں، امراء کے جوڑ توڑ، روہیلوں کی نئی طاقت اور سکھوں کے حملوں سے دوچار ہوا، بالآخر نجیب الدولہ کے پوتے غلام قادر روہیلہ نے ۱۷۸۸ء میں دہلی پر قبضہ کر لیا، شاہی محل لوٹا، شہزادیوں کو کوڑے لگوائے اور سلطنت تیموری کے وارث مغل شہنشاہ کی آنکھیں نوک خنجر سے نکال لیں، سلطنت مغلیہ اور اس کے مالک و وارث کی بے حرمتی و بے آبروئی اس سے پہلے ایسی کبھی نہیں ہوئی تھی۔

۱۷۸۹ء میں سندھیہ نے غلام قادر کو بڑے دردناک طریقہ پر قتل کیا، اور شاہ عالم کو دوبارہ تخت پر بٹھایا، نو لاکھ روپیہ سالانہ اس کے اخراجات کے لئے مقرر کیا، متعدد لڑائیوں کے بعد ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک انگریزی فوج کے ساتھ دہلی میں داخل ہوا، مرہٹوں کو نکال دیا، اور بادشاہ کی پنشن ایک لاکھ روپیہ سال مقرر کر دی[1]، شاہ عالم ۴۵ برس تخت نشین اور ۱۸ سال نابینا رہ کر ۱۸۰۶ء میں راہی ملک بقا ہوا۔

علمی و روحانی حالت

سیاسی انتشار، اجتماعی بد نظمی اور انحطاط کے باوجود یہ دور انفرادی طور پر علمی کمالات،

---

[1] تاریخ ہندوستان۔ ج ۹ ص۲۴۳، بعض انگریزی تاریخوں میں نوے ہزار بیان کی گئی ہے۔

تدریسی و تصنیفی انہماک، روحانی یکسوئی، باطنی ترقی، اور نفوس کے تزکیہ و اصلاح کا دور تھا جس میں متعدد ایسی باکمال اور ممتاز شخصیتیں پیدا ہوئیں، جن کو اس دور انحطاط سے کوئی مناسبت اور جن پر حالات سے یاس و ہراس کا کوئی اثر نہیں معلوم ہوتا، کہتے ہیں کہ بہت سے علمی و ادبی شاہکار، ان افراد کی کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ ہیں، جو کسی مزمن مرض میں مبتلا، یا کسی معذوری اور اندرونی صدمہ کا شکار تھے، علمائے نفسیات اس کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ ایسی حالت میں قوت مقابلہ اور اس مجبوری کی تلافی کا عزم ابھر آتا ہے، اور آدمی سے ایسے کام کرا لیتا ہے جو معتدل (NORMAL) حالات میں نہیں ہوتا، ہندوستان کے اس دور کا علمی اور روحانی پہلو، اور اس دور انحطاط میں ایسی قدآور شخصیتوں کا ظہور، ایک مریض اور بر سرِ انحطاط معاشرہ کی اندرونی قوت مقابلہ کا ثبوت، اور اسلام کی مرد آفرینی اور آدم سازی کی صلاحیت کی دلیل ہے۔

وفورِ علم، ذہانت، قوت تدریس اور حسن تصنیف کے لحاظ سے ہمیں اس دور میں مولانا احمد بن ابو سعید عرف ملا جیون امیٹھوی (۱۰۴۷ھ - ۱۱۳۰ھ) صاحب "نور الانوار" اور "التفسیرات الاحمدیہ"، ملا حمد اللہ سندیلوی (م ۱۱۶۰ھ) صاحب شرح سلم مشہور بحمد اللہ، مولانا محمد حسن معروف بملا حسن فرنگی محلی صاحب شرح سلم مشہور بملا حسن (م ۱۱۹۹ھ)، مولانا رستم علی قنوجی (م ۱۱۷۸ھ) شیخ صفۃ اللہ خیر آبادی (م ۱۱۵۵ھ) شیخ علی اصغر قنوجی (م ۱۱۴۰ھ)، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی (۱۱۱۶ھ - ۱۲۰۰ھ) مولانا غلام نقشبند لکھنوی (م ۱۱۲۶ھ) قاضی محب اللہ بہاری (م ۱۱۱۹ھ) مصنف "سلم العلوم" و "مسلم الثبوت" (جنھوں نے تقریباً ایک صدی تک ہندوستان کے علماء و مدرسین کو ان دونوں کتابوں کی شرح و تحشیہ میں مشغول رکھا، اور ان کی کتابیں مصر تک کے علماء کبار اور اساتذۂ ازہر کی مرکز توجہ رہیں) قاضی مبارک گوپاموی (م ۱۱۶۲ھ) مصنف شرح سلم معروف بقاضی، مولانا محمد اعلیٰ تھانوی مصنف کشاف اصطلاحات الفنون (جو اپنے موضوع پر بے نظیر کتاب

ہے) اور سب اول و آخر میں ملا نظام الدین لکھنوی (م ۱۱۶۱ھ) جن کے ترتیب دیئے ہوئے درس کا سکہ ہندوستان سے بخارا اور سمرقند تک رواں ہے، اور جن کو مصنف "نزہۃ الخواطر" نے "غیث الإفادة الهتون، العالم بالربع المسکون، أستاذ الأساتذة وإمام الجهابذة" کے القاب سے یاد کیا ہے، جیسے سرآمد روزگار، اور فخر بلاد و امصار عالم، مدرس، مصنف اور پوری پوری علمی تحریک اور سلسلۂ تدریس و تربیت کے بانی اسی صدی کے رجال و اعیان میں تھے[۱]۔

سلوک و طریقت کے لحاظ سے دیکھئے تو اس صدی میں حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ (۱۱۱۱ھ – ۱۱۹۵ھ) سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کی ہستی موجود تھی، جن کے متعلق خود حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی شہادت ہے کہ "ہر زمانہ میں ایسے بزرگ زیادہ تعداد میں پائے نہیں جاتے، چہ جائیکہ ایسے زمانہ میں جو فتنہ و فساد سے پُر ہے[۲]"۔

سلسلہ قادریہ کے مشہور بزرگ اور ملا نظام الدین بانی درس نظامی کے مرشد حضرت سید عبدالرزاق بانسوی (م ۱۱۳۶ھ) سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے مجدد شاہ کلیم اللہ جہان آبادی (م ۱۱۴۲ھ) اور اسی سلسلے کے ناشر و امام شاہ فخر الدین (شاہ فخر دہلوی) (م ۱۱۹۹ھ)، سلسلۂ قادریہ کے مشہور شیخ شاہ محمد غوث قادری لاہوری (م ۱۱۵۲ھ)، سلسلہ نقشبندیہ کے شیوخ کاملین شیخ محمد عابد سنامی (م ۱۱۶۰ھ) خواجہ محمد ناصر عندلیب (والد خواجہ میر درد) (م ۱۱۷۲ھ) شاہ منیب اللہ بالاپوری اور حضرت شاہ نور محمد بدایونیؒ (م ۱۱۳۵ھ) اس عہد میں مسند آرا اور فیض رساں نظر آتے ہیں، غرض یہ زمانہ سلاسل ثلاثہ قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ کے شیوع و انتشار کا زمانہ تھا، اور تینوں سلسلوں کے شیوخ کاملین موجود تھے، حضرت شاہ عبدالعزیز

---

[۱] استفادہ از "نزہۃ الخواطر" ج ۶۔ [۲] "کلمات طیبات" ص ۶۵۔ [۳] یہ اسمائے گرامی ان کے سنین وفات اور امتیازی خصوصیات "نزہۃ الخواطر" تصنیف مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی، جلد ششم سے اخذ کئے گئے ہیں۔

رحمۃ اللہ علیہ کا ملفوظ ہے :-

درعہد محمد شاہ بادشاہ بست ودو بزرگ	محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں بائیس[۲۲]
صاحب ارشاد از ہر خانوادہ در دہلی	بزرگ صاحب ارشاد مختلف خانوادوں
بودند، وایں چنیں اتفاق کم می شود[۱]	سے تعلق رکھنے والے دہلی میں موجود
	تھے، اور ایسا اتفاق کم ہوتا ہے۔

اخلاقی و معاشرتی پستی

لیکن ان نامور اہل کمال، اور مسیحا نفس شیوخ کاملین کی موجودگی میں واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کا مسلم معاشرہ اور خاص طور پر طبقۂ امراء سلطنت کے اثر، سیاسی زوال، دولت کی فراوانی، اور ایرانی تہذیب کے اثر سے اخلاقی زوال کے نقطۂ عروج کو پہونچ گیا تھا، اور اسی وجہ سے وہ اس کردار کے ادا کرنے سے قاصر تھا، جو طبقۂ امراء نے ہر دور میں انقلاب سلطنت کے موقعہ پر ادا کیا ہے، اسی طبقہ میں سے (جو SECOND LINE رہا ہے) وہ افراد سامنے آئے ہیں، جنھوں نے اس خلا کو پُر کر دیا ہے، جو سیاسی و انتظامی میدان میں پیدا ہو جاتا تھا، سید ہاشمی فرید آبادی نے صحیح لکھا ہے :-

"ہندوستان کی دولت و ثروت نے خود اس طبقۂ امراء کو نہایت عیش پسند اور تن آسان بنا دیا تھا......... ہم ان امیروں کی ساری کوشش و قابلیت ادنیٰ اغراض کے لئے سازش اور ریشہ دوانی میں صرف ہوتے دیکھتے ہیں، انقلاب سلطنت اور حصول پادشاہی تو درکنار، کسی مسلمان امیر کو اپنے اپنے مقام پر علانیہ خود مختاری کا اعلان کرنے کی بھی جسارت نہ ہوتی، اور اس عرصہ میں ادھر تو نظم و نسق کی اندرونی خرابیاں

---

[۱] ملفوظات عزیزیہ ص۱۰۹

بڑھتی رہیں، اور ادھر حکمراں طبقہ کے افراد سے انتظامِ حکومت اور اشتراکِ عمل کی صلاحیت ہی رفتہ رفتہ مفقود ہو گئی ہے۔[1]

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

بخانۂ قمرالدین خاں عورات غسل اخیر را از گلاب می کردند و خانۂ دیگر نواب رسد روپیہ گل و پان برائے عورات می رفت۔[2]	نواب قمرالدین خاں کے گھر میں عورتیں اخیر کا غسل گلاب سے کرتی تھیں، دوسرے نواب کے گھر میں تین سو روپے کے پھول اور پان عورتوں کے لئے جاتے تھے۔

مولانا غلام علی آزاد بلگرامیؒ "مآثرالکرام" میں لکھتے ہیں کہ:۔

"اورنگ آباد کے لوگ بالاتفاق بیان کرتے ہیں کہ امیرالامراء (حسین علی خاں) کے عہد میں شہر کے اکثر لوگ اپنے گھر میں کھانا نہیں پکاتے تھے امیرالامراء کی سرکار کے باورچی اپنا حصہ بیچ ڈالتے تھے، پرتکلف پلاؤ کی ایک قاب چند پیسوں میں لوگوں کو مل جاتی تھی۔"[3]

اعتقادی کمزوری اور شرک و بدعات کا زور

اس معاشرتی اور اخلاقی پستی سے زیادہ خطرناک، اور خدا کی نصرت سے محروم، اور حقیقی طاقت سے عاری کرنے والی خرابی ضعیف الاعتقادی، قرآن مجید کے اعلان "اَلَا لِلّٰهِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ"[4] کے خلاف بکثرت عوام کی زندگی، مسلم معاشرہ میں بدعات کا زور، ہندوؤں اور شیعوں کے بہت سے رسوم و عادات کی تقلید تھی، شرکِ جلی کی ایسی متعدد صورتیں بہت سے مقامات اور حلقوں میں پائی جاتی تھیں،

---

[1] تاریخ ہند کتاب سوم از مولوی سید ہاشمی فرید آبادی ص ۲۶۲-۲۶۳، حیدر آباد ۱۹۳۱ء۔

[2] ملفوظات عزیزی۔ [3] مآثرالکرام۔ ۱۸۰ ص ۱۵۰۔ [4] الزمر۔ ۳

جن کی کوئی علمی توجیہ ممکن نہیں کھلی ہوئی قبر پرستی، مشائخ کے لئے سجدۂ تعظیمی، مزارات اور اس کے قرب و جوار کا حرم کی طرح احترام، قبروں پر چادریں چڑھانا، منتیں ماننا، بزرگوں کے نام پر قربانیاں کرنا، مزارات کا طواف، وہاں میلہ لگانا، تہوار منانا، گانا بجانا اور چراغاں کرنا، اور مختصر الفاظ میں ان کو قبلہ و کعبہ اور ملجا و ماویٰ سمجھنا، کوئی ایسا واقعہ اور منظر نہ تھا جس کو دیکھنے کے لئے بہت دور جانے اور بہت دیر انتظار کرنے کی ضرورت ہوتی، شیخ سدّو کا بکرا، سید احمد کبیر کی گائے، غازی میاں کے جھنڈے اور چھڑیاں، محرم کے تعزیئے، غیر اسلامی تہواروں کو شان و شوکت سے منانا، بیماریوں کے دفع کرنے میں ارواح خبیثہ اور بعض اوقات دیوی دیوتاؤں کی رضا جوئی اور خوف، چیچک کی بیماری میں سیتلا کی تعظیم، اولیاء و صالحین کے لئے منتیں ماننا اور قربانیاں کرنا، اولیاء اور نیک بیبیوں کے نام سے روزے کی نیت کرنا اور ان سے اپنی حاجت براری اور مقاصد کی تکمیل کو وابستہ کرنا، اور اس سلسلہ میں خاص دن، خاص کھانے (بی بی کی صحنک، مخدوم صاحب کا توشہ وغیرہ) اور ان میں خاص آداب کی پابندی، یہ اور ایسے بہت سے عنوانات ہیں جن کے ماتحت توہمات، عقائد فاسدہ، رسوم جاہلیت اور التزامات اور پابندیوں کا ایک طویل سلسلہ ہے، علی بخش، حسین بخش، پیر بخش، مدار بخش، اور سالار بخش، نام عام تھے۔

ایک بڑے دائرہ میں عقیدۂ توحید اس مفہوم میں محدود ہو کر رہ گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہی زمین و آسمان اور کائنات کا حقیقی خالق اور صانع ہے، اور وہی معبود حقیقی ہے اور بڑے بڑے امور ہی انجام دیتا ہے، لیکن اس نے سلاطین عالم کی طرح اپنی سلطنت کے بہت سے شعبے اور محکمے اپنے مقبول بندوں کے سپرد کر دیئے ہیں، جو ان کے مالک و مختار ہیں، اور سیاہ سپید کرتے رہتے ہیں، اب ان کو راضی کئے اور ان سے رابطہ قائم کئے بغیر اس سلسلہ میں کوئی کامیابی اور کار براری نہیں ہو سکتی، شرک صرف یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور ہستی کو اس دنیا کا صانع و خالق اور مالک حقیقی سمجھا جائے،

اور اس کو براہ راست عبادت و سجدہ کا (بلا توسل اور شفاعت کے خیال کے) مستحق سمجھا جائے[1]۔

غرض بارہویں صدی کا ہندوستان سیاسی، انتظامی، اخلاقی، اور بہت حد تک عقائد کی حیثیت سے انحطاط و پستی کے اس نقطہ پر پہونچ گیا تھا، جو اسلامی ملکوں کے زوال اور مسلم معاشرہ کی پستی کا افسوسناک اور خطرناک مرحلہ ہوتا ہے، مولانا سید سلیمان ندوی نے اس مجموعی صورت حال کا نقشہ اپنے ایک مضمون میں بڑی بلاغت و اختصار کے ساتھ کھینچا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"مغلیہ سلطنت کا آفتاب لب بام تھا، مسلمانوں میں رسوم و بدعات کا زور تھا، جھوٹے فقراء اور مشائخ اپنے بزرگوں کی خانقاہوں میں مسندیں بچھائے، اور اپنے بزرگوں کی مزاروں پر چراغ جلائے بیٹھے تھے، مدرسوں کا گوشہ گوشہ منطق و حکمت کے ہنگاموں سے پرشور تھا، فقہ و فتاویٰ کی لفظی پرستش ہر مفتی کے پیش نظر تھی، مسائل فقہ میں تحقیق و تدقیق مذہب کا سب سے بڑا جرم تھا، عوام تو عوام خواص تک قرآن پاک کے معانی و مطالب، اور احادیث کے احکامات و ارشادات، اور فقہ کے اسرار و مصالح سے بے خبر تھے۔"[2]

---

[1] اس تصور توحید اور نقطۂ خیال کی توضیح، شاہ صاحب کے اعتقادی اصلاح و تجدید کے باب میں تفصیل سے آئیگی وہاں ملاحظہ کی جائے۔ [2] مقالات سلیمانی ص۲۴

بابِ سوم
شاہ صاحب کے اجداد و والد بزرگوار

شاہ صاحب کے اجداد

شاہ صاحب کے اجداد اولین کا زمانہ (جو شیخ شمس الدین مفتی کے زمانہ سے شہر رہتک میں قیام پذیر ہے) ہندوستان کی علمی و تصنیفی تاریخ کا وہ عہد ہے، جب یہاں تذکرے و تراجم کی تصنیف کا دور عام طور پر شروع نہیں ہوا تھا، زیادہ تر نامور مشائخ طریقت کے انفرادی تذکرے تھے، جن میں محبوب الٰہی سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء کا تذکرہ سیر الاولیاء (مرتبہ امیر خورد) خاص امتیاز رکھتا ہے یا صلحاء و مشائخ وقت کے ملے جلے تذکرے تھے جن میں دو کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ایک شاہ محمد بن حسن غوثی مندوی کی گلزار ابرار (جس میں زیادہ تر مانڈو و مالوہ کے صلحاء و مشائخ کا تذکرہ ہے) دوسرے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی اخبار الاخیار، اہل کمال اور نامور اشخاص کے تذکروں کی کمی تھی جن میں مختلف خاندانوں کے برگزیدہ اشخاص یا مختلف علاقوں کی ممتاز شخصیتوں کا (جو کسی سلسلہ کی بانی یا اس کی اہم کڑی نہیں تھیں) تعارف و تذکرہ ہو، ان تذکروں میں بھی قدرتاً مرکزی یا علاقائی دارالسلطنت اور اس کے اطراف اور ہندوستان کے مرکزی و تاریخی شہروں کی نامور شخصیتوں کا تذکرہ زیادہ ہے، جن کے حالات و کمالات سے واقفیت کے ذرائع مصنف کو

آسانی سے میسر تھے، شاہ صاحب کا خاندان شیخ شمس الدین مفتی کے وقت سے جد بزرگوار شیخ وجیہ الدین کے عہد تک رہتک میں رہا جس کو یہ مرکزیت و اہمیت حاصل نہ تھی اس لئے ان تذکروں میں بھی ان کے حالات و وقائع عام طور پر نہیں ملتے۔

یہ باب بالکل تشنہ رہتا اور شاہ صاحبؒ کے تذکرہ نویس یا اس خاندان کی تاریخ لکھنے والے کو سخت زحمت پیش آتی، اگر خود شاہ صاحب اپنے اجداد کے تذکرہ میں امداد فی مآثر الاجداد کے نام سے ایک مختصر رسالہ خود قلم بند نہ فرما دیتے۔ اس میں بھی اجداد اولین کا تعارف و تذکرہ نہایت اجمال و اختصار کے ساتھ اور جدّ امجد شیخ وجیہ الدین کا (بوجہ قرب زمانہ اور قلت وسائط) نسبتاً تفصیل کے ساتھ کرایا گیا ہے، انھیں اشارات کو لے کر مصنف حیات ولی مولوی حافظ محمد رحیم بخش مرحوم دہلوی نے اپنی انشا پردازی سے بہت پھیلا کر لکھا ہے، جو کتاب کے ۱۱۳ صفحات میں آیا ہے، انھوں نے شاہ صاحب کے اس بنیادی تذکرہ میں (جو سب سے مستند اور قابل اعتماد ماخذ ہے) دوسری معاصر تاریخوں اور کتابوں سے جو مضامین اضافہ کئے ہیں، ان میں صفحات تو علیحدہ رہے کتاب اور مصنف کا نام بھی کہیں نہیں ہے، اس وجہ سے ہم صرف مآثر الاجداد ہی پر اکتفا کریں گے۔

شجرۂ نسب

شاہ صاحبؒ نے جو فاروقی النسب ہیں، اس رسالہ کے شروع میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک اپنا شجرہ نسب درج کر دیا ہے، شمس الدین مفتی جو اس خاندان میں سب سے پہلے رہتک آئے،

---

[1] یہ رسالہ متوسط تقطیع پر دس صفحات میں آیا ہے، اور شاہ صاحب کے پانچ رسائل کے مجموعہ میں شامل ہے جس کا پہلا رسالہ "انسان العین" ہے۔۔۔۔ مطبوعہ مطبع احمدی دہلی "انفاس العارفین" میں سات رسائل کا جو اضافہ ہے اس میں بھی شامل ہے۔

اور طرح اقامت ڈالی ان کے ایک بھائی سالار حسام الدین تھے ان کی اولاد میں شاہ ارزانی بدایونی ایک بزرگ گذرے ہیں ان کے خاندان کے نسب ناموں سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے یہاں پر یہ شجرۂ نسب من وعن درج کیا جاتا ہے۔

"شاہ ولی اللہ بن الشیخ عبدالرحیم بن الشہید وجیہ الدین بن معظم بن منصور بن احمد بن محمود بن قوام الدین عرف قاضی قاذن بن قاضی قاسم بن قاضی کبیر عرف قاضی بدہ بن عبدالملک بن قطب الدین بن کمال الدین بن شمس الدین بن شیر ملک بن محمد عطا ملک بن ابوالفتح ملک بن عمر حاکم ملک بن عادل ملک بن فاروق بن جرجیس بن احمد بن محمد شہریار بن عثمان بن ماہان بن ہمایوں بن قریش ابن سلیمان بن عفان بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب[1]"

اس نسب نامہ میں کئی ناموں کے ساتھ "ملک" خطاب آتا ہے، شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں،

"یہ زمانۂ قدیم میں تعظیمی لقب تھا، جیسے ہمارے زمانہ میں خان۔"

خاندان کی ہندوستان آمد

شاہ صاحبؒ کی روایت کے مطابق ان کے خاندان کے پہلے بزرگوار جنھوں نے رہتک میں قیام اختیار کیا۔ (اور غالباً وہی ہندوستان میں سب سے پہلے آئے) وہ شیخ شمس الدین مفتی تھے، ان واسطوں اور پشتوں کی تعداد اور ان کی طبعی اور تقریبی عمروں کے حساب سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ شمس الدین مفتی ساتویں صدی کے آخر یا آٹھویں صدی ہجری کے اوائل میں ہندوستان آئے ہوں گے،

---

[1] الامداد فی مآثر الاجداد مشمولہ مجموعۂ رسائل حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی مطبوعہ مطبع احمدی دہلی انفاس العارفین مطبوعہ مطبع مجتبائی (۱۳۳۵ھ) میں الامداد فی مآثر الاجداد کا جو نسخہ شامل ہے (ص ۱۵۰ - ص ۱۶۹) اس میں جو شجرۂ نسب درج ہے اس میں متعدد اغلاط اور نقائص ہیں جو غالباً طباعت کی غلطی اور تصحیح کی بے توجہی کا نتیجہ ہے، مذکورہ بالا نسخہ مشمولہ مجموعۂ رسائل تنہا قابل اعتماد ہے، اور اسی سے شجرہ نقل کیا گیا۔

جب تاتاریوں کے حملے سے عالم اسلام کا مشرقی حصہ زیر وزبر، خاندانوں کی عزتیں برباد ان کے علمی اندوختے غارت اور ایران و ترکستان کے نامی گرامی شہر تاراج و بے چراغ ہو رہے تھے، تاریخ فیروز شاہی اور دوسری تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں عراق، ایران، و ترکستان کے شریف و نجیب خاندان اور ذی علم و باکمال خانوادے کثرت سے ہندوستان آئے، جہاں ترکی النسل مسلمان خاندانوں کی حکومت تھی، اور جنھوں نے تاتاری حملہ آوروں کو ترکی بہ ترکی جواب دے کر ہندوستانی سرحدوں سے پسپا اور اس ملک کو نہ صرف ان کی غارت گری سے محفوظ بلکہ اپنی دین پروری اور معارف نوازی سے دارالعلم اور ایک وسیع مدرسہ بنادیا تھا، جہاں جا بجا درس کے حلقے، یاد الٰہی اور تزکیۂ نفس کے مرکز، اور اہل قلم اور اہل تحقیق کے لئے سکون و اطمینان کے ساتھ اپنا کام کرنے کے مواقع تھے۔[1]

رُہتک کا قیام

ایسا معلوم ہوتا ہے اور شاہ صاحبؒ کے بیان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ رُہتک اُس وقت کی نئی اسلامی سلطنت کا ایک اہم شہر اور مغرب سے دہلی کی طرف آنے والی اسلامی افواج، مجاہدین، داعیانِ اسلام اور مشائخ و علماء کی دہلی سے پہلے کی ایک اہم منزل اور فرودگاہ تھی، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ قریش کی نسل سے پہلے جو بزرگ اس شہر میں آئے، اور ان کی وجہ سے اسلامی شعائر کا غلبہ اور کفر و جاہلیت کا زوال ہوا، وہ شیخ شمس الدین مفتی ہی تھے، شاہ صاحب نے ان کی بعض کرامتوں کا بھی ذکر کیا ہے، جو ان کی بزرگی اور اس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے باعث استعجاب نہیں، اس زمانہ میں جو صاحب علم و فضل

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ سوم صـ ۱۹-۲۱

مسلمان اس شہر میں قیام کرتا تھا، اس کو قضا احتساب کا عہدہ اور شہر کا نظم و نسق بھی سپرد ہو جاتا تھا، لیکن اس زمانہ میں اس کو قاضی و محتسب کے لقب سے یاد نہیں کرتے تھے۔

شیخ شمس الدین مفتی سے شیخ وجیہ الدین تک

شیخ شمس الدین مفتی کے انتقال کے بعد ان کی اولاد میں سب سے بزرگ فرد کمال الدین مفتی، ان کے بعد ان کے صاحبزادہ قطب الدین، ان کے بعد ان کے فرزند عبدالملک ان عہدوں پر فائز اور ان ذمہ داریوں کو پورا کرتے رہے، ان حضرات کے بعد قضاۃ کا باقاعدہ ان اطراف میں تعین ہونے لگا، شیخ عبدالملک کے صاحبزادہ قاضی بدھ نے اپنے خاندان کی اس روایت اور وجاہت کو قائم رکھا، ان کے دو لڑکوں سے ان کی نسل چلی، اس خاندان کی شادیاں رُہتک کے صدیقیوں اور سونی پت کے سادات میں ہوئیں، شیخ محمود کی (جو شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے جدِّ خامس ہوتے ہیں، اور جنھوں نے عہدہ قضا ترک کر کے حکومت کے عہدوں کو سنبھالا) شادی سونی پت کے سادات میں ہوئی، جن سے ایک صاحبزادہ شیخ احمد پیدا ہوئے، شیخ احمد نے صغر سنی میں رہتک کو خیرباد کہا، اور شیخ عبدالغنی بن شیخ عبدالحکیم کے ساتھ سونی پت میں بود و باش اختیار کی، شیخ عبدالغنی نے اپنی صاحبزادی سے ان کا عقد کر دیا، اور مدت تک ان کی تربیت کی، اس کے بعد وہ رُہتک آئے، اور قلعہ کے باہر ایک عمارت بنائی، اور اپنے اہل تعلق کو مجتمع کیا، ان کے صاحبزادہ شیخ منصور وجاہت شجاعت اور حکومت کے فضائل کے جامع تھے، ان کی پہلی شادی شیخ عبداللہ بن شیخ عبدالغنی کی صاحبزادی سے ہوئی، ان کے صاحبزادہ شیخ معظم اسم باسمّٰی اور باہیبت و وجاہت بزرگ تھے، شجاعت کا بڑا جوہر رکھتے تھے،

واقعات عجیبہ کا ان سے صدور ہوا، شاہ صاحبؒ اپنے والد حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ شیخ منصور کی ایک راجہ سے جنگ ہوئی، لشکر کا میمنہ شیخ معظم کے سپرد کیا گیا، اس وقت ان کی عمر بارہ۱۲ سال کی تھی، سخت معرکہ پیش آیا، اور دونوں طرف کے بہت سے لوگ مقتول ہوئے، اس درمیان میں کسی نے شیخ معظم سے کہدیا کہ ان کے والد شیخ منصور نے شربت شہادت نوش فرمایا، اور لشکر اسلامی کو شکست ہوئی، یہ سن کر ان کی غیرتِ اسلامی اور رگِ فاروقی حرکت میں آئی، وہ مردانہ وار حریف لشکر میں گھس گئے اور صفیں درہم برہم کرتے ہوئے بڑی کوشش کے بعد راجہ کے ہاتھی تک پہونچ گئے، ایک بڑا مخالف سردار مقابلہ میں آیا، انھوں نے تلوار کے ایک وار سے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے، اس کے ساتھیوں نے شیخ معظم کو گھوڑے پر سے اتار لیا، لوگوں نے ان پر ہجوم کیا، اس راجہ نے سب کو ڈانٹا اور منع کیا، اور کہا کہ ایسا نوعمر ایسی جواں مردی اور جرأت دکھائے یہ تو عجائبات زمانہ میں سے ہے، راجہ نے ان کے دونوں ہاتھ لے کر چومے اور بڑے احترام سے پیش آیا، اور پوچھا کہ اتنا غصہ کیوں ہے؟ کہا کہ مجھے یہ اطلاع ملی کہ میرے والد شہید ہو گئے، میں نے ارادہ کیا کہ میں حملہ کروں اور مخالف لشکر کے سردار کو جب تک ٹھکانہ نہ لگا دوں دم نہ لوں، میں نے تہیّہ کر لیا تھا کہ یا ماروں یا مرجاؤں، راجہ نے کہا جس نے تم کو یہ اطلاع دی اس نے جھوٹ کہا، تمہارے والد زندہ ہیں، اور ان کے جھنڈے وہ نظر آرہے ہیں، اس وقت راجہ نے شیخ منصور کے پاس کسی کو بھیجا کہ ہم نے اس لڑکے کی خاطر صلح کر لی، اور جو کہا گیا اس کو منظور کیا اور واپس گیا۔

شاہ صاحبؒ اپنے والد صاحبؒ کی زبانی موضع شکوہ پور کے (جو شیخ معظم کی تعلقہ داری میں تھا) ایک معمر زمیندار کی یہ روایت بھی بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ قیس ڈاکو اس گاؤں کے مویشیوں کو لوٹ لے گئے، اس وقت شیخ معظم تنہا وہاں تھے، ان کے عزیزوں اور

فرزندوں میں سے کوئی نہ تھا، ان کو اس واقعہ کی اطلاع کی گئی، اس وقت دستر خوان لگ گیا تھا اور کھانا چن دیا گیا تھا، انھوں نے کسی عجلت اور پریشانی کا اظہار نہیں کیا، پورے اطمینان اور معمول کے مطابق کھانے سے فراغت کی، ہاتھ دھوئے پھر کہا ہمارے ہتھیار اور گھوڑا لے آؤ، جب سوار ہو کر چلے تو زمینداروں میں سے بھی کچھ لوگ ہتھیار لگا کر ساتھ ہوئے، شیخ معظم نے سب کو واپس کیا، اور فرمایا کہ میں اتنی تیزی سے جاؤں گا کہ تم میرے گھوڑے کی گرد کو بھی نہ پہونچو گے، البتہ اس قصہ کے راوی کو جو دوڑنے میں گھوڑے کے برابر تھا، ساتھ لے لیا تاکہ وہ واقعہ کی اطلاع دے سکے، پھر گھوڑا دوڑا کر ان ڈاکوؤں کو جو کئی منزلیں طے کر چکے تھے، جالیا، اور ان کو غیرت دلا کر میدان میں مقابلہ کے لئے اتارا اور تیراندازی شروع کی، ان کی قادراندازی اور تیرافگنی دیکھ کر اس پورے گروہ پر رعب طاری ہو گیا، انھوں نے فریاد کی کہ ہم توبہ کرتے ہیں، ہمیں معاف کیا جائے، شیخ نے فرمایا کہ تمہاری توبہ یہ ہے کہ اپنے ہتھیار خود اتارو، ہر ایک دوسرے کا ہاتھ باندھے، اسی حالت میں مویشیوں اور سلاح اور اس دست بستہ گروہ کو گاؤں تک لائے، ان لوگوں کے مذہب کے مطابق ان سے قسم لی کہ اس بستی پر کبھی نظر نہ اٹھائیں گے، انھوں نے اس کی تعمیل کی۔

شیخ معظم کے سید نورالجبار سونی پتی کی صاحبزادی سے تین صاحبزادے پیدا ہوئے شیخ جمال شیخ فیروز، شیخ وجیہ الدین، شیخ وجیہ الدین شاہ صاحب کے حقیقی دادا ہیں۔

شاہ صاحب کے دادا شیخ وجیہ الدین شہید

شاہ صاحب نے اپنے حقیقی دادا شیخ وجیہ الدین شہید کے حالات قدرے تفصیل سے لکھے ہیں، وہ فرماتے ہیں، ان میں تقویٰ اور شجاعت کی دونوں صفتیں جمع تھیں، والد صاحب (شاہ عبدالرحیم صاحب) فرماتے تھے کہ میرے والد (شیخ وجیہ الدین) نے دن رات میں قرآن کے

دو سیپارے پڑھنے کا وظیفہ مقرر کر رکھا تھا جس کو وہ سفر و حضر، اور چستی و کسل مندی دونوں حالتوں میں کبھی ترک نہیں کرتے تھے، جب عمر زیادہ ہوئی اور بصارت کمزور تو خط جلی کا ایک قرآن شریف اپنے ساتھ رکھتے تھے، سفر میں بھی کسی وقت اپنے سے جدا نہیں کرتے تھے، یہ بھی فرماتے تھے کہ وہ اپنے گھوڑے کو کبھی کسی کی کھیتی میں گھسنے نہیں دیتے تھے، خواہ تمام لشکر کاشت کی ہوئی زمین میں گھوڑے دوڑاتا ہو، بعض اوقات اس بناء پر متعارف راستہ سے مشقت برداشت کرکے الگ چلتے، یہ بھی فرماتے تھے کہ کسی جنگ میں اگر سامان رسد کم ہو جاتا، اور کھانے پینے کی چیزیں مہیا نہ ہوتیں تو ساتھی گاؤں کے مویشیوں کو زبردستی پکڑ کر کے ان سے اپنی غذا حاصل کر لیتے، لیکن وہ ان سے مجتنب رہتے، جب دو تین فاقوں کی نوبت آجاتی اور قوت جواب دے جاتی تو رزاق حقیقی رزق مہیا فرما دیتا، بعض مرتبہ وہ فکر میں ہوتے، زمین پر چابک پٹختے وہاں سے چنے بقدر خوراک کے نکل آتے، وہ اس کو دھوکر اور پاک کرکے بھگو لیتے اور تناول فرماتے، فرماتے تھے کہ میرے والد کا معاملہ شاگرد پیشہ لوگوں، اور بھوسہ چارہ بیچنے والوں کے ساتھ ایسی نرمی اور انصاف کا تھا کہ بڑے بڑے متقیوں سے بھی ایسا کم دیکھنے میں آیا، یہ بھی فرماتے تھے کہ ایک سفر میں انھوں نے بعض آثار ولایت کا مشاہدہ کیا، بیعت کی اور اشغال صوفیہ کے ساتھ مشغول ہوئے، تقلیل کلام اور قلت اختلاط بالانام کو (جو صوفیائے باصفا کا شیوہ ہے) اپنا شعار بنایا، اور اس کی ایسی پابندی کی جو اس زمانہ کے صوفیوں میں بھی کم دیکھی گئی ہے۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ والد صاحب ان کی شجاعت کا بہت ذکر کیا کرتے تھے، اس موقعہ پر شاہ صاحب نے والد صاحب کی زبانی ان کی نمایاں شجاعت اور تہور کے متعدد واقعات لکھے ہیں، بعض مرتبہ تنہا انھوں نے پورے پورے گروہ کا مقابلہ کیا، وہ لشکر شاہی میں مالوہ تک تشریف لے جاتے تھے، اپنے زمانہ کے اچھے اچھے شہسواروں اور سورماؤں سے انھوں نے مقابلہ کیا

اور بعض مرتبہ اپنے ساتھیوں یا افسروں کو جو مخالف کی زد میں آگئے تھے، عین موقعہ پر بچا لیا، ایک مرتبہ انھوں نے تین جنگ آزما مبارز طلبوں کو جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، زیر کیا، وہ فنون سپہ گری میں طاق تھے[۱]

جنگِ برادران میں وہ عالمگیر بادشاہ کے ساتھ تھے، جب شاہ شجاع نے بنگال میں خروج کیا تو وہ عالمگیر کے لشکر میں تھے اور انھوں نے کارِ نمایاں انجام دیا، اور ولی نعمت کے ساتھ پوری وفاداری اور استقامت کا ثبوت دیا[۲] ان کی مردانگی سے اس معرکہ میں عالمگیر کو فتح ہوئی، فتح کے بعد بادشاہ نے چاہا کہ منصب میں اضافہ کردے، انھوں نے از روئے استغنا قبول نہیں کیا، بعض مرتبہ انھوں نے اپنے خاص احباب و رفقاء کے ساتھ حق دوستی ادا کیا اور خطرہ مول لے کر ان کی امداد کی[۳] شاہ عبدالرحیم صاحب نے ان کی قوت قلبی، بلند ہمتی اور مہم جوئی اور خطر پسندی کے متعدد واقعات بیان کئے ہیں، اسی کے ساتھ ان کی ہمدردی و دل جوئی اور غریب پروری کے واقعات بھی لکھے ہیں۔

شیخ وجیہ الدین کی شادی شیخ رفیع الدین محمد کی دختر نیک اختر سے ہوئی، شیخ رفیع الدین قطب العالم کے فرزند تھے، اور وہ حضرت شیخ عبدالعزیز شکر بار[۴] کے صاحبزادہ، ان کے

---

۱ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، آثار الاجداد ص۷ ۲ ایضاً ص۸ ۳ ایضاً ص۹

۴ شیخ عبدالعزیز عباسی جونپوری ثم دہلوی (۸۹۸ھ - ۹۷۵ھ) کا شمار کبار مشائخ چشتیہ میں ہے، شیخ قاضی خان ظفرآبادی اور شیخ تاج محمود جونپوری سے طریقہ چشتیہ میں اجازت حاصل تھی، بے نفسی اور تواضع کا پیکر تھے، اور اخلاق عالیہ سے متصف، وحدۃ الوجود کا مذاق رکھتے تھے، خطوط میں اپنے نام سے پہلے "ذرۂ ناچیز" لکھا کرتے تھے، (جس سے ان کے مذاق کا اظہار ہوتا ہے) عجیب اتفاق ہے کہ اسی سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے "فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ" (یٰسٓ - ۸۳) پڑھا اور روح نے قفس عنصری سے پرواز کی، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے حالات میں رسالہ النبذۃ الابریزیۃ فی اللطیفۃ العزیزیۃ" اسی مجموعہ رسائل میں شامل ہے۔ (نزہۃ الخواطر ج ۴ باختصار)

تین صاحبزادے پیدا ہوئے، شیخ ابوالرضا محمد، شیخ عبدالرحیم، شیخ عبدالحکیم۔

شاہ عبدالرحیم صاحب کہتے ہیں کہ میرے والد (شیخ وجیہ الدین) ایک شب تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے، ایک سجدہ میں اتنی دیر تک سر بسجود رہے کہ خیال ہوا کہ شاید روح پرواز کر گئی، جب سر اٹھایا تو آپ سے اتنی دیر تک ساکت وصامت پڑے رہنے کے بارے میں میں نے دریافت کیا، فرمایا غیبوبت کی حالت پیدا ہو گئی تھی، اس میں شہید کے درجہ اور ثواب کا حال معلوم ہوا، میں نے حق تعالیٰ سے شہادت کی تمنا کی اور اس میں اتنے الحاح وزاری سے کام لیا کہ اس کی قبولیت کا انکشاف ہوا، دکن کی جانب اشارہ ہوا کہ وہ شہادت کی جگہ ہوگی، والد صاحب فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد اگرچہ فوج کی ملازمت ترک فرمادی تھی اور اس شغل سے طبیعت کو نفرت ہو گئی تھی، لیکن از سر نو اسباب سفر مہیا کئے، گھوڑا خریدا اور دکن کی جانب متوجہ ہوئے، ان کا خیال تھا کہ یہ واقعہ سیوارا میں پیش آئے گا، جو اس وقت سلطنت اہل اسلام کے حدود سے خارج تھا اور وہاں کا حاکم مسلمانوں کے قاضی کے ساتھ بڑی بے حرمتی کے ساتھ پیش آیا تھا، لیکن جب برہانپور پہونچے تو وہاں منکشف ہوا کہ شہادت کی جگہ تو پیچھے چھوڑ آئے، وہیں سے واپس ہوئے، راستہ میں بعض سوداگروں کی جو صلاح وتقویٰ سے آراستہ معلوم ہوتے تھے، صحبت وہمراہی اختیار کی، قصبہ ہنڈیا سے چاہتے تھے کہ ہندوستان واپس آئیں کہ ایک دن ایک ضعیف العمر آدمی ملا کہ افتاں وخیزاں بھاگا جاتا تھا، ان کو اس کے حال پر رحم آیا، انھوں نے وجہ پوچھی، کہا کہ میں دہلی جانا چاہتا ہوں، فرمایا، روزانہ تین پیسے ہماری ملازمت سے لے لیا کرو، وہ بڈھا اصل میں کفار کا جاسوس تھا، جب نوبریا کی سرائے میں پہونچے تو جاسوس نے اپنے ساتھیوں کو خبر کردی (کہ سوداگروں کا قافلہ اس سرائے میں ٹھہرا ہوا ہے) ڈاکوؤں کی ایک جماعت کثیر اس سرائے میں آئی، شیخ وجیہ الدین اس وقت تلاوت میں مشغول تھے، ان میں سے دو تین آدمی سامنے آئے

اور کہا کہ وجیہ الدین کون ہیں، انھوں نے فرمایا کہ میں ہوں، انھوں نے کہا کہ تم سے ہمیں کوئی کام نہیں ہم جانتے ہیں کہ تمہارے پاس کچھ مال نہیں، اور تمہارا ہمارے گروہ میں سے ایک پر حق نمک بھی ہے لیکن ان سوداگروں کو جن کے پاس ساز و سامان ہے ہم نہیں چھوڑیں گے، چونکہ آپ کی غرض اصلی ہی اس سفر سے شہادت تھی آپ رفاقت چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے اور حملہ آوروں کے مقابلہ میں آگئے، آپ کو بائیس[۲۲] زخم آئے آخری زخم میں سر مبارک جسد سے جدا ہوگیا، اس حالت میں بھی دیر تک تکبیر زبان پر جاری رہی اور کچھ دور کفار کا تعاقب بھی کیا،[۱] بالآخر ایک جگہ گرے اور وہیں مدفون ہوئے، اللہ تعالیٰ نے شاہ عبدالرحیم صاحب کو یہ واقعہ دکھایا، انھوں نے دیکھا کہ وہ اپنے زخم دکھا رہے ہیں، شاہ صاحب نے جسد مبارک کو منتقل کرنے کا ارادہ بھی کیا، مگر اشارۂ غیبی نے ان کو اس سے باز رکھا۔

شاہ صاحب کے نانا شیخ محمد پھلتی

شاہ صاحب کے نانا حضرت شیخ محمد پھلتی[۲] تھے، ان کے خاندان کا وطن اول سنّدھور[۳] ہے، سلطان سکندر لودھی کے زمانہ میں یہ خاندان پھلت منتقل ہوا، آپ کے والد کا نام شیخ محمد عاقل تھا، وہ بچپن سے بڑے ہونہار اور زمانہ کے صلحا اور اہل دل کے منظور نظر تھے، حضرت سید آدم بنوری کے خلیفہ شیخ جلال نے ان کی ولادت پران کے مراتب عالیہ کی بشارت دی تھی، تعلیم انھوں نے اولاً شاہ صاحب کے چچا شیخ ابوالرضا محمد بن شیخ وجیہ الدین سے حاصل کی، اس کے بعد شاہ عبدالرحیم صاحب کے پاس گئے، ان سے بڑی مناسبت معلوم ہوئی، وہاں سے علم کی تحصیل کرکے

---

[۱] ایسے واقعات بعض اور شہداء کے متعلق بھی کتابوں میں دیکھنے میں آئے ہیں۔ [۲] ان کے حالات میں شاہ صاحبؒ کا مستقل رسالہ "العطیۃ الصمدیۃ فی الانفاس المحمدیۃ" کے نام سے اسی مجموعہ رسائل میں شامل ہے [۳] حال ضلع بارہ بنکی۔

پھر پھلت واپس آئے، بذل و سخا، خود شکنی و فنا میں پایہ بلند رکھتے تھے، قوی التاثیر و صاحب ارشاد تھے، شاہ صاحب نے ان کی اپنے استاد و مربی شاہ عبدالرحیم صاحب کے ساتھ اطاعت و انقیاد اور تسلیم و رضا کے متعدد واقعات لکھے ہیں[۱]، ان کو شاہ صاحب سے اجازت بھی حاصل ہوئی ان کے صاحبزادہ شیخ عبیداللہ تھے، جو شاہ صاحب کے ماموں اور خسر اور شاہ صاحب کے خلیفۂ اجل حضرت شیخ محمد عاشق پھلتی کے والد نامدار تھے[۲]، شاہ صاحب نے حضرت شیخ محمد پھلتی کی قوت تاثیر اور افادہ و افاضہ کے متعدد واقعات لکھے ہیں[۳]، شیخ محمد کی وفات ۹ رجمادی الآخرہ ۱۱۲۵ھ کو ہوئی[۴]

شاہ صاحب کے عم محترم شیخ ابوالرضا محمد

حضرت شیخ ابوالرضا محمد حضرت شیخ وجیہ الدین کے فرزند اکبر اور شاہ صاحب کے بڑے چچا ہیں، شاہ صاحب نے انفاس العارفین میں اپنے والد بزرگوار کے بعد ان کا مستقل تذکرہ لکھا ہے، ان کو امام الطریقۃ والحقیقۃ کے بلند الفاظ سے یاد کیا ہے، شاہ صاحب کے نزدیک (اگرچہ انھوں نے اساتذۂ وقت سے تعلیم پائی تھی) ان کے علوم زیادہ تر وہبی تھے، اپنے والد صاحب کی اجازت و ایماء سے ایک امیر کی سرکار میں آمد و رفت شروع کی کہ ناگاہ جاذبۂ توفیق الٰہی نے ان کو اس سے باز رکھا اور تجرید تام اور توکل کلی اور عمل بالسنۃ کو اپنا شعار بنایا، زوجۂ محترمہ کو بھی "اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا"[۵] پر عمل کرتے ہوئے اختیار دیا کہ اگر فقر و فاقہ برداشت ہے تو ہمارے ساتھ رہو، ورنہ میکہ چلی جاؤ، انھوں نے بھی

---

[۱] صفحہ ۲۰ [۲] حضرت شیخ محمد عاشق پھلتی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" ج ۶
[۳] صفحہ ۲۲-۲۵ [۴] صفحہ ۲۵ [۵] الاحزاب - ۲۸

ازواج مطہرات کی سنت پر عمل کرتے ہوئے فقر و فاقہ کو ترجیح دی، اور رفاقت نہیں چھوڑی، اکثر متواتر دو دو تین تین فاقے ہو جاتے، سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ سے نسبتِ خاص حاصل تھی اور سیدنا علی مرتضیٰ سے محبتِ خاص اور مناسبت باختصاص حاصل تھی[1] عالمگیر بادشاہ نے کئی مرتبہ زیارت کا ارادہ کیا قبول نہیں فرمایا، امراء و اہل دُوَل کی طرف بالکل التفات نہیں تھا، البتہ جوتے بنانے والوں، اور پیالی کا کام کرنے والوں اور ایسے ہی پیشہ وروں کی طرف بڑی توجہ فرماتے تھے، اگر وہ چار پانچ پیسے ہدیۃً نذر کرتے تو بڑی خوشی سے قبول فرماتے۔

شاہ صاحب نے ان کے تعارف میں قوی العلم، فصیح اللسان، عظیم الورع، وسیع المعرفہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں، زیبا صورت، طویل القامت تھے، رنگ گورا، داڑھی ہلکی، نرم کلام تھے، جمعہ کی نماز کے بعد وعظ کہتے تھے، اور تین حدیثیں زبانی سناتے تھے، پھر فارسی میں اس کے بعد ہندی (ریختہ) میں ان کا ترجمہ کرتے تھے، اور ان احادیث کے مطالب پر روشنی ڈالتے تھے، لیکن اعتدال و اختصار کے ساتھ، پہلے ہر فن کی ایک کتاب پڑھاتے تھے، اور لوگ ان کی تقریر کے ذوق میں بہت جمع ہو جاتے تھے، آخر میں صرف دو سبق رہ گئے تھے، ایک بیضاوی کا ایک مشکوٰۃ کا، وحدۃ الوجود کے قائل تھے، اور اس بارے میں صاحبِ تحقیق تھے، صوفیا کے متعلق ملفوظات کی خوب شرح کرتے تھے، مستجاب الدعوات تھے، شاہ صاحب نے ان کی محبوبیت و اجتبائی شان کے بہت سے واقعات لکھے ہیں[2] سنتوں کے ادا کرنے کا بڑا اہتمام تھا، ہندی کے عارفانہ دوہے کبھی کبھی پڑھتے تھے، شاہ صاحب نے ان کے کشف و کرامات کے متعدد واقعات لکھے ہیں[3] شاہ صاحب نے بڑی تفصیل سے ان کے ملفوظات درج کئے ہیں، جن کا سمجھنا اور

---

[1] انفاس العارفین ص۸۶-۸۸ [2] ایضاً ص۸۹-۹۰ [3] ایضاً ص۹۰-۹۴

ان سے فائدہ اٹھانا بھی اس زمانہ میں مشکل ہے اس لئے ان کو ترک کیا جاتا ہے[1]، عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان تھی، ۱۰ محرم الحرام ۱۱۰۱ھ کو نماز عصر کے بعد سفر آخرت اختیار کیا، آفتاب کے لفظ سے تاریخ وفات نکلتی ہے[2]۔

والد بزرگوار حضرت شاہ عبد الرحیمؒ

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اپنے والد بزرگوار حضرت شاہ عبد الرحیم صاحبؒ کے حالات، کمالات و کرامات میں خود ایک مفصل کتاب تحریر فرمائی ہے، جس کا نام عربی میں "بوارق الولایۃ" اور مشہور نام "انفاس العارفین[3]" ہے، ایک باکمال فرزند کے قلم سے باکمال پدر بزرگوار کے حالات میں مورخانہ اور ذمہ دارانہ طریقہ پر مستقل کتاب لکھنے کی اسلام کی علمی تاریخ میں زیادہ مثالیں نہیں ملتیں، اس سلسلہ میں علامہ تاج الدین سبکی کا اپنی شہرۂ آفاق کتاب "طبقات الشافعیۃ الکبریٰ" میں اپنے والد نامدار علامہ شیخ تقی الدین السبکی کا مفصل تذکرہ[4] اور فخر المتاخرین ابو الحسنات مولانا عبد الحی صاحب فرنگی محلی کا اپنے والد بزرگوار مولانا عبد الحلیم لکھنوی کے حالات میں مستقل رسالہ "حسرۃ العالم بوفاۃ مرجع العالم" کو بطور نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس کتاب میں سے زیادہ تر وہ حالات و واقعات انتخاب کئے جائیں گے، جو ان کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہیں، اور جن سے ان کے علمی، دینی اور روحانی پایہ کا کچھ اندازہ

---

[1] انفاس العارفین ص۹۳-۱۱۹ [2] ایضاً ص۱۵۵

[3] پہلی مرتبہ مطبع احمدی دہلی میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی دوبارہ مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوئی جو اس وقت بذکر طباعت پیش نظر ہے [4] یہ باریک ٹائپ کے ۱۸ صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔

ہو سکتا ہے' اور خود شاہ صاحب کی زندگی اور رجحان اور مزاج و مذاق کی تشکیل میں انھوں نے جو بنیادی کردار ادا کیا ہوگا، اس کے تعین میں مدد مل سکتی ہے' کرامات و کشوف' روحانی تجربات و ترقیات کا (جس کا وہ خاص دور اور صاحب تذکرہ کو اس سے خاص مناسبت تھی) زیادہ ذکر نہیں کیا جائیگا کہ ان کا فہم و ادراک بھی اس زمانہ کے لوگوں کے لئے مشکل ہے' اس کے لئے اصل کتاب کی طرف رجوع مناسب ہوگا، صرف اجمالاً اتنا لکھنا ضروری ہے کہ شاہ صاحب کے حالات ایک اعلیٰ روحانی استعداد اور فطری و باطنی کمال پر دلالت کرتے اور اولیائے متقدمین کی یاد تازہ کرتے ہیں، جن کی استعدادیں نہایت قوی، زمانہ نہایت مساعد اور ماحول نہ صرف سازگار بلکہ محرک و مشوق تھا، اور "کُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ[1]" کے بموجب اس میدان میں اللہ تعالے کی قدرت' اس کی تربیت' اور اس کی تجلیات کا ظہور تھا، اور "كُلًّا نُّمِدُّ هَٰؤُلَاءِ وَهَٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا[2]" (ان کو اور ان کو سب کو تمہارے پروردگار کی بخشش سے ہم مدد دیتے ہیں اور تمہارے پروردگار کی بخشش (کسی سے) رکی ہوئی نہیں ہے) کی تفسیر۔

شاہ عبدالرحیم صاحب کے نانا (جو خود بڑے پایہ کے بزرگ تھے) شیخ رفیع الدین نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنا اثاثہ اپنے وارثوں کے درمیان تقسیم کر دیا، اپنی اولاد میں ہر ایک کو اس کے حسب حال سامان دیا، شاہ عبدالرحیم صاحب کی والدہ ان کی سب سے چھوٹی اولاد تھیں' جب ان کی باری آئی تو ان کو طریقت کے فوائد و اوراد اور مشائخ کا شجرہ عنایت فرمایا، شاہ رفیع الدین صاحب کی اہلیہ محترمہ نے کہا کہ ابھی اس بچی کی شادی بھی نہیں ہوئی' اس کو جہیز کا سامان دینا چاہئے تھا، نہ کہ یہ رسائل' فرمایا کہ یہ رسائل ہیں اپنے بزرگوں سے ترکہ میں ملے ہیں' اس بچی کا ایک فرزند ہوگا جو ہماری اس معنوی میراث کا مستحق ثابت ہوگا، جہاں تک

---

[1] سورۃ الرحمٰن ــ ۲۹ [2] سورۃ الاسراء ــ ۲۰

جہیز و شادی کے سامان کا تعلق ہے، اللہ اس کا انتظام فرمائے گا، ہمیں اس کی فکر نہیں، شاہ عبدالرحیم صاحب فرماتے ہیں کہ جب میں پیدا ہوا، اور کچھ سیانا ہوا تو میری نانی نے وہ سامان میرے حوالہ کیا، اور میں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔[1]

شاہ عبدالرحیم صاحب کی ولادت کا سنہ کہیں صراحتاً نہیں ملتا، لیکن چونکہ انھوں نے ۱۱۳۱ھ میں وفات پائی، اور ۷۷ برس کی عمر ہوئی، اس لئے سنہ ولادت ۱۰۵۴ھ ہونا چاہیے۔[2]

شاہ عبدالرحیم صاحب تین بھائی تھے، شیخ ابوالرضا محمد، شیخ عبدالحکیم اور شاہ عبدالرحیم۔

شاہ عبدالرحیم صاحب فرماتے ہیں کہ میں صغر سنی ہی میں سر پر پگڑی باندھ کر سر بہ زانو بیٹھتا، وضو میں تمام اعضاء کو پورے طور پر دھوتا، اور وضو کی سنتوں کا اہتمام کرتا، میرے ماموں شیخ عبدالحی جو خود صالح بزرگ تھے، دیکھ کر خوش ہوتے، اور فرماتے کہ اس کو دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ اسلاف کی یہ دولت ہماری نسل میں باقی رہے گی، اگر پوتوں کو نہ ملی تو کیا حرج ہے نواسے اس کے حامل و محافظ ہوں گے۔[3]

شاہ عبدالرحیم صاحب کی بچپن ہی سے طبیعت دین کی طرف مائل اور دنیا کی دولت و عزت سے اچاٹ تھی، جو بزرگ کوئی ایسا وظیفہ بتانا چاہتے جس سے دنیا کا کوئی مقصد حاصل ہوتا، اس کی طرف توجہ نہ کرتے، اور کہتے مجھے اس کی ضرورت نہیں، ایک نقشبندی بزرگ نے جن کا نام خواجہ ہاشم تھا، اور بخارا سے تشریف لا کر شاہ صاحب کے محلہ ہی میں فروکش تھے، ان کی طبیعت کا یہ انداز دیکھ کر ان کو اس کتابت[4] کا

---

[1] انفاس العارفین ص۲۰ [2] ایضاً ص۵۸ [3] ایضاً ص۲۰

[4] مشائخ لوح دل پر اللہ کا نام نقش کرنے کے لئے کاغذ پر اسم ذات کو کثرت سے لکھواتے ہیں، تاکہ وہ ذہن پر منقش ہو جائے، یہ یاد الٰہی کے لیے ایک طریقۂ علاج تھا۔

والیہ تلقین کیا، شاہ صاحب فرماتے تھے کہ مجھ پر اس کا ایسا غلبہ ہوا کہ میں نے ملا عبد الحکیم کا حاشیہ (یہ شرح عقائد پر ملا عبد الحکیم کا حاشیہ ہے) نقل کرنا شروع کیا، پورے ایک جزء پر اسم ذات لکھتا چلا گیا، اور مجھے شعور نہ ہوا۔[1]

شاہ صاحب حضرت خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادہ شیخ عبد اللہ مشہور بخواجہ خورد کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، جو بڑے عارف تھے، بعض غیبی اشارات اور روحانی بشارات کی بناء پر انھوں نے ان سے بیعت کی درخواست کی، انھوں نے خیر خواہانہ مشورہ دیا کہ سید آدم بنوریؒ کے خلفاء میں سے کسی ایسے شیخ سے جو تشرع اور ترک دنیا اور تہذیب نفس میں راسخ القدم ہو اس سے بیعت کروں، میں نے کہا کہ ہمارے جوار میں حضرت کے خلفاء میں حافظ سید عبد اللہ[2] تشریف رکھتے ہیں، فرمایا بہت غنیمت ہیں، جلد ان سے بیعت ہو جاؤ، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اگرچہ ان پر اخفاء خمول (بے نشانی) کا غلبہ تھا، انھوں نے پہلی درخواست پر بیعت فرمایا، میں دونوں بزرگوں خواجہ خورد اور سید عبد اللہ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا، اور ان کے فیض صحبت سے مستفیض، حافظ سید عبد اللہ کی بھی توجہ من جانب اللہ شاہ عبد الرحیم صاحب کی جانب تھی، ایک مرتبہ فرمایا، تم بچہ تھے اور بچوں میں کھیل رہے تھے، میری طبیعت کی تمہاری طرف کشش ہوئی، میں نے دعا کی کہ خدایا اس بچہ کو اولیاء میں شامل فرما، اور اس کا کمال میرے ہاتھ سے ظاہر ہو، الحمد للہ کہ اس دعا کا ثمرہ ظاہر ہوا۔[3]

تعلیم

شاہ عبد الرحیم صاحب نے چھوٹے رسائل سے شرح عقائد اور حاشیہ خیالی تک اپنے برادر بزرگ

---

[1] ایضاً ص۵ [2] حافظ سید عبد اللہ کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو "انفاس العارفین" از ص۱۰-۱۵ [3] ایضاً ص۱۱

ابوالرضا محمد سے پڑھے، بقیہ کتابیں مرزا زاہد ہروی (مشہور بہ میر زاہد) سے پڑھیں فرماتے تھے کہ شرح مواقف اور اصول کی ساری کتابیں مرزا زاہد سے پڑھیں ان کی مجھ پر خصوصی توجہ تھی، یہاں تک کہ اگر میں کسی دن کہتا کہ آج میں نے مطالعہ نہیں کیا ہے تو فرماتے کہ ایک دو سطر پڑھ لو، تاکہ ناغہ نہ ہو، خواجہ خورد سے بھی حاشیہ خیالی وغیرہ کے مشکل مقامات میں رجوع کیا اور تشفی ہوئی، بعض اوقات ایسا ہوا کہ کسی کتاب کا ابتدائی حصہ پڑھا اور آخر تک اس کا درس خود دیا، خواجہ خورد شاہ عبدالرحیم صاحب کے نانا شیخ رفیع الدین کے شاگرد تھے اور خواجہ خورد نے ان سے علمی و باطنی دونوں طرح کا استفادہ کیا تھا، اس لئے وہ ان کے ساتھ بڑی خصوصیت اور احترام کے ساتھ پیش آتے تھے۔

حافظ سید عبداللہ کی وفات کے بعد شاہ عبدالرحیم صاحب نے سلسلۂ ابوالعلائیہ احراریہ کے ایک بلند مرتبہ خلیفہ شیخ ابوالقاسم اکبرآبادی[1] سے رجوع کیا، امیر نورالعلا سے بھی استفادہ کیا، خلیفہ ابوالقاسم نے شاہ صاحب کو اجازت بھی دی، خلیفہ صاحب شاہ عبدالرحیم صاحب کی تعظیم اور خصوصی خیال اس لئے بھی کرتے تھے کہ ان کو شاہ عبدالرحیم صاحب کے جد مادری شیخ عبدالعزیز شکربار سے بھی خصوصی نسبت تھی۔

شاہ صاحب نے "انفاس العارفین" میں شاہ عبدالرحیم صاحب کے اپنے زمانہ کے مشائخ و اولیاء اور مجاذیب سے ملاقاتوں، ان کی توجہ خصوصی کے بہت سے واقعات لکھے ہیں کہ

---

[1] شیخ ابوالقاسم شیخ ولی محمد نارنولی کے خلیفہ تھے، اور وہ امیر ابوالعلاء حسینی اکبرآبادی کے، شیخ ابوالقاسم نے ابوالعلاء کا زمانہ پایا، اور ان کی صحبت اٹھائی لیکن اجازت شیخ ولی محمد نارنولی سے پائی، وفات ۱۰۹۶ھ، واضح ہے کہ ابوالعلائی احراری سلسلہ میں چشتیت و نقشبندیت کا امتزاج ہے کالپی کا مشہور سلسلہ جس کے شیخ سید محمد ترمذی تھے اس سلسلہ سے تعلق رکھتا ہے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" ج ۵ ص ۲۲)

یہ زمانہ جذب وسلوک، خدا طلبی، عشق الٰہی اور درویشی کا گویا موسم بہار تھا، اور ایسے حضرات کی کثرت تھی جو اس کا ذوق رکھتے تھے، اور روحانی اور باطنی کمالات سے آراستہ تھے[1]، اور انھوں نے شاہ صاحب پر خاص توجہ فرمائی، اور ان سے شاہ صاحب کی اچھی صحبتیں رہیں، شاہ صاحب نے حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کے کشف ارواح وغیرہ کے بہت سے واقعات لکھے ہیں، جن سے ان کی باطنی قوت کا اندازہ ہوتا ہے[2]، اسی طرح ان کے اشراقات اور کرامات کے واقعات درج کئے ہیں، اس کے بعد شاہ صاحب نے بہت تفصیل سے ان کے ملفوظات درج کئے ہیں[3]، ملفوظات سے ان کی دقتِ نظر، غیر معمولی ذہانت، اور اعلیٰ استعداد علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں، والد صاحب کا عمل اکثر امور میں مذہب حنفی کے موافق تھا، لیکن بعض مسائل میں حدیث کے مطابق یا اپنے وجدان سے کسی دوسرے مذہب فقہی کو بھی ترجیح دیتے تھے، ان تفردات یا استثناءات میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ کا پڑھنا، جنازہ میں بھی سورہ فاتحہ پڑھنا تھا۔

کم سنی سے خواجہ خورد کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان سے روحانی وعلمی استفادہ اور ان کی شخصیت وباطنی کمالات سے متاثر ہونے، نیز خواجہ ابوالقاسم اکبرآبادی سے بھی روحانی تربیت حاصل کرنے کی بنا پر (جو اس سلسلۂ ابوالعلائیہ میں صاحبِ اجازت تھے، جو حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت خواجہ باقی باللہ کے واسطے کے بغیر خواجہ عبید اللہ احرار اور سلسلۂ نقشبندیہ کے مشائخ کبار تک پہونچتا تھا) نیز انھوں نے امیر نور العلاء بن امیر ابوالعلاءؒ

---

[1] ملاحظہ ہو ذکر ملاقات حضرت ایشاں با سائر اہل اللہ از مجاذیب وغیرآں، ص ۲۹-۳۴

[2] ملاحظہ ہو انفاس العارفین" ص ۳۵-۵۰ [3] ایضاً ص ۵۰-۶۵ [4] ایضاً ص ۶۶-۸۵

اکبر آبادی سے بھی استفادہ کیا تھا، شاہ عبدالرحیم صاحب پر حضرت سید آدم بنوری کی نسبت خاص کے مقابلہ میں جو مسلک وحدۃ الشہود میں راسخ القدم تھے حضرت خواجہ باقی باللہ کی نسبت غالب تھی، جو عرصہ تک توحید وجودی کے ذوق و مسلک پر رہے، اور یہ کہنا مشکل ہے کہ اس سے بالکلیہ انقطاع عمل میں آیا، یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ ان کے قریب کے اجداد مادری میں حضرت شیخ عبدالعزیز شکر بار (م ۹۷۵ھ) بھی گزرے ہیں جن پر توحید وجودی کا غلبہ تھا، ان موروثی و تربیتی اسباب کی بنا پر حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب توحید وجودی کا ذوق اور شیخ اکبر سے عقیدت، اور ان کی تحقیقات سے ایسا ذوق و شغف رکھتے تھے، جو جادۂ شریعت اور دائرۂ علم سے متجاوز نہیں ہونے پاتا تھا۔[1]

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ والد صاحب شیخ محی الدین ابن عربی کا نام بڑی تعظیم سے لیتے تھے، فرماتے تھے اگر میں چاہوں تو فصوص الحکم کا منبر پر کھڑے ہو کر بیان کروں، اور اس کے تمام مسائل کو آیات و احادیث کے ساتھ مبرہن کروں، اور اس طرح بیان کروں کہ کسی کو شبہ نہ رہے لیکن اسی کے ساتھ وحدۃ الوجود کی صراحت کرنے سے احتراز کرتا ہوں کہ اس زمانہ کے اکثر لوگ اس کو سمجھ نہیں سکیں گے، اور الحاد و زندقہ کے گڑھے میں گر جائیں گے۔

شاہ عبدالرحیم صاحب فتاویٰ عالمگیری کو ترتیب دینے والی جماعت علماء میں شامل تھے، جو ملک کے ممتاز ترین فقہ حنفی کے عالم و صاحب نظر و صاحب درس فقیہ تھے، اس جماعت کے نگراں کار اور صدر شیخ نظام الدین برہان پوری تھے، سلطان اورنگ زیب عالمگیر نے اس کام پر دو لاکھ روپیہ صرف کئے،[2] مصنف "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند" نے بڑے تفحص و تحقیق

---

[1] شاہ عبدالرحیم صاحب کے اس ذوق نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب تک منتقل ہو کر وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں تطبیق کا رنگ اختیار کر لیا۔ [2] اس زمانہ کے لحاظ سے پچاس لاکھ روپے سے کم نہیں ہوں گے۔

کے بعد اس کے مرتبین کے نام درج کئے ہیں، جن کی تعداد اکیس ہوتی ہے، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب بھی اس جماعت کے ایک رکن تھے[1]۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب "انفاس العارفین" میں لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں عالمگیر کو اس کتاب کی ترتیب و تدوین کا بڑا اہتمام تھا، ملا نظام (افسر سررشتۂ تدوین) روزانہ ایک صفحہ بادشاہ کے سامنے پڑھا کرتے تھے، ایک دن انھوں نے وہ حصہ پڑھا جو ملا حامد کے سپرد تھا، انھوں نے ایک ہی مسئلہ کے متعلق دو کتابوں کی دو متفرق عبارتوں کو جمع کرکے عبارت میں گنجلک پیدا کردی تھی، شاہ عبدالرحیم صاحب (جو ان کے دوست تھے) کی نظر جب اس مقام پر پڑی تو اس کی تحقیق کی معلوم ہوا کہ دو کتابوں کی مختلف المعنی عبارتیں جمع کردی ہیں، آپ نے سودہ کے حاشیہ پر عربی کی عبارت لکھدی کہ "من لم یتفقہ فی الدین قد خلط فیہ، ھذا غلط و صوابہ کذا" (یعنی تفقہ نہ ہونے کی وجہ سے کاتب سے یہاں خلطِ مبحث ہوگیا ہے، صحیح یوں ہے۔)

ملا نظام نے متن کی عبارت کے ساتھ شاہ عبدالرحیم صاحب کا حاشیہ بھی پڑھ دیا، وہ تو روانی میں پڑھتے گئے لیکن بادشاہ جو پوری توجہ سے سنتے تھے، چونک پڑے اور فرمایا "ایں عبارت چیست"؟ ملا نظام گھبرائے کہ انھوں نے اس کا مطالعہ نہیں کیا تھا، پھر سنبھل کر کہا کہ میں نے اس مقام کا مطالعہ نہیں کیا، کل تفصیل سے اس کا مطلب عرض کروں گا، گھر آئے تو ملا حامد سے شکایت کی کہ میں نے یہ حصہ تمہارے اعتماد پر چھوڑ دیا تھا، تمہاری وجہ سے مجھے بادشاہ کے سامنے خفت اٹھانی پڑی، ملا حامد نے اس وقت تو کچھ نہیں کہا، شاہ صاحب سے اس کی شکایت کی، شاہ صاحب نے کتابیں کھول کر ان کو دکھایا کہ عبارت میں خلل اور انتشار پیدا ہوگیا ہے، اس سے بعض معاصرین

---

[1] "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" از مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ۔ طبع المجمع العلمی دمشق۔ ص۱۱۱

اور رفقاء کو حسد پیدا ہوا، اور شاہ صاحب کچھ عرصہ اس کام میں شریک ہونے کے بعد اس سے علیحدہ ہو گئے[1]

اخلاق و شمائل و معمولات

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ وہ خصائل حمیدہ اور اخلاق ستودہ کے جامع تھے، شجاعت وفراست اور غیرت ان میں بدرجۂ اتم موجود تھی، عقل معاد کی طرح عقل معاش بھی کامل اور وافر طور پر رکھتے تھے، ہر معاملہ میں توسّط واعتدال کو پسند کرتے تھے، زہد و عبادت میں نہ اتنا تعمق اور غلو تھا کہ رہبانیت سے اس کے حدود مل جائیں، اور نہ اتنی بے تکلفی اور وسعت کہ تساہل تک بات پہونچ جائے، لباس میں تکلف نہیں تھا، نرم اور سخت لباس جو میسر آتا استعمال فرماتے، یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ان کو اچھا ہی لباس مرحمت فرمایا، اللہ تعالیٰ ان کی سب ضرورتیں پوری کر دیتا تھا، بازار جا کر کسی چیز کے خریدنے کی شکل ہی سے نوبت آتی، امراء اور رؤساء کے گھروں پر تشریف نہیں لے جاتے تھے، اس دروازہ کو کلیۃً بند کر رکھا تھا، ہاں اگر اس طبقہ کے لوگ خود زیارت کے لئے آتے تو آپ بڑی خندہ پیشانی اور اخلاق سے پیش آتے، ان میں جو زیادہ معزز ہوتا اس کا اسی طرح اعزاز کرتے، اور اگر وہ نصیحت کی فرمائش کرتے، تو بڑی نرمی کے ساتھ نصیحت فرماتے، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دیتے، ہمیشہ علم و علماء کی تعظیم کرتے، جہالت اور جاہلوں سے نفور رہتے، ہر حال میں آثار نبوی کا تتبع کرتے، استقامت کی بات یہ ہے کہ کبھی ساری زندگی بغیر عذر کے جماعت فوت نہیں ہوئی، بچپن و جوانی میں کبھی منہیات کی طرف میلان نہیں ہوا، ضروری امور میں بیع و شراء سے بھی احتراز نہ کرتے، نہ متقشّف علماء کی پُر تکلف ہیئت کی

---

[1] انفاس العارفین ص ۲۳۳

پابندی کرتے، نہ آزاد فقراء وصوفیاء کے بے قید لباس کی بے تکلف زندگی گذارتے تھے، بغیر ضرورت کے قرض لینا پسند نہیں کرتے تھے، جو لوگ تنعم و تفکہ (لذت اندوزی اور لطف) کے لئے قرض لیتے اس کو ناپسند فرماتے اور ملامت کرتے، طب میں بھی ذہن رسا پایا تھا۔

روزانہ ایک ہزار بار درود شریف، ایک ہزار بار نفی اثبات، کچھ حصہ جہر اور کچھ حصہ خفا کے ساتھ، بارہ ہزار بار اسم ذات روزانہ کا معمول تھا، اپنے بھائی ابوالرضا محمد کے انتقال کے بعد مشکوٰۃ، تنبیہ الغافلین، غنیۃ الطالبین کو سامنے رکھ کر وعظ فرماتے آخر میں تفسیر کا سلسلہ شروع کیا تھا، زہراوین (سورہ بقرہ وآل عمران) سے فارغ ہوئے تھے کہ ضعف کا غلبہ ہوا، اور یہ سلسلہ موقوف ہوگیا۔

حمیت اسلامی

حضرت شاہ عبدالرحیمؒ میں بھی اپنی خاندانی روایت کے مطابق، اور پدر بزرگوار شہیدؒ (شیخ وجیہ الدین) کی وراثت میں مجاہدانہ جذبات اور حمیت اسلامی پورے طور پر موجود تھی، اور یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ ان کے خاندان والا شان میں نسلاً بعد نسل جہاد وعزیمت کا سلسلہ منقطع نہیں ہونے پایا تھا، غیرت وشجاعت ان کو خاندانی ورثہ میں ملی تھی، اگرچہ شخصی وجسمانی طور پر کسی معرکۂ جہاد میں شرکت کا ذکر نہیں ملتا، مگر "انفاس العارفین" میں درج واقعات سے ان کے علوِ ہمت، عمل بالعزیمت اور دینی غیرت کا اظہار ہوتا ہے، اور یہی دولت ہے، جو ان کی اولاد میں منتقل ہوئی۔

ازدواج واولاد

شاہ عبدالرحیمؒ صاحب کا پہلا نکاح اپنے والد صاحب کی زندگی میں ہوا تھا جن سے ایک صاحبزادہ صلاح الدین نام پیدا ہوئے، جو کچھ بڑے ہو کر فوت ہو گئے[1]، زوجہ محترمہ عرصہ تک حیات رہیں اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی شادی کے بعد ۱۱۲۸ھ یا ۱۱۲۹ھ میں وفات پائی۔[2]

دوسرا نکاح کبر سنی میں بعض بشارات و اشارات غیبی کی بناء پر شیخ محمد پھلتی صدیقی کی صاحبزادی سے ہوا، جن سے دو صاحبزادے تولد ہوئے، شاہ ولی اللہؒ اور شاہ اہل اللہؒ۔

وفات

۷۷ سال کی عمر میں رمضان میں آخری بار روزے رکھے، شوال میں بیمار ہو گئے، اور امید زیست منقطع ہو گئی، لیکن اس کے بعد صحت عود کر آئی، لیکن اوائل صفر میں مرض پھر غالب آیا، صبح صادق سے پہلے آثار موت ظاہر ہوئے تو پوری توجہ اس طرف تھی کہ نماز فجر فوت نہ ہو، اس ضعف کی حالت میں کئی بار پوچھا کہ صبح ہو گئی یا نہیں، حاضرین مجلس نے کہا کہ ابھی نہیں ہوئی، جب وقت آخر بالکل قریب آگیا، تو ان جواب دینے والوں کو سختی سے جواب دیا کہ اگر تمہاری نماز کا

---

[1] القول الجلی سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے علاتی بھائی شیخ صلاح الدین جوانی کی عمر تک پہونچے، القول الجلی (قلمی)۔ [2] شاہ صاحبؒ "الجزء اللطیف" میں لکھتے ہیں کہ ۱۴ سال کی عمر میں میرے والد نے میرا نکاح کر دیا، اور بڑی عجلت فرمائی، جو لوگ مہلت چاہتے تھے ان سے فرمایا کہ اس میں مصلحت ہے، شادی کے بعد ہی متعدد خاندانی حادثے پیش آئے کہ ان میں سے کوئی حادثہ پیش آتا تو شادی ملتوی ہو جاتی، ان حوادث میں آخری حادثہ کے طور پر اپنے بڑے بھائی صلاح الدین کی والدہ صاحبہ کی وفات کا ذکر کیا۔ صـ۲

وقت نہیں آیا تو ہماری نماز کا وقت آگیا، فرمایا میرا رخ قبلہ کی طرف کر دو، اس وقت اشارہ سے نماز پڑھی حالانکہ وقت میں شک تھا، اس کے بعد زیر لب اسم ذات کے ذکر میں مشغول ہوگئے، اور جان جان آفریں کے سپرد کی، یہ واقعہ چہار شنبہ ۱۲ صفر ۱۱۳۱ھ کا ہے، یہ فرخ سیر کی حکومت کے آخر کا دور ہے، آپ کے انتقال کے بعد فرخ سیر پچاس دن محبوس رہا اور شہر میں بڑا اضطراب پیدا ہوا، انتقال کے وقت عمر شریف ۷۷ سال تھی[1]۔

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی نظر میں

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کی اگرچہ کوئی اہم تصنیف جس سے ان کا علمی مرتبہ ظاہر ہو (سوائے ایک رسالہ کے) موجود نہیں ان کی شہرت زیادہ تر اپنے لائق اور باکمال فرزند ہی کے ذریعہ ہے، اور انھیں نے ان کا تعارف "انفاس العارفین" کے ذریعہ کرایا، جہاں تک علم ہے، ان کے حالات میں ان کے کسی اور مسترشد کی کوئی کتاب نہیں، لیکن شاہ صاحبؒ کی تصنیفات بالخصوص "انفاس العارفین" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کے علوئے مرتبہ، قوتِ باطنی، مقبولیت عنداللہ، اور علم و سلوک میں ان کے مراتب عالیہ سے علی وجہ البصیرۃ اس سے زیادہ معتقد اور متاثر ہیں، جتنا کہ ایک سعادت مند فرزند عام طور پر اپنے باکمال باپ کے کمالات و احسانات کا معترف اور مداح ہوتا ہے، شاہ صاحب کو ان کے کمالات باطنی و علمی کے بارے میں علم الیقین اور وجدانی کیفیت، اور ان کے تذکرہ میں ایک شکر اور سرشاری کی کیفیت معلوم ہوتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کی تعلیم و تربیت، کمالات علمی و باطنی کے حصول، اور علم و سلوک میں درجۂ امامت ــــــ و اجتہاد تک پہونچنے میں والد بزرگوار کی

---

[1] انفاس العارفین ص ۸۳-۸۵

نسبتِ باطنی، قوتِ تاثیر اور شفقت اور دعاؤں کا بڑا حصہ ہے۔

ہندوستان کے عربی النسل خاندان اور ان کی خصوصیات و روایات

شاہ صاحبؒ کے اجدادِ کرام کے مختصر تذکرہ سے (جس کا خلاصہ ان صفحات میں پیش کیا گیا ہے) اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں تین نمایاں صفتیں قدرِ مشترک کے طور پر بالعموم متوارث رہیں۔

۱۔ ایک علم و دین، ورع و تقویٰ اور قضا و افتاء سے عمومی تعلق[1]، جو علم و دین سے نسلی و خاندانی مناسبت اور عربیت و علوِ ہمت کی بناء پر (جس کو خاندانی روایات و واقعات اور مخلص و بلند ہمت سرپرستوں اور مربیوں کی تعلیم و تربیت غذا پہونچاتی رہتی تھی) بعید از قیاس نہیں، اسلاف کے کارناموں اور ان کی صلاح و تقویٰ کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے بہت سے خاندانوں کی حفاظت فرمائی ہے، اور دولتِ دین کی حفاظت کا ان میں اسی طرح سے انتظام فرمایا ہے، جیسا کہ ان دو یتیموں کی دیوار کو اپنے ایک مقبول بندہ کے ذریعہ گرنے سے بچایا اور مستحکم کردیا، جن کا باپ صلاح و دینداری سے متصف تھا" وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا[2]" (ان دونوں کا باپ نیک تھا) ہندوستان کے بیسیوں خاندانوں کی تاریخ اس تسلسل اور حفاظت و عنایتِ خداوندی کی شہادت دیتی ہے، جن میں صدیوں تک علم و دین، قضاء و افتاء، تدریس و تصنیف اور ارشاد و ہدایت کا سلسلہ جاری و قائم رہا۔

۲۔ دوسری حفظِ انساب، خاندانی شجروں کی ترتیب و نگہداشت اور "کفاءت" کا

---

[1] ظاہر ہے کہ یہ کوئی کلیہ نہیں جس میں کسی استثناء کی گنجائش نہ ہو، شرفاء و اہلِ فضل کے خاندانوں کی طرح اس کو "اکثریہ" ہی کہا جاسکتا ہے۔

[2] ملاحظہ ہو سورۂ کہف کی آیات "وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ (الی) رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ" (الکہف ۸۲)

وہ معیار و اہتمام جو بلادِ عربیہ اور قدیم اسلامی ممالک میں بھی اس درجہ میں نہیں تھا، غالباً اس کی وجہ دیارِ عجم میں اپنے اس نسب کی حفاظت کا جذبہ (جو یہ خاندان بلادِ عربیہ سے لے کر آیا تھا) اور خود ہندوستان کے طبقاتی نظام اور خاندانی تفاخر کا اثر بھی اس کا باعث تھا باوجود اس کے کہ شریعت نے اس اہتمام کا مکلف نہیں کیا ہے' اور اس میں بعد کی صدیوں اور غیر عرب ملکوں میں غلو پیدا ہو گیا ہے' لیکن اس کے ساتھ اس کا یہ نتیجہ ضرور قابلِ لحاظ ہے کہ صدیوں تک ان خاندانوں میں نسلی خصوصیات قائم رہیں' اور وہ عجمی اور غیر اسلامی ملک کے معاشرہ اور تہذیب میں تحلیل نہ ہونے پائے۔

۳۔ تیسری صفت جلادت و شجاعت' سپہ گری کے صفات جس کو عربی میں "فروسیۃ" اور "فتوۃ" (شہسواری و مردانگی) کے لفظ سے ادا کیا جاتا ہے' جو نسلِ عرب اور قبیلۂ قریش کی نسلی و موروثی صفت ہے' اور جس کے نمونے شیخ معظمؒ اور شیخ وجیہ الدینؒ کے حالات میں واضح طور پر گذر چکے ہیں' اور اس کا ظہورِ اتم خود شاہ صاحب کے پوتے مولانا شاہ محمد اسماعیل صاحب شہیدؒ کی زندگی میں دیکھنے میں آتا ہے۔

ان نمایاں صفات کے ظہور و توارث کے نفسیاتی و عقلی اسباب بھی ہیں' جو عربی النسل خاندان تاریخ کے مختلف دوروں میں حجاز، عراق، اور ایران و ترکستان سے ہندوستان منتقل ہوتے رہے' ان میں سے اکثر کی ہجرت اور ہندوستان میں توطن کا سبب یا اپنے دین و ایمان کی حفاظت یا عزت و ناموس بچانے کا جذبہ تھا کہ وہ تاتاری حملہ سے خطرہ میں پڑ گئے تھے' یہ مقصد بعد کی کئی پشتوں تک لوگوں کو یاد رہا' اور ان کو بھی اس کی لاج تھی' اللہ تعالیٰ نے بھی اس کی برکت سے ان کے دینی حالات میں ترقی دی کہ وہ " فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا " (آل عمران۔ ۱۹۵) کا مصداق تھے۔

یا جہاد فی سبیل اللہ اور دعوت الی اللہ کا جذبہ تھا جس کا اس وقت (چھٹی ساتویں صدی ہجری کی دنیا میں) ہندوستان میں سب سے بڑا میدان تھا، اس وسیع ملک کے جس کو برصغیر کہنا صحیح ہوگا، بہت سے حصے سلطنت اہل اسلام کے ابھی زیر نگیں نہیں آئے تھے، اور وہاں مختلف حاکم و راجہ حکومت کر رہے تھے، اور بعض اوقات احکام شرعی کی تعمیل اور شعائر اسلام کے اظہار میں خلل انداز ہوتے تھے، ان میں سے بہت سے وقتاً فوقتاً سرکشی اور بغاوت بھی کرتے رہتے تھے، ہر جگہ لشکر سلطانی کا پہونچنا مشکل بھی تھا، بیرون ہند سے آنے والے ان شریف و نجیب اور حوصلہ مند اور جہاد و غزا کے شائق عربی النسل خاندانوں اور ان کے سربرآوردہ افراد کے لئے ان علاقوں کا فتح کرنا اور ان کو مرکزی سلطنت کے حوالہ کرنا ان کی حوصلہ مندیوں کی تسکین کا سامان بھی تھا، دینی جذبات کی آسودگی کا ذریعہ بھی، اور دنیاوی وجاہت و امارت کا وسیلہ بھی، ان کو ان علاقوں میں معافیاں دی جاتی تھیں، ان کے افراد منصب قضا و نیابت پر مامور بھی ہوتے تھے، چنانچہ ان عربی و ایرانی النسل خاندانوں کی تاریخوں میں بکثرت ایسے واقعات ملتے ہیں کہ ان کے پیش روؤں نے ہندوستان کے بعض ایسے دور دراز علاقے اور مجہول اور غیر اہم مقامات فتح کئے، جو باقاعدہ ممالک محروسہ میں داخل نہیں ہو سکے تھے۔[1]

---

[1] اس کی ایک مثال امیر کبیر سید قطب الدین محمد المدنی (م ۶۷۷ھ) ہیں جو اودھ کے خاندان قطبی حسنی کے بانی اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے جد امجد ہیں، وہ غزنی کے راستہ سے ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں اعزہ و سادات اور غزنی کے رؤسا و شرفاء و مجاہدین کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ دہلی تشریف لائے، دہلی سے پورب کا قصد کیا اور اول قنوج، پھر مانک پور اور کڑہ پر (جو اس زمانہ میں ایک مستقل حکومت کا مرکز تھا) حملہ کیا اور اس تمام علاقے کو فتح کرکے اسلامی حکومت میں شامل کیا۔ (سیرت سید احمد شہیدؒ اول ص۹)

ان خاندانوں کو اس کا احساس تھا کہ ہم ہندوستان میں ایک بلند مقصد کے لئے آئے تھے، ہمارے دین، ہماری تہذیب اور ہماری سعادت کا اصل سرچشمہ مرکز اسلام جزیرۃ العرب اور حجاز مقدس ہے، ہم کو اپنی اس اصل سے کُلّی طور پر کبھی منقطع نہیں ہونا چاہئے، اور اپنے نسلی، تہذیبی اور اخلاقی امتیازات کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہئے، ہم جب ہی دنیا کے اس دور افتادہ حصہ اور بیگانہ تہذیب و ماحول میں جو اپنے اندر ایسی تحلیلی طاقت اور ایک طرح کا تیزاب رکھتا ہے جس نے باہر سے آنے والی قوموں اور نسلوں کو اپنے اندر کُلّی طور پر جذب اور ان کی خصوصیات کو فنا اور سوخت کر دیا، محفوظ اور باعزت رہ سکتے ہیں، اس احساس نے ان کے اندر دینی و نسلی غیرت اور خارجی اثرات کے مقابلہ میں غیر معمولی قوتِ مقابلہ پیدا کر دی جس سے ان کی انفرادی شخصیت بہت حد تک محفوظ اور ان کی خصوصیات صدیوں تک نسل در نسل منتقل ہوتی رہیں۔

اس حقیقت کا اظہار بڑے واضح طریقہ پر خود حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے اِس وصیت نامہ میں ہوا ہے، جو "المقالة الوضية فی النصيحة والوصية" کے نام سے انھوں نے قلم بند فرمایا، جس میں ان کے مخاطب سب سے پہلے ان کے خاندان کے لوگ ہیں، پھر تمام اہل تعلق اور ملت اسلامیہ ہندیہ، شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

> "ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ہم پردیسی لوگ ہیں، ہمارے اجداد نے ہندوستان ہجرت کی، نسب اور زبان کی عربیت ہمارے لئے دو بڑی فخر کی باتیں ہیں، یہی ہم کو سید الاولین والآخرین، افضل الانبیاء والمرسلین، مفخر کائنات و فخر موجودات محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قریب کرتی ہیں، اس نعمت عظمیٰ کے شکریہ کا تقاضا ہے کہ ہم امکانی حد تک ـــ

ان عربِ اولین کے عادات وروایات سے یکسر بے تعلق نہ ہونے پائیں جن میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نشو ونما ہوا تھا، اور عجمیوں کے رسوم اور ہندوؤں کے طور طریق کو اپنے اندر پھیلنے نہ دیں۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں :۔

"ہم میں خوش نصیب وہ ہے جس کو عربی زبان میں کچھ درخور حاصل ہو، صرف، نحو، ادب میں دخل ہو اور حدیث و قرآن سے واقفیت رکھتا ہو، ہمیں حرمین شریفین میں بھی حاضری دیتے رہنا چاہئے، اور اس سے قلبی وابستگی رہنی چاہئے، اس میں ہماری سعادت کا راز ہے، اور اس سے اعراض و روگردانی کرنے میں شقاوت و محرومی پنہاں ہے۔"[1]

عربی النسل اور عالی نسب ہونے کے ماسوا اس خاندان کو فاروقیت کا شرف بھی حاصل تھا، دیارِ عجم میں اس خاندان سے اللہ تعالےٰ نے بارہا حفاظت دین، شعائر اسلام کے اعلاء اور دشمن اسلام تحریکوں کے مقابلہ کا مجددانہ کام لیا، جس میں فاروقی غیرت کا بھی دخل تھا، اور فاروق اعظم سے نسبت و نسبی تعلق کا احساس و افتخار بھی کام کرتا ہو گا، جو ایک طاقتور نفسیاتی محرک بھی ہے، دسویں صدی ہجری میں اسی خاندان کے ایک فرد فرید نے اکبری فتنہ کا استیصال کیا، اور ہندوستان کو کفر و الحاد، وحدت ادیان کے فتنہ اور "نیا دور نیا آئین" نیا ہزارہ" "نئی امامت" کی خطرناک سازش کا شکار بننے سے بچا لیا[2] حضرت شیخ احمد فاروقی (مجدد الف ثانی) کو اس نسبت پر فخر تھا، اور وہ

---

[1] "المقالة الوضية فى النصيحة والوصية" فارسی، طبع دہلی ۱۲۶۸ھ

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ چہارم ص ۶۱-۹۳ اور ص ۱۰۵-۱۰۸

دینی حمیت کو اس کا تقاضا اور قدرتی نتیجہ سمجھتے تھے، جمہور اہلِ سنت اور عقائدِ اسلامیہ کے خلاف ایک مشہور عارف و شیخ کی ایک تحقیق سن کر ان کے قلم سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے ہیں۔

"مخدوما! ایں فقیر را تاب استماع امثال ایں سخنان نیست بے اختیار رگِ فاروقیم در حرکت می آید"[1]	مخدومی! یہ فقیر اس طرح کی باتوں کے سننے کی تاب نہیں رکھتا بے اختیار میری فاروقی رگ حرکت میں آجاتی ہے۔

اسی طرح یہ سن کر کہ قصبہ سامانہ میں خطیب نے خطبہ جمعہ میں خلفائے راشدین کا ذکر عمداً ترک کر دیا، تحریر فرمایا:۔

"چوں استماع ایں خبر وحشت انگیز در شورش آورد و رگ فاروقیم را حرکت داد، بچند کلمات اقدام نمود"[2]	جب اس خبر وحشت اثر سے طبیعت میں اضطراب پیدا ہوا، اور اس نے میری فاروقی رگ کو حرکت دی، یہ چند لفظ میرے قلم سے نکل گئے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی تجدید و احیاء دین کے وسیع اور کثیر الانواع کام میں، (جس میں اصلاح عقائد، ردِ شرک و بدعت، اشاعت کتاب و سنت، ترویج فن حدیث، اثبات خلافت خلفاء راشدین، اور رفض و تشیع کی تردید شامل ہے) یقیناً یہ نسبت اور اس کے شرف و ذمہ داری کے احساس کو بھی دخل ہوگا، جو نفسیات، علم الحیاۃ، اور نسلی اصول و تجربات کے لحاظ سے (جس کے شواہد بکثرت نسلوں اور

---

[1] مکتوب ۲۰۳ دفتر اول بنام ملا حسن کشمیری۔

[2] مکتوب ۱۵ حصہ ششم دفتر دوم۔

خاندانوں کی تاریخ میں پائے جاتے ہیں) ہر طرح قرین قیاس اور مطابق عقل ہے، حدیث میں بھی آتا ہے کہ" الناس معادن کمعادن الذهب والفضة خیارهم فی الجاهلية خیارهم فی الاسلام اذا فقهوا"[1]

---

[1] لوگ اسی طرح سے (جواہرات کی) کانیں ہیں، جیسے سونے چاندی کی کانیں ہوتی ہیں، جو ان میں جاہلیت کے زمانہ میں بہتر تھے، وہ اسلام میں بھی بہتر ہیں، بشرطیکہ وہ (دین کی) سمجھ حاصل کریں۔

(روایت صحیح مسلم)

بابِ چہارم

مختصر حالاتِ زندگی[1]

ولادت

شاہ صاحب کی ولادت چہار شنبہ کے دن ۴ شوال ۱۱۱۴ھ طلوعِ آفتاب کے وقت اپنے نانیہال قصبہ پھلت (حال ضلع مظفر نگر) میں ہوئی، تاریخ ولادت عظیم الدین سے نکلتی ہے[2]، شاہ ولی اللہ صاحب کی ولادت کے وقت آپ کے والد ماجد حضرت شاہ عبد الرحیم صاحبؒ کی عمر ساٹھ سال تھی، شاہ عبد الرحیم صاحبؒ کو اس مبارک فرزند کی ولادت سے پہلے بہت سے مبشرات نظر آئے تھے، شاہ عبد الرحیم صاحب نے ساٹھ سال کی عمر میں پہلی اہلیہ کی موجودگی میں جو شیخ صلاح الدین کی والدہ تھیں، شادی کا ارادہ کیا، اس میں اشارات غیبی اور بشارات کو دخل تھا، جب شیخ محمد پھلتی کو معلوم ہوا تو

---

[1] خوش قسمتی سے حضرت شاہ صاحبؒ کے قلم سے اختصار کے ساتھ اپنی زندگی کے ضروری حالات، تعلیم و تعلیمی نصاب جو انھوں نے پڑھا، والد صاحبؒ کی تعلیم و تربیت کے بعض خصوصی انداز، بیعت و اجازت، سفرِ حجاز اور وہاں کے مشائخ سے استفادہ، ان کا تعارف و تذکرہ اور زندگی کے بعض اہم واقعات محفوظ ہوگئے ہیں، ان مواد و معلومات کے دو بڑے ماخذ ہیں، "الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف" اور رسالہ "انسان العین فی مشائخ الحرمین" شاہ صاحبؒ کی زندگی کے مختصر حالات انھیں دونوں کتابوں "الجزء اللطیف" اور "انسان العین" سے ماخوذ اور مقتبس ہیں، کہیں کہیں تفاس العارفین اور "القول الجلی" سے استفادہ کیا گیا ہے۔

[2] الجزء اللطیف ص ۲ مطبوعہ لاہور۔

انھوں نے اپنی صاحبزادی کو نکاح میں دینے کا فیصلہ کیا[۱] اور اوائل ۱۱۱۲ھ میں یہ مبارک عقد ہوگیا۔

"القول الجلی" سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اسم گرامی فخرالنساء تھا، اور وہ علوم دینیہ میں ایسا درک رکھتی تھیں جس کا خواتین کو بہت کم موقع اور شرف حاصل ہوتا ہے کتاب کے مصنف شیخ محمد عاشق پھلتی لکھتے ہیں، جو ان کے حقیقی بھائی کے فرزند تھے، "وصاحب البیت أدریٰ بما فیہ۔"

والدۂ شریفۂ شاں کہ بعلم شریعت از تفسیر و حدیث عالمہ، و بآداب طریقت متادبہ، و باسرار حقیقت عارفہ، و بمصداق اسم خود فخرالنساء بودند۔[۲]	آپ کی والدۂ ماجدہ تفسیر و حدیث جیسے علوم شرعیہ کی عالم، آداب طریقت سے آراستہ پیراستہ، اسرار حقیقت کی معرفت رکھنے والی، اور ان وجوہ سے حقیقتاً طبقۂ اناث کے لئے باعث فخر اور اسم با مسمّیٰ تھیں۔

ولادت سے پہلے شاہ عبدالرحیم صاحب نے خواجہ قطب الدین بختیار کعکیؒ کی خواب میں زیارت کی انھوں نے فرزند کی بشارت دی، اور فرمایا کہ اس کا نام میرے نام پر قطب الدین احمد رکھنا، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میری ولادت ہوئی تو والد صاحب کے ذہن میں یہ بات نہیں رہی، اور انھوں نے ولی اللہ نام رکھا، کچھ مدت کے بعد یاد آیا تو میرا دوسرا نام قطب الدین احمد تجویز کیا۔[۳]

شاہ صاحب سات سال کے تھے کہ والدین کے ساتھ تہجد میں شریک ہوئے، اور دعا کرتے وقت ان دونوں کے ہاتھوں میں اپنے ہاتھ دیئے، اور اس طرح وہ خواب پورا ہوا، جو ان کے والد ماجد نے ان کی ولادت سے قبل دیکھا تھا۔[۴]

---

۱ انفاس العارفین ص ۶۲-۶۳ ۲ القول الجلی (قلمی) محفوظ کتب خانہ خانقاہ کاظمیہ کاکوری ۳ انفاس العارفین ص ۲۰۲
۴ ایضاً ص ۲۰۳

تعلیم

شاہ صاحب کی عمر جب پانچ سال کی ہوئی تو مکتب میں داخل کیے گئے[1]، سات سال کی عمر میں سنت ابراہیمی ادا ہوئی اور ختنہ ہوا، اور اسی عمر سے نماز کی عادت ڈال دی گئی، اس سال کے آخر میں قرآن مجید کے حفظ سے فراغت ہوئی اور فارسی کتابیں اور عربی کے مختصرات پڑھنا شروع کیے[2]، اور کافیہ ختم کر، دس سال کی عمر میں شرح جامی شروع کی، فرماتے ہیں کہ مجھ میں یا بالجملہ مطالعہ کی استعداد پیدا ہوگئی[3]، چودہ سال کی عمر میں بیضاوی کا ایک حصہ پڑھا، پندرہ سال کی عمر میں ہندوستان میں رائج علوم متداولہ سے فراغت کی، والد صاحب نے اس خوشی میں بہت بڑی دعوت کی اور بڑے پیمانہ پر کھانا تیار کیا، جس میں خواص و عوام شریک ہوئے[4]۔

اسی پندرہ برس کی عمر میں والد صاحب سے مشکوٰۃ کا درس لیا، جس کا صرف تھوڑا حصہ (کتاب البیوع سے آداب تک) رہ گیا، کتاب کی قرأت دوسرے ساتھی نے کی تھی، جو حصہ رہ گیا تھا اس کی بھی اجازت والد صاحب سے حاصل ہوئی، والد صاحب ہی سے صحیح بخاری کتاب الطہارت تک، شمائل ترمذی مکمل، تفسیر مدارک و بیضاوی کا کچھ کچھ حصہ پڑھا[5]، فرماتے ہیں کہ خدا کا ایک بڑا انعام یہ ہوا کہ والد صاحب کے درس قرآن میں کئی بار شریک ہوا، جس سے معانی قرآن کا ایک دروازہ کھل گیا[6]۔

شاہ صاحب کا پڑھا ہوا نصاب

شاہ صاحب نے الجزء اللطیف میں اپنے پڑھے ہوئے نصاب کا تفصیل سے ذکر کیا ہے،

۱؎ الجزء اللطیف ص۲ ۲؎ ایضاً ۳؎ ایضاً ۴؎ ایضاً ص۳ ۵؎ ایضاً ۶؎ ایضاً۔

فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ (کچھ حصہ چھوڑ کر) اصول فقہ میں حسامی اور توضیح وتلویح کا بڑا حصہ، منطق میں شرح شمسیہ مکمل، اور ایک حصہ شرح مطالع کا، علم کلام میں شرح عقائد مکمل، خیالی کے حاشیہ کے ایک حصہ کے ساتھ، کچھ حصہ شرح مواقف کا پڑھا، سلوک میں ایک حصہ عوارف اور رسائل نقشبندیہ وغیرہ کا، حقائق میں شرح رباعیات مولانا جامی اور لوائح، مقدمہ شرح اللمعات، مقدمہ نقد النصوص، خواص اسماء وآیات میں وہ مجموعہ جو خاص اس موضوع پر ہے، اور الفوائد المأة وغیرہ، والد صاحب نے کئی بار مجھے ان خواص وفوائد کی اجازت دی۔

طب میں موجز، فلسفہ میں شرح ہدایۃ الحکمۃ وغیرہ، معانی میں مطول کا بڑا حصہ، مختصر المعانی کا اتنا حصہ جس میں ملا زادہ کا حاشیہ ہے، ہندسہ اور حساب میں بعض مختصر رسائل۔

شاہ صاحب کے اس نصاب میں ان کے والد ماجد اور استاد حقیقی شاہ عبدالرحیم صاحب کے اجتہاد وانتخاب کو بھی کچھ دخل تھا، ساتویں صدی ہجری سے ہندوستان میں جو نصاب درس رائج تھا، اور جس میں نویں صدی ہجری کے آخر میں شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ کے ملتان سے دہلی آنے پر علم کلام و بلاغت و معقولات کی بعض کتابوں کا اضافہ ہوا، پھر دسویں صدی میں امیر فتح اللہ شیرازی کی آمد ہندوستان پر ایران کے علمائے متاخرین محقق دوانی، میر صدرالدین شیرازی، اور میر غیاث الدین منصور، اور مرزا جان کی تصنیفات داخل نصاب ہوئیں، غالباً شاہ عبدالرحیم صاحب کی حقیقت پسندی، اور اپنے ہونہار فرزند کی ذکاوت پر اعتماد کر کے ان میں سے کئی کتابوں کو (جن میں اکثر مکرر مضامین تھے) حذف کر دیا گیا، مثلاً نحو میں مصباح، لب الالباب (مصنفہ قاضی ناصرالدین بیضاوی) ارشاد (مصنفہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی) کے بجائے صرف کافیہ، اور شرح جامی پڑھائی گئی، اصول فقہ میں منار اور اس کے شروح، اور اصول بزدوی کے بجائے حسامی، اور توضیح وتلویح کا کچھ حصہ، تفسیر میں کشاف ترک کر دی گئی،

حدیث میں "مشارق الانوار" شامل نہیں ہے، ادب میں مقامات حریری کا عام رواج تھا اور بعض بزرگوں کے حفظ کرنے کا بھی ذکر آتا ہے، لیکن شاہ صاحب کے نصاب درس میں وہ نظر نہیں آتی، یہ ممکن ہے کہ ان میں سے بہت سی کتابیں بارہویں صدی کے اوائل تک بہت سے حلقہائے درس میں متروک ہو گئی ہوں۔

واضح رہے کہ بارہویں صدی ہجری ہی میں استاد العلماء ملا نظام الدین سہالوی فرنگی محلی نے جو حضرت شاہ صاحب کے کبیر السن معاصر تھے، اور جنہوں نے شاہ صاحب کی وفات سے پندرہ سال پہلے ۱۱۶۱ھ میں رحلت کی، اس نصاب درس میں بہت عظیم اضافہ کیا، خاص طور پر صرف و نحو، منطق و فلسفہ، ریاضی و بلاغت، اور علم کلام میں کثیر التعداد کتابوں کا اضافہ کیا، جن میں مزید اضافہ کے بعد (جو ان کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ کے دور میں بغیر کسی منصوبہ کے ہوا) اس نصاب نے درس نظامی کی وہ آخری شکل اختیار کی جو ابھی تک قدیم مدارس میں رائج ہے[1]۔

شاہ صاحب کے بیان کئے ہوئے نصاب درس میں ادب عربی کی کوئی کتاب نظر نہیں آتی، حالانکہ شاہ صاحب کی عربی تالیفات بالخصوص "حجۃ اللہ البالغہ" شہادت دیتی ہے کہ ان کو عربی زبان اور اس میں تحریر و انشاء پر نہ صرف قدرت تھی، بلکہ (جہاں تک حجۃ اللہ البالغہ کا تعلق ہے) وہ اس میں ایک ایسے طرز و اسلوب کے بانی ہیں، جو علمی مضامین و مقاصد کے شرح و بیان کے لئے موزوں ترین اسلوب ہے، اور جس میں علامہ ابن خلدون کے بعد ان کا کوئی

---

[1] نصاب درس کی عہد بعہد تبدیلیوں، معیار فضیلت کے بدلنے اور ایک ہی کتاب کے متعدد شروح و حواشی کے اضافہ اور ان کے اسباب و محرکات سے واقف ہونے کے لئے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" مطبوعہ المجمع العلمی دمشق، اور اردو میں ان کا پُر مغز اور محققانہ مضمون "ہندوستان کا نظام درس اور اس کے تغیرات" مطبوعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء ملاحظہ ہو۔

ہم پایہ اور ہمسر نظر نہیں آتا، معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے بطورِ خود عربی ادب اور نثر و نظم کی ان قدیم معیاری کتابوں کا مطالعہ کیا، جو سلاست و حلاوت کا نمونہ تھیں اور جو عجمی عربی کے اثرات سے بہت کچھ محفوظ تھیں، اور حجاز کے قیام میں خاص طور پر عربی میں اس عظیم تصنیفی کام کی تیاری کی جس کو تدبیر الٰہی نے شاہ صاحب کے لئے مخصوص کر رکھا تھا[1]، اگر مقامات حریری کا ذکر سہواً نہیں چھوٹ گیا ہے، تو اس کے شاہ صاحب کے نصاب میں داخل نہ ہونے سے بجائے نقصان کے فائدہ ہوا ہوگا کہ متاخرین عام طور پر اس کے زخم خوردہ ہیں، اور اس کی وجہ سے سجع و قوافی کے ایسے پابند کہ بے تکلفی اور روانی کے ساتھ مطالب عالیہ کے ادا کرنے اور اظہار ما فی الضمیر سے عام طور پر قاصر نظر آتے ہیں، حریری کے بعد جس نے بھی کسی مضمون پر قلم اٹھایا حریری ہی کے قلم سے لکھا جس کا قط پرانا ہو گیا تھا، رسائل و خطوط اور کتابوں کی تقریظیں حتی کہ فتاوے کی طویل عبارتیں بھی حریری کے اس اثر سے آزاد نہیں۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ طالب علمی ہی کے زمانہ میں مضامین عالیہ ذہن میں آتے تھے، جن میں برابر ترقی محسوس ہوتی تھی[2]، والد صاحب کی وفات کے بعد بارہ سال تک دینی کتب اور عقلی علوم کی کتابیں پڑھانے کی پابندی کی، اور ہر علم میں غور و خوض اور اشتغال کا موقع ملا۔

والد ماجد کی شفقت و تربیت اور اجازت و خلافت

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ والد صاحب کی شفقت میرے حال پر ایسی تھی کہ کم کسی

---

[1] صاحب "الیانع الجنی" لکھتے ہیں "وقد اقام بالحجاز سنین و زاھم العرب وسمع من اھل البادیة وھم یومئذ احسن حالا منھم فی زماننا" (حجاز میں کئی سال قیام فرمایا، عربوں سے اختلاط و صحبت رہی اور اہل بادیہ سے جو اس زمانہ کے مقابلہ میں بہتر تھے صحیح و فصیح زبان سنی) ص ۷۸ [2] الجزء اللطیف ص ۳

باپ کی بیٹے پر، کسی استاد کی شاگرد پر، اور کسی شیخ کی مرید پر ہوگی،[1] حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کی تربیت کا انداز بھی بڑا حکیمانہ تھا، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ایک روز زمانۂ طفولیت میں احباب واعزہ کی ایک جماعت کے ساتھ ایک باغ کی سیر کو چلا گیا جب واپس آیا تو والد صاحبؒ نے فرمایا، ولی اللہ! تم نے اس دن رات میں وہ کیا حاصل کیا جو باقی رہے؟ ہم نے اس مدت میں اتنا درود پڑھا، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں، یہ سن کر میرا دل باغات کی سیر و تفریح سے بالکل سرد ہو گیا، اس کے بعد پھر اس کا شوق نہیں پیدا ہوا[2]، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ والد صاحبؒ مجھے حکمت عملی، آداب مجلس اور تہذیب و دانش مندی کی باتیں بہت سکھاتے تھے، اور اکثر یہ شعر پڑھتے ؎

آسائشِ دوگیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا[3]

فرماتے تھے کہ مجھے ہدایت فرمائی کہ جو لوگ مرتبہ میں کم ہوں ان سے ہمیشہ سلام میں سبقت کرنا، اور ان سے ہمیشہ خوش اخلاقی سے پیش آنا، اور ان کی خیریت و احوال دریافت کرنا، اور اس کو معمولی بات نہ سمجھنا ؎

صد ملکِ دل بہ نیم نگہ می تواں خرید
خوباں دریں معاملہ تقصیر می کنند

یہ بھی فرماتے تھے کہ بعض لوگ کسی خاص پوشاک یا عادت کے پابند ہو جاتے ہیں، کوئی تکیہ کلام مقرر کر لیتے ہیں، بعض کھانوں سے ایسے متنفر ہو جاتے ہیں کہ ان کی وہ چڑھ مقرر ہو جاتی ہے، ان سب چیزوں سے پرہیز کرنا چاہیے، اپنی کسی خواہش کی تکمیل میں

---

[1] الجزء اللطیف ص۳   [2] انفاس العارفین ص۶۳   [3] ایضاً ص۸۳

صرف لذّت جوئی مقصود نہ ہو، اس میں کسی ضرورت کی تکمیل، کسی فضیلت کا حصول، یا ادائے سنت مقصود ہونی چاہئے، چال ڈھال، نشست و برخاست کسی سے ضعف یا کسل مندی کا اظہار نہیں ہونا چاہئے، شاہ عبدالرحیم صاحبؒ شاہ صاحب کے بیان کے مطابق شجاعت، فراست، خوش انتظامی اور غیرت کے اوصاف عالیہ سے متّصف تھے، عقل معاش بھی عقل معاد کی طرح کامل و وافر رکھتے تھے، ہر معاملہ میں اعتدال کو پسند کرتے تھے، شاہ صاحب کی سیرت و اخلاق میں انھیں چیزوں کا پرتو تھا۔[1]

والد صاحب ہی سے چودہ[۱۴] سال کی عمر میں بیعت کی اور اشغال صوفیہ بالخصوص مشائخ نقشبندیہ کے اشغال میں مشغول ہوئے، توجہ اور تلقین حاصل کی، والد صاحب نے آداب طریقت کا ایک حصہ تعلیم کیا، اور خرقہ پہنایا[2]، شاہ صاحب کی عمر سترہ[۱۷] سال کی تھی، کہ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ نے اس دنیا سے رحلت فرمائی، آپ نے مرض موت میں بیعت و ارشاد کی اجازت دی، اور بار بار فرمایا کہ یدہ کیدی (اس کا ہاتھ میرے ہاتھ کی طرح ہے[3])

شادی

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی عمر چودہ[۱۴] سال کی تھی کہ آپ کے والد ماجد نے آپ کی شادی آپ کے ماموں شیخ عبید اللہ صدیقی پھلتی کی صاحبزادی سے کردی، سسرال والوں نے جب مہلت کا تقاضا کیا تو شاہ عبدالرحیم صاحب نے معذرت کی اور کہا کہ اسی میں مصلحت ہے، بعد کے پے در پے خاندانی حوادث نے ثابت کر دیا کہ اگر اس زمانہ میں شادی نہ ہو جاتی تو اس کو

---

[1] انفاس العارفین ص۲۰۳ [2] الجزء اللطیف ص۲ [3] ایضاً ص۳

بہت دنوں کے لئے ملتوی کرنا پڑتا[1]۔ ان زوجہ سے آپ کے بڑے صاحبزادہ شیخ محمد پیدا ہوئے، جنھوں نے آپ ہی سے تعلیم پائی، شاہ صاحب نے ان کے لئے ایک ابتدائی رسالہ بھی تصنیف فرمایا تھا، شمائل ترمذی کے درس میں شاہ عبدالعزیزؒ کے شریک اور قاری تھے[2]، شاہ صاحب کی وفات کے بعد قصبہ بڑھانہ منتقل ہو گئے، اور مدۃ العمر وہیں رہ کر ١٢٠٨ھ میں وفات پائی اور قصبہ کی جامع مسجد کے صحن میں مدفون ہوئے[3]، اسی بناء پر شاہ صاحب ابو محمد کنیت کرتے تھے[4]، شیخ محمد کے دو صاحبزادوں کا تذکرہ جو ان کے ساتھ ہی مدفون ہیں، مقالات طریقت میں آتا ہے، لیکن کتابوں میں ان کو منقطع العقب لکھا ہے، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے حضرت شاہ ابو سعید حسنی "رائے بریلوی کے نام تین خطوط میں برادر بزرگ شیخ محمد بن شاہ ولی اللہ صاحب" کا سلام لکھا ہے، ان میں کہیں "برادر صاحب بزرگ شیخ محمد صاحب" اور کسی خط میں "الشیخ الکبیر محمد" کے نام سے سلام لکھا ہے، ان خطوط سے بھائیوں کی باہمی مودّت و تعلق کا بھی اندازہ ہوتا ہے[5]۔

دوسرا عقد

شاہ صاحب کا دوسرا عقد پہلی اہلیہ کی وفات کے بعد سید ثناء اللہ سونی پتی کی

---

[1] شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ چند ہی دنوں کے بعد میری ہونے والی خوشدامن نے انتقال کیا، تھوڑے ہی دنوں کے بعد ان کی نانی نے پھر میرے چچازاد بھائی شاہ فخر العالم نے پھر میری پہلی والدہ (برادر صلاح الدین کی ماں) نے انتقال کیا۔ [2] نزہۃ الخواطر ج ٦ [3] ایضاً [4] الارشاد فی مہات الاسناد

[5] مکتوب المعارف (قلمی) ص ١٦-١٧-١٨

صاحبزادی بی بی ارادت سے ہوا جو سونی پت کے رہنے والے تھے اور سید ناصر الدین شہید سونی پتی[1] کی اولاد میں تھے، ان زوجہ محترمہ سے آپ کے چاروں نامور صاحبزادے (حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالقادرؒ و شاہ عبدالغنیؒ) تولد ہوئے، جو ہندوستان میں

---

[1] سید ناصر الدین شہید کا تذکرہ کتاب قصر عارفان تالیف مولوی احمد علی خیرآبادی میں (جو ڈاکٹر محمد باقر کے اہتمام میں ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی ہے) ص ۲۸۱-۲۹۰ میں ملتا ہے، مصنف نے ان کو امام باقر بن امام زین العابدینؒ کا فرزند اور امام جعفر صادق کا بھائی لکھا ہے، مصنف نے ان کا سفر شہر واسط سے خراسان اور خراسان سے غزنی پھر غزنی سے چھیاسٹھ[۶۶] سواروں کے ساتھ (جن کے مصنف نے نام بھی دیئے ہیں) قنوج کی طرف رخ کرنے کا حال لکھا ہے، مصنف کے بیان کے مطابق سنہ ۴۲۶ھ میں ان کا سونی پت میں ورود ہوا، یہ سلطان شہاب الدین غوری کا زمانہ اور امیر الممالک نصیر الدین کی حکومت کا دور تھا، حاکم دیار ارجن دیو نے عربی گھوڑوں کی خریداری کی پیش کش کی جس کو امام نے قبول نہیں کیا، بعد میں گفتگو نے طول کھینچا اور جنگ کی نوبت آئی، امام کے رفقاء نے ارجن دیو کو شکست دی لیکن اس کے بھائی ہرہر دیو کے مقابلہ میں ۱۲ محرم سنہ ۴۲۶ھ میں امام عالی مقام نے اپنے رفقاء جاں نثار کے ساتھ جام شہادت نوش فرمایا۔

یہ بیان اور سنہ ۴۲۶ھ میں خاندان اہل بیت کے کسی فرد جلیل کا شمالی ہند کے مقام سونی پت تک پہونچنا اور شہادت حاصل کرنا روایت اور تاریخی مسلمات کے خلاف ہے کہ مسلمان حوصلہ مندوں اور غازیوں کی رسائی اس وقت تک سندھ و ملتان کے آگے نہیں تھی نہ اس وقت تک اسلامی حکومت سندھ و ملتان سے آگے بڑھنے پائی تھی، منصورہ تیسری صدی کے آخر اور چوتھی صدی کی ابتدا میں اسلامی سلطنت کا مرکز بنا، خود محمود غزنوی سنہ ۳۸۸ھ میں اورنگ نشین ہوا، اس کا پہلا حملہ ہندوستان سنہ ۳۹۱ھ میں ہوا، جہاں تک شہاب الدین محمد غوری کا تعلق ہے جس کے عہد میں امام ناصر الدین کی مہم بتائی جاتی ہے اس نے سنہ ۵۷۲ھ میں پہلی مرتبہ ہندوستان کا رخ کیا، اور سنہ ۵۸۸ھ میں پرتھوی راج کو مکمل شکست دے کر ہندوستان میں مستقل حکومت قائم کی، مزید یہ کہ امام محمد باقر کے صاحبزادوں میں کسی کا نام کتب انساب میں امام ناصر الدین نہیں ملتا، بعض مرتبین شجرہ نے ان کو امام کی بائیسویں[۲۲] پشت میں دکھایا ہے، اس لئے مصنف "قصر عارفان" کا بیان واقعات و مسلمات

(باقی ص ۱۰۷ پر)

دین کی نشأۃ ثانیہ کے "ارکان اربعہ" ہیں رحمہم اللہ تعالیٰ، اور ایک صاحبزادی امۃ العزیز بھی پیدا ہوئیں، ان کا عقد مولوی محمد فائق ابن مولانا محمد عاشق پھلتی سے ہوا، وہ صاحب اولاد تھیں، ان کا سلسلہ جاری رہا۔

سفر حج

شاہ صاحبؒ کی علمی، فکری اور دعوتی و تجدیدی زندگی میں حجاز مقدس کا سفر اور قیام ایک تاریخ ساز واقعہ اور ان کی کتاب زندگی کا ایک نیا باب اور حد فاصل ہے، حجاز کے اسی طویل قیام میں جو ایک سال سے زیادہ رہا، ان کے ملکات ذہنی و علمی نے ارتقاء کے وہ منازل طے کئے جو بظاہر ہندوستان میں ممکن نہ تھے، اور اس کے لئے حرمین ہی جیسی مرکزی و عالمی جگہ درکار تھی، اسی سفر میں انھوں نے علم حدیث کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا، اور اس کے شیوخ کاملین سے جو دیار و امصار سے وہاں جمع ہوئے تھے، اس فن شریف کی تکمیل کی، جو ان کی تجدید و اصلاح کے ایوان بلند میں حجر الزاویہ (کونہ کے پتھر) کی حیثیت رکھتا ہے، اور جس سے وہ تحقیق و اجتہاد کے اس مقام پر پہونچے جس پر ان آخری صدیوں میں کم لوگ (اور جہاں تک مقاصد و اسرار شریعت اور تطبیق بین الفقہ والحدیث کا تعلق ہے) کئی صدیوں سے کوئی نہیں پہونچا تھا۔

(باقی ص۱۰۶ کا) کے خلاف اور مشہور تاریخ سے کھلا تضاد رکھتا ہے، اور قابل اعتبار نہیں، البتہ امام ناصر الدین کی شہادت (جس کے سنہ کا تعین مشکل ہے) ایک تاریخی حقیقت ہے، جو تواتر کے ساتھ اس جوار میں چلی آرہی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے خاندان کی اس خاندان والا شان سے قرابتیں قدیم سے چلی آرہی تھیں اور آپ کی دوسری شادی جیسا کہ اوپر گذرا اسی خاندان میں ہوئی۔

سفرِ حج کے وقت شاہ صاحبؒ کی عمر تیس (۳۰) سال تھی[۱]، اس وقت کے سیاسی حالات، راستوں کے امن وامان کی کیفیت، بعض غیر ملکی طاقتوں کے تسلط، بری اور بحری خطرات اور قزاقی کے پیش نظر یہ سفر ان کی عالی ہمتی، شوق علم اور حرمین شریفین سے قلبی وابستگی کی روشن دلیل ہے، نیز ان کی حمیتِ اسلامی، دور بینی وبلند نگاہی پر بھی دلالت کرتا ہے کہ ہندوستان میں حفاظت دین اور ملت اسلامیہ ہندیہ کے عروج واستقلال کے لئے ان کی نگاہ ہندوستان ہی کے حالات کے مطالعہ اور وہیں اس کی تدبیر وعلاج کی تلاش میں محدود نہیں تھی، وہ قرآن مجید کے اشارۂ بلیغ "لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ"[۲] پر عمل کر کے عالم اسلام کے اس قلب ومرکز اور دنیا کے گوشہ گوشہ سے آئے ہوئے وفود الاسلام وضیوف الرحمٰن کے علوم ومعارف، عقول واذہان اور تجربات ومساعی سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔

اس وقت سورت ہندوستان کی بندرگاہ اور بابِ مکہ تھا، راستہ کے مقامات بالخصوص مالوہ وگجرات مرہٹوں کی غارت گری اور استحصال کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے، شمالی ہند سے جنوبی ہند تک کے اس طویل راستہ کو اس وقت کی سواریوں، بہلیوں اور اونٹ گاڑیوں سے طے کرنا آسان نہ تھا[۳]، بحرِ ہند اور بحرِ احمر کے تمام سواحل، پرتگیزی ولندیزی (ڈچ) قزاقوں اور

---

[۱] "القول الجلی" سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے اس سفر حج سے پہلے جو مکمل ہوا، ایک مرتبہ بیس (۲۰) سال کی عمر میں اچانک سفر کا ارادہ اور ہجرت کا عزم فرمایا تھا، اور تقریباً طور پر بے زاد وراحلہ کوچ فرمایا، جب ساحل سمندر پر پہونچے تو معلوم ہوا کہ جہاز روانہ ہو چکے ہیں، اب کوئی جہاز باقی نہیں، بمجبوراً شہر کھمبات میں قیام فرمایا، ایک مرتبہ مراقبہ میں ایک ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ دل سفر سے سرد ہو گیا، اور واپسی کا فیصلہ فرمایا، اس میں کچھ بارگاہ رسالت پناہ کا اشارہ بھی شامل تھا۔ (القول الجلی نسخۂ مخطوطہ خانقاہ کاظمیہ قلندریہ، کاکوری) [۲] الحج۔ ۲۸

[۳] شاہ عبدالعزیز صاحب کے ملفوظات سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب اس سفر میں راجپوتانہ سے بھی گذرے تھے۔ ص ۴۳

فرنچ وانگریز، ملک گیروں کے بحری حملوں کے خطرہ سے محفوظ نہ تھے، حجاج کی ان مصیبتوں اور حوادث کی تفصیل اس وقت کے سفرناموں میں (جو بہت کم مرتب و محفوظ رہ سکے ہیں) دیکھی جاسکتی ہے، خود ہندوستان کے راستہ کا حال یہ تھا کہ رات کو اگر کوئی ساتھی کسی گاؤں یا آبادی میں چھوٹ جاتا تھا تو شاہ صاحب یا بدیع العجائب یا بدیع العجائب کا وظیفہ شروع کردیتے تھے۔

سورت سے جدہ پینتالیس (۴۵) روز میں پہونچنا ہوا، ۱۵؍ ذیقعدہ کو داخل مکہ معظمہ ہوئے، علماء اور طلبہ کی درخواست پر مسجد حرام میں مصلے حنفی کے پاس درس شروع کیا، جس میں بہت ہجوم ہوا۔[1]

شاہ صاحب "الجزء اللطیف" میں لکھتے ہیں کہ ۱۱۴۳ھ میں حرمین شریفین کی زیارت کے شوق کا غلبہ ہوا، ۱۱۴۳ھ کے آخر (ذی الحجہ) میں حج سے مشرف ہوا، ۱۱۴۴ھ تک بیت اللہ کی مجاورت کی، اور زیارت مدینہ سے مشرف ہوا، شیخ ابو طاہر مدنی اور دوسرے مشائخ حرمین سے حدیث کی روایت کی، علمائے حرمین سے مجالس رہیں، شیخ ابو طاہر مدنی نے خرقہ پہنایا، جو غالباً صوفیہ کے تمام خرقوں کا جامع ہے، اس سال ۱۱۴۴ھ کے اختتام پر دوبارہ مناسک حج ادا کئے، اور ۱۱۴۵ھ کے اوائل میں ہندوستان روانہ ہوا، اور ۱۰؍ رجب ۱۱۴۵ھ کو جمعہ کے دن صحت وسلامتی کے ساتھ اپنے مستقر (دہلی) پر پہونچا۔[2]

شاہ صاحب کے مشائخ و اساتذۂ حرمین

شاہ صاحب نے مشائخ و اساتذۂ حرمین کے تعارف اور تذکرہ میں مستقل رسالہ "انسان العین فی مشائخ الحرمین" تصنیف فرمایا، اس رسالہ میں اپنے شیخ خاص اور اپنے محسن و محبوب استاد شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم الکردی المدنی کا قدرے تفصیل سے تعارف کرایا، چونکہ

---

[1] القول الجلی (قلمی) [2] الجزء اللطیف ص ۵

خصوصی اساتذہ ومشائخ کی عالی استعداد تلامذہ پر گہری چھاپ ہوتی ہے اور ان کے رجحانات وتحقیقات کا ان شاگردانِ رشید پر انقلاب انگیز اثر ہوتا ہے اس لئے ان کا قدرے تفصیل ہی کے ساتھ تذکرہ مناسب ہے۔

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم نے اپنے والد شیخ ابراہیم الکردی سے علم الحدیث کی تحصیل کی، اس کے بعد شیخ حسن عجیمی[۱] سے زیادہ تر استفادہ کیا، اس کے بعد احمد نخلی، شیخ عبداللہ بصری سے شمائل نبویؐ، اور مسند امام احمد دو مہینے سے کم میں پڑھی، حرمین میں آنے والے علماء سے استفادہ کرتے رہے، شیخ عبداللہ لاہوری سے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی کتابوں کی روایت کی اجازت پائی، شیخ سعید کوکنی سے بعض کتب عربیہ اور فتح الباری کا ایک ربع پڑھا[۲]۔

"الیانع الجنی" میں علامہ محسن بن یحییٰ ترہتی نے لکھا ہے کہ شیخ ابوطاہر کہا کرتے تھے کہ شیخ ولی اللہ مجھ سے لفظ کی سند لیتے ہیں، اور میں ان سے حدیث کے مطالب میں استفادہ کرتا ہوں، اپنی اجازت میں بھی ایسا ہی لکھا ہے[۳]۔

شیخ ابوطاہر (محدث کبیر ہونے کے باوجود) صوفیہ کے بڑے معتقد، اور ان پر تنقید کرنے سے محترز تھے، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں شیخ ابوطاہر سے رخصت ہونے گیا تو انھوں نے یہ شعر پڑھا ؎

نسیتُ کل طریقٍ کنت أعرفہ ۔۔۔۔ إلّا طریقاً یؤدّیني لربعکم

(میں چلنے کا ہر راستہ بھول گیا سوائے اس راستہ کے جو آپ کے گھر تک پہونچاتا ہے)

---

[۱] شاہ صاحب نے "انسان العین" میں ان کا لقب عجیمی لکھا ہے، جو غالباً طباعت کی غلطی ہے، تذکرہ کی عام کتابوں میں ان کو العجیمی (تصغیر کے ساتھ) یاد کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو زرکلی کی الاعلام جلد ۲ صفحہ ۲۲۵) [۲] انسان العین صفحہ ۱۳

[۳] الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبدالغنی، مجموعہ کشف الاستار عن رجال معانی الآثار، برحاشیہ، مطبوعہ دارالاشاعت والتدریس، دیوبند

یہی جواب شاہ صاحب کا بھی تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ میرے والد صاحب جب مدینہ طیبہ سے رخصت ہونے لگے تو استاد محترم سے عرض کیا اور وہ یہ سن کر خوش ہوئے کہ میں نے جو کچھ پڑھا تھا سب بھلا دیا سوائے علم دین وحدیث کے[1]۔

شاہ صاحبؒ کی بعد کی زندگی اور مشاغل نے (جس کی تفصیل آئندہ اوراق میں آئیگی) اس کی تصدیق کردی کہ انھوں نے جو کچھ کہا تھا اس کو کرکے دکھا دیا "مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ" (سورۃ الاحزاب ۲۳)

رمضان ۱۱۴۵ھ میں شیخ ابو طاہر نے اس دار فانی سے رحلت فرمائی، گویا شاہ صاحبؒ کی مدینہ طیبہ سے روانگی کے کچھ عرصہ اور ان کے دہلی پہونچنے کے ڈیڑھ دو مہینے بعد[2] ان کی وفات ہوئی، اور شاہ صاحب کی آمد ہندستان کے بعد ان کو افادہ و تربیت کا بہت مختصر وقت ملا "وَذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ"

ان کے تذکرہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان کے والد شیخ ابراہیم کورانی[3] امام ابن تیمیہؒ کی طرف سے مدافعت کیا کرتے تھے، علامہ سید نعمان خیر الدین آلوسی بغدادی اپنی مشہور کتاب "جلاء العینین فی محاکمۃ الاحمدین" میں لکھتے ہیں:۔

وکان سلفی العقیدۃ ذابًّا عن	وہ سلفی العقیدہ تھے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ
شیخ الاسلام ابن تیمیۃ وکذا	کی طرف سے مدافعت کرتے تھے،
یذب عما وقع فی کلمات	اسی طرح سے ان صوفیہ کے ان الفاظ
الصوفیۃ مما ظاھرہ الحلول	کی تاویل کرتے تھے جن سے ظاہری طور پر

---

[1] ملفوظات حضرت شاہ عبدالعزیز ص۹۳ [2] انسان العین ص۱۴

[3] ولادت ۱۰۲۵ھ وفات ۱۱۰۱ھ شیخ ابراہیم اسّی سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔

او الاتحاد أو العينية۔[1] حلول واتحاد یا عینیت کا اظہار ہوتا تھا۔

اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ شیخ الاسلام کی کتابوں سے تعارف ان کی حمایت و مدافعت کا جو اظہار شاہ صاحب کی تحریروں سے ہوا نیز اس تطبیقی رجحان میں جو شاہ صاحب کی خاندانی روایت و وراثت تھی، شیخ ابو طاہر کی گفتگو کا بھی اثر اور حصہ ہوگا جس کا رجحان انھوں نے اپنے والد ماجد شیخ ابراہیم کورانی سے وراثتاً پایا ہوگا۔

شاہ صاحب کے دوسرے شیخ جن سے شاہ صاحب کو اجازت حاصل ہوئی شیخ تاج الدین قلعی حنفی مفتی مکہ تھے، حدیث میں ان کی اکثر تعلیم شیخ عبداللہ بن سالم مصری سے ہوئی، صحیحین شیخ عجیمی سے پڑھی، اور ان سے اجازت مطلقہ حاصل ہوئی، ان کو شیخ احمد نخلی وغیرہ سے بھی اجازت ہے، شاہ صاحب نے تین روز ان کے درس بخاری میں شرکت کی، کتب ستہ کے اطراف اور مؤطا کا ایک حصہ، مسند دارمی، امام محمد کی کتاب الآثار اور مؤطا ان سے سنی، شیخ نے ان سب کتابوں کی اہل مجلس کو اجازت دی، شاہ صاحب بھی شریک تھے، شاہ صاحب نے حدیث مسلسل بالاولیۃ بھی ان سے سنی۔[2]

شاہ صاحب نے حافظ حدیث اور جامع کمالات شیخ محمد بن محمد بن سلیمان المغربی کے (جو نسخۂ بتونیہ کے مالک تھے اور اس کو استنبول سے حرمین میں لائے تھے، اور جمہور اہل حرمین کے استاد تھے) صاحبزادہ شیخ محمد وفد اللہ سے بھی اپنے والد کی تمام مرویات کی اجازت حاصل کی، اس کے علاوہ مؤطا یحییٰ بن یحییٰ کا ملا ان سے پڑھی اور اس کی اجازت لی۔[3]

---

[1] جلاء العینین مطبوعہ مطبعۃ المدنی، مصر ص۱۳ [2] انسان العین ص۱۵-۱۶ [3] ایضاً ص۷

شاہ صاحب زمانہ تعلیم ہندوستان میں اپنے زمانہ کے امام حدیث شیخ محمد فضل سیالکوٹی کے درس میں بھی شریک ہوئے تھے[1] جنھوں نے حدیث کی سند شیخ سالم بن عبداللہ بصری سے حاصل کی تھی، اور ان سے حدیث پڑھی تھی، وہ شیخ عبدالاحد ابن خواجہ محمد سعید سرہندی کے بھی شاگرد تھے، غازی الدین خاں کے مدرسہ میں دہلی میں حدیث کا درس دیتے تھے، حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ نے حدیث و سلوک دونوں میں ان سے استفادہ کیا۔[2]

اس سفر میں آپ کے ماموں شیخ عبیداللہ بارہوی اور ماموں زاد بھائی شیخ محمد عاشق پھلتی (مصنف القول الجلی) بھی ساتھ تھے، شاہ صاحب نے اپنی والدہ ماجدہ کی خبر وفات اسی سفر حج میں واپسی پر مکہ معظمہ میں سنی۔[3]

شاہ صاحب کے لئے فن حدیث کے خصوصی ذوق، حرمین میں اس کی تدریس واشاعت کے آسان مواقع اور وہاں بیٹھ کر مختلف ممالک سے آنے والے طالبین علم اور علماء کو مستفید کرنے کا امکان، پھر مجاورت بیت، اور جوار نبویؐ کی برکت و سعادت اور ہندوستان کے غیر یقینی حالات، سلطنت اسلام کے اکھڑتے ہوئے قدم، اور غیر ملکی طاقتوں کے روز افزوں تسلط کا علم، حجاز میں مستقل قیام و ہجرت کی نیت کے قوی اسباب و محرکات تھے، اور نہ صرف اس کے جواز کے دلائل بلکہ دینی و علمی مصالح کی تائید بھی فراہم کرتے تھے، لیکن آپ نے ہندوستان کی واپسی کا وہ فیصلہ کیا جس میں اللہ تعالیٰ نے وہ خیر مقدر فرما رکھی تھی، جس کا آپ کے تجدیدی و اجتہادی کارنامہ میں ظہور ہوا، اور اس بشارت نبویؐ کا تحقق جو آپ کو مدینہ طیبہ کے قیام میں حاصل ہوئی تھی۔

إِنَّ مرادَ الحقِّ فيكَ أن يجمع — خدا کا ارادہ ہو چکا ہے کہ تمہارے

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۶ [2] ایضاً [3] القول الجلی (قلمی)

شملا من شمل الأمة المرحومة به[1]	ذریعہ امت مرحومہ کی ایک خاص شیرازہ بندی ہو۔

شاہ صاحب کے نہ صرف اپنے بارے میں، بلکہ اپنے خواص اصحاب کے بارے میں بھی رجحان یہی تھا کہ وہ ہندوستان کو اپنی سرگرمیوں اور علمی و دینی خدمات کا مرکز بنائیں، جس ملک پر ان کے اسلاف نے اپنی بہترین علمی و دینی صلاحیتیں اور توانائیاں صرف کیں؛ اور جس نے ہر دور میں محقق و عارف پیدا کئے، اور اس کو مستقبل میں علم حدیث، اور دوسرے علوم دینیہ کا مرکز بننا تھا، آپ کے ایک تلمیذ خاص مخدوم معین الدین سندھی نے حجاز جاکر جب وہیں رہ جانے کا ارادہ ظاہر کیا، تو شاہ صاحب نے ان کو اس سے منع کیا اور لکھا:۔

أما عزمك ترك الرجوع إلى الوطن فلا تستبد وابه حتى يشرح الله صدركم أو صدر رجل أجلكم[2]	جہاں تک وطن کی طرف مراجعت نہ کرنے کے ارادہ کا تعلق ہے تو ابھی اس بارے میں قطعی فیصلہ اور اس پر اصرار نہ کیجیے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ آپ کا یا آپ کے کسی خاص تعلق والے کا شرح صدر نہ فرمادے۔

شاہ صاحب کا درس حدیث

شاہ صاحب نے حجاز سے واپس آنے کے بعد اپنے والد صاحب کے مدرسہ رحیمیہ میں

---

[1] فیوض الحرمین، مطبع احمدی، دہلی ص ۶۳ [2] حیات ولی (مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ صاحب، المکتوب العاشر) ص ۵۳۶ مطبوعہ [illegible] لاہور۔

جو اس وقت پرانی دلّی میں اس محلہ میں جو اب مہندیاں کہلاتا ہے، واقع تھا، درس شروع کردیا لیکن چند ہی دنوں میں اطراف واکناف سے طلبا کھنچ کھنچ کر پہونچنے لگے، اس وقت یہ جگہ ناکافی ثابت ہوئی، اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت (بہت سی بے توفیقیوں اور کمزوریوں کے ساتھ) محمد شاہ بادشاہ کے مقدر میں رکھی تھی، اس لئے شاہ صاحب کو شہر میں ایک عالی شان مکان دے کر شہر میں بلالیا اور آپ نے وہاں درس شروع کردیا۔[1] مولوی بشیر الدین لکھتے ہیں:۔

"یہ مدرسہ [illegible] مانہ میں نہایت عالی شان اور خوبصورت تھا اور بڑا دار العلوم سمجھا جاتا تھا، غدر تک وہ اپنی اصلی حالت پر قائم تھا، غدر میں مکانات لوٹ لئے گئے، کڑی تختے تک لوگ اٹھا لے گئے۔"

مولوی صاحب مزید لکھتے ہیں:۔

"اب متفرق لوگوں کے مکانات اس جگہ بن گئے ہیں، مگر محلہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسہ کے نام سے آج تک پکارا جاتا ہے۔"

شاہ عبدالعزیز صاحب کے ملفوظات میں ایک جگہ اس مدرسہ کی مسجد کا تذکرہ ہے، شاہ صاحب نے فرمایا:۔

درآں ہنگام بندگان بسیار از اولیاء	(میری ولادت کے وقت) بہت سے
بسیار از یاران والد ماجد مثل شاہ	بزرگ و اولیاء جو والد ماجد کے احباب
محمد عاشق و مولوی نور محمد وغیرہ معتکف	وخواص میں سے تھے مثلاً شاہ محمد عاشق
مسجد ہذا می بودند۔[2]	و مولوی نور محمد وغیرہ اس مسجد میں معتکف ہوا کرتے تھے۔

---

[1] "دار الحکومت دہلی" جلد ۲ صفحہ ۲۸۶ مؤلفہ مولوی بشیر الدین۔

[2] ملفوظات شاہ عبدالعزیز صاحب (فارسی) صفحہ ۱۰۱ مطبع مجتبائی، میرٹھ

مولانا حکیم سید عبد الحی صاحب مصنف "نزہۃ الخواطر" نے ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء میں دہلی اور اس کے اطراف کا سفر کیا تھا، ۲۶ رجب کے روزنامچہ میں تحریر فرماتے ہیں:-

"میاں سید نذیر حسین صاحب کے درس سے آنے کے بعد میں نے ارادہ کیا کہ حضرت مولانا و مولیٰ الکل، مقتدائے اربابِ تمیز شاہ عبد العزیز صاحب روّح اللہ روحہ کے مدرسہ کی زیارت کروں جس میں ہمارے بزرگوں نے کیے بعد دیگرے استفادہ کیا ہے اور جس کی خاکروبی کو فخر و سعادت سمجھا ہے[1] یہاں سے جامع مسجد اور اس کے آگے چتلی قبر تک گیا، چتلی قبر سے دو راستے ہیں، ایک داہنے ہاتھ کو وہ سید صاحب خانقاہ کو گیا ہے[2]، دوسرا بائیں ہاتھ کو اس راستہ پر بہت دور تک چلا گیا، آگے بڑھ کر بائیں ہاتھ کو کوچۂ فولاد خاں کو سڑک گئی ہے، وہ سیدھی کلاں محل تک چلی گئی ہے، کلاں محل میں ہمارے شیخ المشائخ مولانا و مقتدانا رحمہ اللہ تعالیٰ کا مدرسہ ہے، اس کی حالت کو دیکھ کر "خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا، قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا"[3] کی آیت یاد آئی، اللہ اللہ کیا کارخانۂ قدرت کی نیرنگیاں ہیں، ایک وہ دن تھا کہ عرب و عجم کے لوگ اس مدرسہ میں رہتے تھے، اور فائدہ حاصل کرتے تھے، اور آج اس کی یہ حالت ہے کہ ویران اور خراب پڑا ہے، کوئی رہنے والا نہیں[4]"۔

پھر اسی خاندان کی ایک یادگار مولوی سید ظہیر الدین احمد صاحب کی روایت سے نقل کیا ہے کہ

---

[1] اس جگہ مولانا نے اپنے خاندان حسنی قطبی کے متعدد بزرگوں کے نام لکھے ہیں، جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے وقت سے حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے وقت تک یہاں آتے اور استفادہ کرتے رہے۔

[2] اس سے مراد حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ کی خانقاہ ہے، اس محلہ کو اب شاہ ابو الخیر مارگ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

[3] البقرہ - ۲۵۹ [4] "دہلی اور اس کے اطراف" مطبوعہ انجمن ترقی اردو صفحہ ۶۳-۶۴

مہندیوں میں جہاں ان حضرات کے مزار ہیں، وہاں مدرسہ بھی تھا، شاہ عبد الرحیم صاحبؒ کے بعد شاہ ولی اللہ صاحبؒ نئے شہر میں تشریف لائے یہ مدرسہ ان کو دیا گیا اور وہ یہیں رہ پڑے[1]۔

حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ کی زبانی حضرت شاہ صاحبؒ کے بعض خصائص و معمولات

افسوس ہے کہ کوئی معاصر تذکرہ، سفرنامہ یا روزنامچہ ایسا سامنے نہیں ہے جس سے شاہ صاحبؒ کے خصائص، معمولات، نظام الاوقات اور نشست و برخاست کے حالات تفصیل سے معلوم ہوں، ملفوظات حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ[2] (فارسی) میں کہیں کہیں کچھ اشارے آئے ہیں۔

فرمایا کہ میں نے اپنے والد ماجد کا جیسا قوی الحفظ نہیں دیکھا، سننے کا انکار تو نہیں کر سکتا، لیکن مشاہدہ میں نہیں آیا[3]، علوم و کمالات کے ماسوا ضبط اوقات میں بھی اپنی مثال نہیں رکھتے تھے، اشراق کے بعد جو نشست رکھتے تو دوپہر تک نہ زانو بدلتے نہ کھجاتے نہ تھوکتے[4]، ہر فن میں ایک ایک آدمی کو تیار کر دیا تھا، اس فن کے طالب کو اسی کے سپرد فرما دیتے، اور خود بیان حقائق و معارف اور ان کی تدوین و تحریر میں مصروف رہتے، حدیث کا مطالعہ اور درس فرماتے تھے، جس چیز کا کشف ہوتا تھا اس کو لکھ لیتے تھے، بیمار بہت کم ہوتے تھے[5]، جد بزرگوار اور عم محترم (جو طبیب بھی تھے) لوگوں کا علاج کرتے تھے، والد صاحبؒ نے اس شغل کو موقوف کیا، البتہ طب کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے[6]، طبیعت میں بچپن سے نظافت و لطافت تھی، اشعار صوفیانہ کم پڑھتے، کبھی کبھی ضرور کوئی شعر پڑھتے[7]۔

---

[1] "دہلی اور اس کے اطراف" مطبوعہ انجمن ترقی اردو ص ۷۶ [2] کتاب کے طابع و ناشر محمد بشیر الدین صدیقی صاحب کو جامع ملفوظات کا مسودہ کی بوسیدگی و کرم خوردگی کی وجہ سے نام نہیں معلوم ہو سکا، لیکن کتاب میں ایسی داخلی شہادتیں موجود ہیں کہ ان ملفوظات کی نسبت میں کسی شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ [3] ملفوظات ص ۱۱

[4] ایضاً ص ۲۳ [5] ایضاً ص ۲۰ [6] ایضاً ص ۲۱ [7] ایضاً ص ۲۰

وفات

بالآخر اس بیش قیمت و بابرکت مدت حیات کے جس کا ایک ایک لمحہ قیمتی، اسلام اور مسلمانوں کے لئے مفید، اور احیاء سنت، قرآن و حدیث کی نشر و اشاعت تعلیم و تربیت، یاد الٰہی اور اعلاء کلمۃ اللہ کی فکر میں مصروف تھا، خاتمہ بالخیر کا دن آگیا، جس سے "کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ"[۱] کے اعلان و وعدہ کے مطابق نہ کوئی نبی مستثنیٰ ہے، نہ کوئی ولی، نہ مجدد نہ مجاہد، ۱۱۷۶ھ شروع ہوا تھا، محرم کی آخری تاریخ تھی کہ یوم موعود آپہونچا، اور حضرت شاہ صاحبؒ نے مختصر علالت کے بعد باسٹھ[۶۲] سال کی عمر[۲] میں اس دار فانی کو خیرباد کہا، اور جان جان آفریں کے سپرد کی ؎

چیست ازیں خوب تر در ہمہ آفاق کار
دوست رسد نزد دوست یار بہ نزدیک یار

کسی تذکرہ میں علالت اور واقعۂ وفات کی تفصیلات نہیں ملتیں، ناچیز مصنف کے لئے یہ بات قابل فخر و شکر ہے کہ اس سلسلہ میں جو کچھ معلومات و تفصیلات ملتی ہیں ان کا واحد ذریعہ رائے بریلی کے سادات حسنی قطبی اور خاندان علم اللّٰہی کے ایک ممتاز فرد سید محمد نعمان حسنی کا مکتوب ہے، جو انھوں نے اسی خاندان کے دوسرے بزرگ و نامور فرد حضرت شاہ سید ابو سعیدؒ کے نام شاہ صاحبؒ کی وفات کے عین بعد دہلی سے لکھا تھا، کاتب حضرت سید محمد نعمانؒ[۳] مجاہد کبیر

---

[۱] آل عمران ۱۸۵ [۲] ملفوظات شاہ عبدالعزیزؒ اردو میں شاہ صاحبؒ کی زبانی بیان کیا گیا ہے کہ عمر شریف باسٹھ برس چار ماہ کی ہوئی، چوتھی شوال ۱۱۱۴ھ کو پیدا ہوئے اور انتیسویں محرم ۱۱۷۶ھ کو وفات پائی، وفات کی تاریخ امام اعلم دین ہے (ملفوظات ص۸۵ مطبوعہ مطبع ہاشمی میرٹھ) [۳] سید محمد نعمان حضرت شاہ علم اللہؒ کے پڑپوتے ہیں، ان کا شجرہ اس طرح ہے نعمان بن نور بن ہدیٰ بن علم اللہ حسنی الحسینی، خاندان کے وطن قدیم نصیر آباد ضلع رائے بریلی میں ولادت ہوئی، کچھ عرصہ مقامی علماء سے تعلیم حاصل کی پھر لکھنؤ جا کر مولانا عبداللہ امیٹھوی سے درسیات کی تکمیل کی، پہلے حضرت شاہ علم اللہؒ کے عالی نسبت صاحبزادہ حضرت سید محمدؒ سے بیعت و تربیت حاصل کی،

(باقی صفحہ ۱۱۹ پر)

حضرت سید احمد شہیدؒ کے حقیقی چچا اور مکتوب الیہ (حضرت شاہ سید ابو سعیدؒ) حضرت سید صاحب کے حقیقی نانا تھے، حضرت شاہ ابو سعیدؒ شاہ صاحب کے مریدین اور اصحاب با اختصاص میں سے تھے، جن کے نام شاہ صاحب کے خود متعدد مکاتیب موجود ہیں، یہ خط بجنسہ خاندانی مجموعۂ مکاتیب مکتوب المعارفؒ (قلمی) سے نقل کیا جاتا ہے:۔

الحمد لله على النعماء والرضاء	باسمہ سبحانہ تعالے شانہ۔ اللہ تعالے
على القضاء والصبر على المصيبة	کا شکر ہے اس کی نعمتوں اور تقدیر
والبلاء والصلاة والسلام على	پر راضی رہنے اور بلاء و مصیبت میں
سيد الشاكرين وزبدة الراضين	صبر کی توفیق پر، صلوٰۃ وسلام ہو سید
وقدوة الصابرين شفيع المذنبين	الشاکرین وزبدۃ الراضین، قدوۃ
ورحمة للعالمين محمد وآله وصحبه	الصابرین، شفیع المذنبین اور رحمۃ للعالمین
الطيبين الطاهرين وعلى ورثته	محمد رسول اللہ اور ان کی آل واصحاب
العلماء الراسخين والاولياء	پر جو طیب وطاہر تھے اور آپ کے وارث
المرشدين إلى يوم الدين	علمائے راسخین اور اولیائے مرشدین پر
بعد هذا اگر شرح سوگواری وبیان	قیامت تک اس کے بعد عرض ہے کہ

(باقی ص ۱۱۸ کا) ان کے انتقال کے بعد ان کے عالی مرتبت صاحبزادے حضرت سید محمد عدل عرف شاہ لعل صاحب سے استفادہ اور اخذ فیض کیا، ان کے انتقال کے بعد رخت سفر باندھا اور حضرت شاہ علم اللہؒ کے خلفائے نامدار اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب سے فیض و برکات حاصل کیے، خوش قسمتی سے حضرت شاہ صاحب کی وفات کے وقت موجود اور ان کی توجہ خاص سے محظوظ ہوئے، شاہ صاحب کی وفات کے بعد عزم اختیار کیا، حج وزیارت کے بعد بیت المقدس اور مدینۃ الخلیل (حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا مسکن و مدفن) کا رخ کیا، راستہ میں وقت موعود آپہونچا، اور سرزمین انبیاء و بیت المقدس میں مدفون ہوئے، یہ واقعہ ۱۱۹۳ھ کا ہے (نزہۃ الخواطر ۶)

عزای و ماتم داری واقعۂ ارتحال امام	امام اہل سنت وجماعت مقتدائے
سنت وجماعت و مقتدای ارباب کرامت	ارباب کرامت، پیشوائے عرفائے
پیشوای عرفاء زمان سرآمد اولیاء جہان	زماں، سرآمد اولیائے جہاں
قطب زمانی محبوب سبحانی سیدنا و مرشدنا	قطب زمانی، محبوب سبحانی سیدنا
ولی اللہ فاروقی مجدد مأۃ دوم الف ثانی	ومرشدنا شاہ ولی اللہ فاروقی
رضی اللہ عنہ ازیں عالم پر ملال بصوب	مجدد قرن دوازدہم رضی اللہ عنہ
دار الانفصال بوصال ذو الجلال بر صفحۂ	کے واقعۂ ارتحال کی تفصیل اگر
روزگار ثبت باید ہر آئینہ مانند حال ماغریبان	صفحۂ روزگار پر ثبت ہو تو ہم سکینوں
عزدگان سزد ـــ	کے حسب حال ہے ـــ
چہ بخاطر رسید یار مرا	چہ بخاطر رسید یار مرا
کہ بہجراں کشید کار مرا	کہ بہجراں کشید کار مرا
وامصیبتاہ ایں چہ بے نیازی و نیرنگ	وامصیبتاہ! اللہ تعالیٰ کی یہ عجیب
سازی است کہ چنیں روح مقتدای	شان بے نیازی ہے کہ ایسے مقتدیٰ کی
را در کمتر وقت بعمر شصت و دو سالگی نداء	روح کو صرف ٦٢ سال کی مختصر عمر میں
"اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً"	"اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً"
(الفجر-٢٨) دادند و اصحاب بدع	(الفجر-٢٨) کی پکار سنادی گئی اور اہل
ضلال را عشرت آگیں نمودند و اصحاب	بدعت وضلالت کو خوش اور دینداروں
دین را اندوہ گیں کردند یعنی بتاریخ	کو اندوہ گیں کر دیا گیا یعنی محرم کی آخری
سلخ محرم الحرام سنہ ۱۱۷۶ یک ہزار	تاریخ سنہ ۱۱۷۶ھ شنبہ کے دن ظہر کے

وبکصد و ہفتاد و شش یوم السبت
وقت الظہر بامر داعی برحق روح مطہر
آنحضرت از قالب عنصری مفارقت
نمودہ باوج علیین نشیمن ساختہ
بمقتضائے وَلَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّکَ
مِنَ الْاُوْلٰی ۝ وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ
رَبُّکَ فَتَرْضٰی ۝ (الضحیٰ ۴-۵)
ای لقاء رفیق اعلیٰ دران پرداختہ
اما حالت تمام اصحاب واحباب
از مفارقت آنجناب چناں تباہ و
خراب بود کہ از حیز تحریر بیرونست
یقینیکہ استیلاء وکاہش آلام
بر منتسبان مہجوران مستہام یافتہ
باشد رضینا بقضاء اللہ انا للہ
وانا الیہ راجعون رحمۃ اللہ
علیہ وعلی من بجنابہ یتوسلون
آمدیم بر اینکہ از فضل الٰہی و تصدق
جناب حضرت رسالت پناہی
صلے اللہ علیہ وعلی آلہ جا دبہ

وقت حق تعالےٰ کے حکم سے حضرت
کی روح پاک نے قالب عنصری کو
چھوڑکر اوج علیین پر اپنا نشیمن
بنالیا...... تمام اصحاب و احباب
کی حالت آنجناب کی فرقت سے
ایسی تباہ و خراب تھی جو احاطۂ
تحریر سے باہر ہے إنا للہ وانا
الیہ راجعون اللہ کی رحمت
آپ پر اور آپ کے متوسلین پر
نازل ہو، مقصد تحریر یہ ہے کہ
فضل الٰہی اور حضرت رسالت
پناہی صلے اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم
کے صدقے میں حضرتؒ کی کشش
نے اپنی طرف کھینچا، ذی قعدہ کے
مہینے میں بڈھانہ جاکر آستاں بوسی
کی سعادت حاصل کی اور جناب
قدسی القاب کی صحبت سے مشرف ہوا
اور اپنے حال پر حضرت کی بلند توجہات
میں بہت اضافہ دیکھا، وہاں سے

حضرت ایشان علیہ الرحمۃ این عاصی
را بسوی خود کشید بشہر ذیقعدہ وبعدہا
رفتہ بتقبیل آستانہ متبرکہ استسعاد
یافتہ وبملازمت جناب قدسے
القاب مشرف گردید بر حالات خود
توجہات عالیات بیش از بیش یافتہ
از آنجا حضرت ایشان جہت تداوی
وتدابیر در ماہ ذی الحجہ تاریخ نہم بشہر
دہلی بمکان بابا فضل اللہ در مسجد روشن
الدولہ بچوک سعد اللہ خاں نزول
فرمودند از فرزندان گرامی میاں محمد صاحب
و میاں عبدالعزیز و میاں رفیع الدین
مدظلہم العالی و میاں محمد عاشق صاحب
و میاں اہل اللہ صاحب و میاں محمد فائق
و میاں محمد جواد و محمد امین وغیرہ یاران
حاضر خدمت بودند و این غلام
و میر محمد عتیق و میر قاسم علی کہ در وقت
آخرین شرف انتساب بیعت یافتہ
ہر روز بشرف حضور پر نور و خدمت گاری

حضرت دوا علاج کے سلسلے میں
۹ ذی الحجہ کو دہلی میں بابا فضل اللہ
کے مکان پر مسجد روشن الدولہ کے
احاطے میں (جو چوک سعد اللہ خاں
میں ہے) مقیم ہوئے، فرزندانِ گرامی
میں سے میاں محمد صاحب، میاں عبدالعزیز
و میاں رفیع الدین مدظلہم العالی (اور
مریدین و متعلقین میں سے) میاں
محمد عاشق صاحب، میاں محمد فائق،
میاں محمد جواد، اور خواجہ محمد امین وغیرہ
احباب حاضرِ خدمت تھے، یہ غلام
اور میر محمد عتیق، اور میر قاسم علی
(جنھوں نے حضرت سے ان کے
آخری ایام میں شرف بیعت
حاصل کیا تھا) ہر روز حاضری
و خدمت گزاری کی سعادت حاصل
کرتے تھے، مشفق من! یہ آخری
مجلسیں، عجب پر فیض مجلسیں تھیں،
ملائکہ و ارواح طیبہ کا بار بار نزول

وسیلۂ حضور در حضور سعادت اندوز
می شدیم شفقا این مجلس آخرین عجب
مجلسے بود پر فیض دائما مہبط ملاء ملکوت
و نزول ارواح طیبۂ ارکان عالم ناسوت
میگردید و نفحات انس و رحمت و رشحات
قدس و برکت بمثال نزول غیث
می بارید اکثر یاران اہل نسبت بوجدان
صحیحہ خود می دریافتند و احسنا اہل اللہ
و عرفاء لا ازال در ہر زمان پیدا شدہ
اما این چنین مرد با جمعیت اوصاف حمیدۂ
علم کتاب و سنت با اجتہاد مطلق و در
حقائق و معارف بحر مواج و در علوم
دیگر بحر فیاض بس از صدہا سال
بوجود می آید ؎

دور ہا باید کہ تا یک مرد حق صاحب دل شود
بایزید اندر خراسان یا اویس اندر قرن

یاران را می باید کہ مصاحبت و شکیبائی
در زیدہ نسبت رابطہ حضرت شیخ را
بجامع ہمت در تصور نہادہ بمراقبات

محسوس ہوتا تھا، نفحات انس و رحمت
اور رشحات قدس و برکت بارش
کی طرح برستے تھے، اکثر اہل نسبت
احباب اپنے وجدانِ صحیح سے
اس کو محسوس کرتے تھے، واحسنا
اہل اللہ اور عارفین ہر زمانے
میں ہوتے ہیں، مگر ایسا مردِ حقانی
جو ایک طرف اوصاف حمیدہ کا
جامع ہو دوسری طرف کتاب
و سنت کے علم میں مجتہد مطلق کا
درجہ رکھتا ہو، حقائق و معارف
کا بحر متلاطم اور دیگر علوم کا
دریائے فیاض ہو کہیں صدیوں
میں پیدا ہوتا ہے ؎

دور ہا باید کہ تا یک مرد حق صاحب دل شود
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

دوستوں کو چاہیئے کہ صبر و شکیبائی
اختیار کرکے حضرت شیخ کی نسبت رابطہ کو
پوری ہمت کے ساتھ تصور میں رکھ کر مراقبات

معلوم مشغول باشد انشاء اللہ تعالیٰ	معلوم میں مشغول ہوں، انشاء اللہ
فیض صحبت و رابطہ برابر خواہد بود	فیض صحبت و رابطہ برابر جاری
کما یفہم من بعض رسائلہ	رہے گا جیسا کہ حضرتؒ کے بعض
رحمۃ اللہ علیہ۔	رسائل سے معلوم ہوتا ہے۔
والحمد للہ رضامندی حضرت صاحب	الحمد للہ کہ حضرت قدس سرہ کی آپ سے
قدس سرہ از آں صاحب و توجہات عالیات	رضامندی اور آپ کے حال پر توجہات عالیہ کو
بحال ایشاں زیادہ از حد بیان یافتہ	حد بیان سے باہر پایا، اکثر اوقات جناب کے
اکثر اوقات استفسار احوال سامی	حالات دریافت فرماتے تھے، ابدالیوں کی
میفرمودند ماجرای غارتگی ابدالیاں	جنگ اور آپ کے عین محشر بپا ہونے اور فتنہ
و رسیدن آنصاحب در عین رستخیز و انطفاء	کی آگ سے آپ کے قدم گرامی سے فرو ہوجانے
یافتن التہاب بسبب قدم گرامی	کے واقعات زبان درفشاں سے بیان فرماتے
از زبان درفشاں مودی ساختند و	تھے[1] شاید آپ کے آخری ملاقات کی
شاید منظور لقای آخریں بضمیر منیر بودہ	تمنا حضرت کے دل میں تھی، کیونکہ
باشد مرۃ فرمودند کہ میر ابو سعید قصد	ایک بار فرمایا کہ میر ابو سعید آنے کا
آمدن دارند اگر زود برسند بہتر	ارادہ رکھتے ہیں اگر جلد آجائیں تو
باشد۔	بہتر ہوگا۔
صاحب من ظاہر صحبت ایشاں	صاحب من! حضرت کی ظاہری
رو باستتار کشید و تصنیفات آنحضرت	صحبت سے تو اب محرومی ہے،

[1] اس میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے، اس کی تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

قریب بنود بل زیاده در هر علوم دین
از تفسیر و اصول و فقه و کلام و حدیث
مثل حجة الله البالغه و اسرار فقه و تصوف
و ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء،
و ترجمه قرآن که هر واحد قریب بهشتاد
و نود جزو کلان بحجم خواهد بود و دیگر رسایل
در حقائق و معارف مثل لطائف القدس
و همعات و فیوض الحرمین و انفاس
العارفین و غیرهم که نشان از صحبت
و برکت خدمت سید هندی باید که
عزیمت بریں آرند که همه را
نویسانیده رائج نمایند باندک
توجهات سرانجام خواهد یافت،
و مثل این چنیں تصنیفات والله
اعلم در اسلام تصنیف شده
باشد یا نه چنانچه ارباب بصیرت
عبرت یافته اعتراف دارند و کلام
ایشاں در هر باب که نوشته اند

البتہ حضرت کی تصنیفات کی تعداد
نوے بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے،
علوم دین یعنی تفسیر و اصول، فقہ و
کلام اور حدیث میں حجۃ اللہ البالغہ
اسرار فقہ، تصوف[1] ازالۃ الخفاء عن
خلافۃ الخلفاء اور ترجمۂ قرآن کہ
ان میں سے ہر ایک کی ضخامت اسّی
نوے جز کی ہوگی، حقائق و معارف میں
دیگر رسالے جیسے الطاف القدس، ہمعات
فیوض الحرمین اور انفاس العارفین
وغیرہ جو حضرت کی صحبت و برکت کی
نشاندہی کرتی ہیں ان کے بارے میں آپ
ہمت کریں کہ ان سب کو لکھوا کر رائج
کریں یہ کام تھوڑی سی توجہ سے انجام
پا جائے گا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ
تاریخ اسلام میں ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں
یا نہیں جیسا کہ ارباب بصیرت ان کا
اعتراف کرتے ہیں، حضرت نے

---

[1] اس سے کونسی کتاب مراد ہے اس کی وضاحت نہ ہو سکی۔

اصول است" اللھم ارزقنا
حلاوۃ منھم"

و یقین این فقیر و دیگر صاحبزادہا
و یاران حضرت بملاحظۂ فرط محبت
سامی بجناب حضرت اینست کہ بمجرد
شنیدن این حادثۂ عظیمہ جہت
فاتحہ روحانیت و زیارت مرقد
مطہر راہی این صوب خواہند شد
لہذا منتظر قدوم ہستم اگر زود تشریف
بیارند باری بملاقات سامی مسرور
الوقت شوم' و اگر توقف در آمدن
باشد اعلام نمایند کہ فقیر ہم عزم
مراجعت وطن دارد۔

و دیگر آنکہ میاں محمد عاشق صاحب
بعد سلام فرمودہ اند کہ میر ابو سعید
جیو را بنویسند کہ ہر مکاتیب کہ حضرتؒ
ایشاں بجانب آنصاحب شرف
صدور یافتہ باشد نقل آنہا البتہ
بفرستند کہ داخل مکاتیب نمودہ شود'

جس مضمون پر بھی لکھا ہے وہ اصولی
حیثیت رکھتا ہے۔

اس فقیر اور صاحبزادگان اور حضرت
کے احباب کو (حضرتؒ سے آپکے غایت
تعلق کو دیکھتے ہوئے) یقین ہے کہ
آپ اس حادثۂ عظیمہ کی خبر سنتے ہی
فاتحہ خوانی اور مرقد مطہر کی زیارت
کے لئے دہلی کے لئے روانہ ہوجائیں گے'
اسلئے میں منتظر قدوم ہوں اگر جلد تشریف لائیں
تو ملاقات سامی میں بھی خوش وقت
ہوجاؤں گا اگر آنے میں دیر ہو تو اطلاع
فرمائیں کہ فقیر بھی وطن واپسی کا ارادہ
رکھتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ میاں محمد عاشق
صاحب نے بعد سلام کے فرمایا ہے کہ
میر ابو سعید کو لکھ دیجئے کہ آپ کے
نام حضرتؒ کے جتنے بھی مکتوبات ہوں
ان کی نقل ضرور بھیج دیں تاکہ انھیں
مکاتیب کے مجموعے میں داخل کیا جائے'

از حضرت میاں اہل اللہ صاحب	حضرت میاں اہل اللہ صاحب
و دیگر یاران و صاحبزادہا سلام اسم	دوسرے احباب اور صاحبزادگان
باسم مطالعہ فرمایند و کیفیت ارتحال	کی طرف سے نام بہ نام سلام پہنچے
و وصال مرحومی مغفوری غفران پناہ	بھائی محمد معین کی کیفیت
بھائی محمد معین صاحب[1] رحمۃ اللہ علیہ	ارتحال و وصال کو میں نے حضرت
رحمۃ واسعۃ بجناب عالی حضرت	سے بڈھانہ میں عرض کر دیا تھا
صاحب قبلہ در مقام بڑھانہ عرض	حضرتؒ نے ان کی روح کو
کردم فاتحہ بروحانیت خواندند	ثواب بخشا تھا، اور افسوس کا
وتاسفہا نمودند[2]	اظہار کیا تھا[3]۔

شاہ صاحبؒ کی وفات ۲۹ محرم ۱۱۷۶ھ بروز شنبہ (۲۱ اگست ۱۷۶۲ء) بوقت ظہر ہوئی، جیسا کہ مکتوب مذکور الصدر سے معلوم ہوا، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے ملفوظ میں ہے۔

کہ در بست نہم محرم وفات یافت	۲۹ محرم کو وفات پائی آپکی تاریخ
..... تاریخ وفات اوبود امام اعظم دین	وفات "او بود امام اعظم دین" اور

---

[1] سید محمد معین بن سید محمد ضیاء بن آیت اللہ بن شاہ علم اللہؒ حضرت شاہ ابو سعید صاحب کے علاتی بھائی اور عمر میں بڑے تھے، ۱۱۷۶ھ کی کسی تاریخ میں انتقال ہوا، ان کا سلسلۂ اولاد خاندان میں چل رہا ہے۔

[2] مکتوب المعارف (فارسی) ص ۱۹-۲۰ (قلمی)

[3] ترجمہ از فارسی بقلم مولوی شمس تبریز خاں صاحب۔

دیگر: ہائے دل روزگار رفت[1]" "ہائے دل روزگار رفت" سے

بست نہم محرم وقت ظہر[2] نکلتی ہے، ۲۹ محرم وقت ظہر

وفات کا دن اور وقت تھا۔

مدفن

تدفین دلّی دروازہ کے بائیں جانب اس مقام پر ہوئی، جو مہندیاں کہلاتا ہے[3]، جس جگہ یہ قبرستان واقع ہے، یہاں کبھی حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے جد مادری شیخ عبدالعزیز شکر بار کی خانقاہ تھی، اب بھی ان کا مزار اس سے کچھ فاصلہ پر ہے، بعد میں شیخ رفیع الدین صاحب نے یہیں قیام اختیار کیا، خاندان ولی اللّٰہی کے مکانات بھی اسی جگہ تھے، شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس جگہ قیام ترک کر کے اندرون شاہجہان آباد قیام اختیار کیا، یہیں مہندیاں

---

[1] صحیح "ہائے دلی روزگار رفت" ہے جس سے صحیح سنہ وفات نکلتا ہے (مقالہ مولوی نورالحسن راشد کاندھلوی، برہان جولائی ۱۹۸۳ء) [2] ملفوظات حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، ص۳۱ (مطبع مجتبائی میرٹھ ۱۳۱۴ھ) [3] سرسید احمد خاں "آثار الصنادید" میں لکھتے ہیں۔

"یہ ایک عمارت تھی، نیچے تو مکانات اور در سے بنے ہوئے تھے اور اوپر چاروں کونوں پر چار برجیاں تھیں، کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ عمارت کیا چیز تھی اور کب بنی تھی اور کس نے بنائی تھی، مگر عوام الناس میں یہ مشہور ہے کہ کوئی نواب تھے کہ جناب حضرت غوث الاعظمؒ کی مہندیاں بھرا کرتے تھے یعنی کھپچیوں کی ایک برجی اونچی سی بنا کر اور کاغذ سے منڈھ کر اس کو روشن کرتے تھے۔

ان نواب صاحب کے یہاں بھی مہندی روشن ہونے کی رسم تھی، جب سے اس عمارت کا نام مہندیاں کر کے مشہور ہو گیا مگر نہیں معلوم کہ وہ نواب کون تھے جنھوں نے یہ مہندی بنائی تھی" (آثار الصنادید ص۵۰-۵۱ طبع لکھنؤ ۱۸۷۶ء)

کے قبرستان میں شاہ صاحبؒ کے چاروں صاحبزادگان خود شاہ صاحبؒ کے والد محترم حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کی قبور ہیں، جن پر کتبے نصب ہیں، جن میں ان کے سنین وفات ہیں، ان حضرات کے علاوہ خاندان کے دوسرے افراد ذکور و اناث کی قبریں ہیں، متصل مسجد ہے، جس کے قرب و جوار میں بہت سے علماء و صالحین اور خاندان ولی اللّٰہی کے عقیدت مندوں کی کثیر التعداد قبریں ہیں، جن میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

باب پنجم

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے تجدیدی کارنامے

اصلاحِ عقائد و دعوت الی القرآن

شاہ صاحب کے دائرۂ تجدید کی وسعت اور تنوع

شاہ صاحبؒ سے اللہ تعالیٰ نے تجدید و اصلاح امت، دین کے فہم صحیح کے احیاء، علوم نبوت کی نشر و اشاعت اور اپنے عہد و ملت کے فکر و عمل میں ایک نئی زندگی اور تازگی پیدا کرنے کا جو عظیم الشان کام لیا، اس کا دائرہ ایسا وسیع اور اس کے شعبوں میں اتنا تنوع پایا جاتا ہے جس کی مثال معاصر ہی نہیں، دور ماضی کے علماء و مصنفین میں بھی کم نظر آتی ہے، اس کی وجہ (توفیق اور تقدیر الٰہی کے ماسوا) اس عہد کے حالات کا تقاضا بھی ہو سکتا ہے، جو شاہ صاحب کے حصہ میں آیا، اور وہ جامعیت، علوئے ہمت اور مخصوص تعلیم و تربیت بھی جو شاہ صاحب کے خصائص میں سے ہے، اس سب کا نتیجہ تھا کہ شاہ صاحب نے علم و عمل کے اتنے میدانوں میں تجدیدی و اصلاحی کارنامے انجام دیا کہ ان کے سوانح نگار اور اسلام کی تاریخِ دعوت و عزیمت پر قلم اٹھانے والے کے لئے، ان کا احتواء، اور ان سب کا تفصیلی و تحلیلی جائزہ لینا دشوار ہو گیا ہے، اور جو اس کا ارادہ کرے اس کی زبان بے اختیار فارسی کے اس مشہور شعر کے ساتھ

شکوہ سنج ہو جاتی ہے ؎

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

ہم ان کو اگر علیحدہ علیحدہ بیان کریں تو ان کے حسب ذیل عنوانات ہوں گے۔

۱۔ اصلاح عقائد و دعوت الی القرآن۔

۲۔ حدیث و سنت کی اشاعت و ترویج، اور فقہ و حدیث میں تطبیق کی دعوت و سعی

۳۔ شریعت اسلامی کی مربوط و مدلل ترجمانی اور اسرار و مقاصدِ حدیث و سنت کی نقاب کشائی۔

۴۔ اسلام میں خلافت کے منصب کی تشریح، خلافت راشدہ کے خصائص اور اس کا اثبات اور ردّ رفض۔

۵۔ سیاسی انتشار اور حکومت مغلیہ کے دور احتضار میں شاہ صاحب کا مجاہدانہ و قائدانہ کردار۔

۶۔ امت کے مختلف طبقات کا احتساب اور ان کو دعوتِ اصلاح و انقلاب۔

۷۔ علمائے راسخین اور مردانِ کار کی تعلیم و تربیت جو ان کے بعد اصلاح امت اور اشاعت دین کا کام جاری رکھیں۔

ہم سب سے پہلے اصلاح عقائد و دعوت الی القرآن کے عنوان کو لیتے ہیں کہ تجدید دین و اصلاحِ امت کا کام کسی دور اور کسی ملک میں بھی شروع کیا جائے تو اس کو اوّلیت حاصل ہوگی اور اس کے بغیر احیائے دین و ملت کی جو کوشش بھی کی جائے گی وہ نقش بر آب اور عمارت بے اساس ہوگی، قرآن نے انبیاء علیہم السلام کے واقعات و مکالمات سے اور مستند تاریخ نے نائبینِ انبیاء اور علماء ربانیین کے طرز عمل اور ترتیب کار سے اسی حقیقت کو ثابت کیا ہے؛

اور قیامت تک یہ ہر اس اصلاح و تجدید کا دستور العمل رہے گا، جس کا مزاج نبویؐ اور جس کا نظام قرآنی ہوگا۔

عقائد کی اہمیت

مُصنّف یہاں پر اپنی ایک سابقہ تحریر کا اقتباس پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہے:-

"اس دین کا سب سے پہلا امتیاز اور نمایاں شعار عقیدہ پر زور اور اصرار، اور سب سے پہلے اس کا مسئلہ حل کر لینے کی تاکید ہے، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبیین محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تک تمام انبیائے کرام ایک معیّن عقیدہ کی (جو ان کو وحی کے ذریعہ ملا تھا) دعوت دیتے اور اس کا مطالبہ کرتے رہے، اور اس کے مقابلہ میں کسی مفاہمت یا دست برداری پر تیار نہ ہوئے ان کے نزدیک بہتر سے بہتر اخلاقی زندگی، اور اعلیٰ سے اعلیٰ اسلامی کردار کا حامل، نیکی و صلاح، سلامت روی اور معقولیت کا زندہ پیکر اور مثالی مجسمہ، خواہ اس سے کسی بہتر حکومت کا قیام، کسی صالح معاشرہ کا وجود، اور کسی مفید انقلاب کا ظہور ہوا ہو[1] اس وقت تک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا جب تک وہ اس عقیدہ کا ماننے والا نہ ہو، جس کو وہ لے کر آئے، اور جس کی دعوت ان کی زندگی کا نصب العین ہے، اور جب تک اس کی یہ ساری کوششیں اور کاوشیں صرف اس عقیدہ کی بنیاد پر نہ ہوں، یہی وہ حدِ فاصل، واضح اور روشن خط ہے جو انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دعوت اور قومی رہنماؤں، سیاسی لیڈروں، انقلابیوں اور ہر اس شخص کے

---

[1] اگرچہ اس میں بڑا شبہ ہے کہ صحیح عقیدہ کی اساس کے بغیر ایسا ممکن بھی ہے۔

درمیان کھینچ دیا گیا ہے، جس کا سرچشمۂ فکر و نظر انبیاء کرام کی تعلیمات اور ان کی سیرتوں کے بجائے کوئی اور ہو۔[1]

"حقیقت یہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ جو علوم و حقائق انسانوں تک پہونچے ہیں، ان میں سب سے اعلیٰ اور ضروری واہم علم خدا تعالیٰ کی ذات، صفات اور افعال کا علم اور اس مخصوص تعلق کا تعین ہے جو خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے درمیان ہونا چاہئے، یہ علم سب سے برتر و افضل علم ہے، اس لئے کہ اس پر انسانوں کی سعادت و فلاح دنیوی اور نجات اخروی موقوف ہے اور یہی عقائد و اعمال اور اخلاق و تمدن کی بنیاد ہے، اسی کے ذریعہ انسان اپنی حقیقت سے واقف ہوتا، کائنات کی پہیلی بوجھتا اور زندگی کا راز معلوم کرتا ہے، اسی سے اس عالم میں اپنی حیثیت کا تعین کرتا، اور اس کی بنیاد پر اپنے ہم جنسوں سے اپنے تعلقات استوار کرتا ہے، اور اپنے مسلکِ زندگی کے بارے میں فیصلہ اور پورے اعتماد و بصیرت اور وضاحت کے ساتھ اپنے مقاصد کا تعین کرتا ہے۔"[2]

خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا اس امت کے ساتھ جو خصوصی رابطہ اور تائید و نصرت، رضا و محبت اور غلبہ و عزت کا جو مؤکد وعدہ ہے، وہ محض عقائد صحیحہ، ایمانی صفات و خصوصیات اور خاص طور پر خالص اور بے آمیز عقیدۂ توحید کی بناء پر ہے ارشاد ہے:۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ	اور (دیکھو) بے دل نہ ہونا اور
الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ	نہ کسی طرح کا غم کرنا اگر تم مومن (صادق)

---

[1] دستورِ حیات ص۲۱-۲۲ کتاب میں آیات قرآنی اور انبیاء علیہم السلام کے اسوہ کی مدد سے اس کے شواہد و دلائل پیش کئے گئے ہیں، اور حدیث و سیرت کے واقعات سے اس کو مدلل کیا گیا ہے۔ [2] ایضاً ص۶

مُّؤْمِنِيْنَ ○ (آل عمران - ۱۳۹) ہو تو تم ہی غالب ہو گے۔

نیز کھلے لفظوں میں فرمایا گیا ہے:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ	جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ	نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا
فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ	وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دیگا
مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ	جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا
دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ	تھا، اور ان کے دین کو جسے اس نے
وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ	ان کے لئے پسند کیا ہے مستحکم و پائدار
اَمْنًا ۚ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ	کرے گا اور خوف کے بعد ان کو امن
بِيْ شَيْئًا ۚ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ	بخشے گا، وہ میری عبادت کریں گے
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○	(اور) میرے ساتھ کسی اور کو شریک
(النور - ۵۵)	نہ بنائیں گے اور جو اس کے بعد کفر کرے
	تو ایسے لوگ بدکردار ہیں۔

انبیاء کے نائبین برحق، اور علمائے ربانی جو دین اللہ کی فطرت اور اس کے مزاج سے واقف ہوتے ہیں، وہ اس کو کسی جگہ پر قائم کرنے کے لئے پہلے زمین کو پورے طور پر صاف و ہموار کرتے ہیں، وہ شرک اور جاہلیت کی جڑیں اور رگیں (خواہ وہ وثنیت قدیمہ کی یادگار ہوں یا قومی و مقامی اثرات کا نتیجہ) چن چن کر نکالتے اور ان کا ایک ایک بیج بن بن کر پھینکتے ہیں اور مٹی کو بالکل الٹ پلٹ دیتے ہیں، چاہے ان کو اس کام میں کتنی ہی دیر لگے، اور کیسی ہی زحمت اٹھانی پڑے، وہ نتیجہ کے حصول میں کبھی عجلت اور بے صبری سے کام نہیں لیتے۔

• شرک (مختلف شکلوں میں) نوعِ انسانی کی سب سے خطرناک اور پرانی بیماری ہے، وہ اللہ کی غیرت اور اس کے غضب کو بھڑکانے کے ماسوا، بندوں کے روحانی، اخلاقی اور تمدنی ترقی کی راہ کا سب سے بڑا روڑا ہے، وہ انسان کی قوتوں کا گلا گھونٹ دیتا ہے، ان کی صلاحیتوں کا خون کرتا ہے، قادرِ مطلق پر اس کے یقین، اس کی خود اعتمادی اور خود شناسی کا خاتمہ کر دیتا ہے، اور سمیع و بصیر اور صاحبِ قدرت و علم، صاحبِ جود و عطا اور مغفرت و محبت والے خدا کی محفوظ و مستحکم پناہ سے نکال کر اور اس کے لامحدود صفات، اور نہ ختم ہونے والے خزانوں کے فوائد سے محروم کر کے کمزور و عاجز، فقیر و حقیر مخلوقات کے زیرِ سایہ پناہ لینے پر مجبور کر دیتا ہے، جن کی جھولی میں کچھ نہیں[1]۔"

عقیدۂ توحید کی از سرِ نو تبلیغ و تشریح کی ضرورت

مصنف نے "تاریخ دعوت و عزیمت" کے حصۂ دوم میں جو شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کے ساتھ مخصوص ہے، امام ابن تیمیہؒ کے زمانہ میں مشرکانہ عقائد و رسوم کے عنوان کے ذیل میں لکھا تھا:۔

"غیر مسلم و عجمی اقوام کے اختلاط، اسماعیلی و باطنی حکومت کے نفوذ و اثر، نیز جاہل و گمراہ صوفیوں کی تعلیم و عمل سے عام مسلمانوں میں مشرکانہ عقائد و رسوم کا رواج ہو چلا تھا، بہت سے مسلمان اپنے دینی پیشواؤں، مشائخ طریقت اور اولیاء و صالحین کے بارے میں اسی طرح کے غالیانہ اور مشرکانہ خیالات اور عقیدہ رکھنے لگے تھے، جو یہود و نصاریٰ حضرت عزیر و مسیح اور اپنے احبار و رہبان کے

---

[1] "منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین" از مصنف ص۲۷

متعلق رکھتے تھے، بزرگان دین کے مزارات پر جو کچھ ہونے لگا تھا، وہ ان سب اعمال و رسوم کی ایک کامیاب نقل تھی، جو غیر مسلموں کی عبادت گاہوں اور مقدس شخصیتوں کی قبروں پر ہوتے تھے، اہل قبور سے صاف صاف استعانت واستغاثہ کا معاملہ ہونے لگا تھا، ان سے فریاد اور ان کی دوہائی دینے، سوال اور دعا کرنے کا رواج ہو گیا تھا، ان کی قبور پر بڑی بڑی مسجدیں تعمیر کرنے اور خود قبور کو سجدہ گاہ بنانے، ان پر سال بہ سال میلہ لگانے اور دور دور سے سفر کر کے وہاں آنے کا عام دستور تھا، کھلی قبر پرستی، خدا سے بے خوفی، اور صاحب مزار سے خوف و خشیت، اللہ اور شعائر اللہ سے استہزاء واستخفاف بے ادبی اور شوخ چشمی، بزرگوں کے ساتھ اعتقاد الوہیت کے درجہ تک مشاہد و مزارات کا حج، اور بعض اوقات حج بیت اللہ پر اس کی ترجیح، کہیں کہیں مساجد کی ویرانی اور کس مپرسی اور مشاہد کے رونق و اہتمام، اس زمانہ کی جاہلانہ زندگی کے وہ خط و خال تھے، جن کے دیکھنے کے لئے بہت دور جانے اور بہت غور سے کام لینے کی ضرورت نہ تھی۔[۵۱]

یہ مصر و شام و عراق جیسے ممالک کا حال تھا جن کو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے مبارک ہاتھوں سے فتح کیا تھا، جو مرکز اسلام، مہبط وحی، اور مسکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت قریب اور مربوط تھے، جہاں کی زبان عربی تھی جس میں قرآن مجید نازل ہوا، جہاں قرآن و حدیث کے درس کا سلسلہ ایک دن کے لئے موقوف نہیں ہوا، اور جہاں علوم حدیث اور شرح حدیث پر عظیم ترین کتابیں لکھی گئیں۔

۵۱۔ "تاریخ دعوت وعزیمت" حصہ دوم صفحہ ۲۰۴-۲۱۵ بہ اختصار و ترمیم۔

س کے مقابلہ میں ہندوستان (وہ بھی بارھویں صدی کے ہندوستان) کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے، جہاں اسلام ترکستان، ایران اور افغانستان کا چکر کاٹ کر اور اپنی بہت کچھ تازگی اور توانائی کھو کر ان لوگوں کے ذریعہ پہونچا جو براہ راست فیضانِ نبوت سے مستفیض نہیں ہوئے تھے، اور جن میں سے بہت سے اپنے نسلی اور قومی اثرات سے بالکلیہ آزاد نہیں ہو سکے تھے، پھر ہندوستان میں ہزاروں برس سے ایک ایسا مذہب، فلسفہ اور تہذیب حکمرانی کر رہے تھے، جن کے رگ و پے میں وثنیت اور شرک جاری و ساری تھا، اور جو ان آخری صدیوں میں وثنیت کا سب سے بڑا نمائندہ، اور جاہلیت قدیم کا امین و محافظ رہ گیا تھا، یہاں برہمنیت ور دوسرے مشرکانہ ماحول سے منتقل ہو کر ہندوستان کی مسلمان آبادی کا ایک بڑا حصہ آغوشِ اسلام میں آیا تھا، پھر یہ بھی ذہن میں تازہ رہے کہ اس ملک کا (طویل تر مدت میں) قرآن و حدیث سے براہ راست وہ رابطہ نہیں رہا تھا، جو ایران کے اثر سے علوم حکمت اور فلسفۂ یونان سے رہا، علوم دینیہ میں اگر اس کا علمی و درسی طور پر رابطہ رہا تو فقہ، اصول فقہ و علم کلام سے جن کا موضوع اور میدانِ بحث، مسائل و جزئیات اور اصولِ استنباط مسائل اور عقائد پر فلسفیانہ بحث سے ہے، عقائد کی اصلاح اور توحید کی ابتدائی دعوت نہیں۔

ہندوستان کے مذاہب، فلسفوں اور یہاں کے رسوم و عادات کا دسویں ہی صدی میں مسلم معاشرہ پر جو اثر پڑ چکا تھا، اس کا اندازہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے اس مکتوب سے لگایا جا سکتا ہے، جو انھوں نے اپنی ایک ارادت مند نیک خاتون کے نام لکھا ہے،[1] جس سے مراسم شرک کی تعظیم، غیر اللہ سے استمداد اور طلب حوائج کے مشرکانہ عقیدہ،

---

[1] ملاحظہ ہو مکتوب ۴۱/۳ بصالحہ از اہل ارادت۔

اہل کفر کے تہواروں کی تعظیم، اوران کے رسوم وعادات کی تقلید، بزرگوں کے لئے حیوانات کو نذر و ذبح کرنے، پیروں اور بیبیوں کی نیت سے روزے رکھنے، اور سیتلا سے خوف اور اس کی تعظیم (جس کو چیچک کی بیماری کی ذمہ دار دیبی سمجھا جاتا تھا) تک کی ہندوانہ ذہنیت اور توہم پرستی کا اندازہ ہوتا ہے، جو مسلمانوں کے گھروں میں داخل ہو چکی تھی، اس عہد پر اور سینکڑوں برس گزر جانے کے بعد، اور قرآن وحدیث سے براہ راست قوی اور عام رابطہ نہ پیدا ہونے کی وجہ سے عقائد میں جو خلل غیر اسلامی بلکہ منافی اسلام، عقائد و اعمال کا جو اثر اچھے اچھے گھرانوں پر پڑا ہو، اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

شاہ صاحبؒ کے زمانہ میں غیر مسلموں کے اثرات، قرآن وحدیث سے ناواقفیت، اور دوری اور نتائج وخطرات اور عوام کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی سے آنکھیں بند کرکے موثر کوشش کے طویل خلا نے ہندوستان میں جو صورت حال پیدا کر دی تھی، اور دین حنیفی کے (جس میں شرک کی کسی پرچھائیں کی گنجائش نہ تھی) متوازی جو نظام عقائد اور مسلم معاشرہ کی زندگی کے میدان میں جاہلیت کا جو سبزۂ خودرو پیدا ہو گیا تھا، اس کا کچھ اندازہ خود شاہ صاحب کی کتابوں کے بعض اقتباسات سے ہو سکتا ہے۔

"تفہیمات" میں ایک جگہ فرماتے ہیں:-

"نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے کہ تم مسلمان بھی آخرکار اپنے سے پہلے کی امتوں کے طریقے اختیار کرو گے، اور جہاں جہاں انھوں نے قدم رکھا ہے، وہاں تم بھی قدم رکھو گے، حتّٰی کہ وہ اگر کسی گوہ کے بل میں گھسے ہیں تو تم بھی ان کے پیچھے جاؤ گے، صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلی امتوں سے آپ کی مراد یہود و نصاریٰ ہیں؟

حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اور کون ؟ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔

سچ فرمایا اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم نے اپنی آنکھوں سے وہ ضعیف الایمان مسلمان دیکھے ہیں، جنھوں نے صلحاء کو ارباب من دون اللہ بنالیا ہے، اور یہود ونصاریٰ کی طرح اپنے اولیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا رکھا ہے، ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں، جو کلامِ شارع میں تحریف کرتے ہیں، اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف یہ قول منسوب کرتے ہیں کہ نیک لوگ اللہ کے لئے ہیں، اور گنہگار میرے لئے، یہ اسی قسم کی بات ہے جیسی یہودی کہتے تھے کہ "لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً ؕ (البقرہ ــ ۸۰) (ہم دوزخ میں نہ جائیں گے اور گئے بھی تو بس چند روز کے لئے) سچ پوچھو تو آج ہر گروہ میں دین کی تحریف پھیلی ہوئی ہے، صوفیہ کو دیکھو تو ان میں ایسے اقوال زبان زد ہیں، جو کتاب وسنت سے مطابقت نہیں رکھتے، خصوصاً مسئلۂ توحید میں اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شرع کی انھیں بالکل پرواہ نہیں ہے۔"[1]

اپنے شہرۂ آفاق رسالہ "الفوز الکبیر" میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"اگر تم کو (عہد جاہلیت کے) مشرکین کے عقائد واعمال کے اس بیان[2] کے صحیح تسلیم کرنے میں کچھ توقف ہو، تو چاہیئے کہ اس زمانہ کے تحریف کرنے والوں کو علی الخصوص جو دار الاسلام کے نواح میں رہتے ہیں، دیکھو کہ انھوں نے

---

[1] التفہیمات الالٰہیہ جلد دوم ص۱۳۴-۱۳۵ [2] شاہ صاحب نے اس سے پہلے مشرکین جاہلیت کے شرک کی حقیقت و نوعیت اور اس کے مظاہر کا تذکرہ کیا ہے۔

ولایت کی نسبت کیا خیال باندھ رکھا ہے، وہ لوگ باوجودیکہ اولیائے متقدمین کی ولایت کے معترف ہیں، مگر اس زمانہ میں اولیاء کے وجود کو قطعاً محال شمار کرتے ہیں، اور قبروں اور آستانوں پر پھرتے ہیں، اور طرح طرح کے شرک میں مبتلا ہیں، اور تحریف و تشبیہ نے ان کے اندر کس قدر رواج پکڑا ہے، بموافق حدیث صحیح "لتتبعن سنن من كان قبلكم" (تم اپنے پیشرو لوگوں کے نقش قدم پر چلوگے) ان آفات میں سے کوئی آفت بھی نہیں رہی، جس پر آج مسلمانوں کی کوئی نہ کوئی جماعت کاربند اور اس کے مانند دیگر امور کی معتقد نہ ہو، عافانا اللہ سبحانہ عن ذٰلک[1]۔"

مرض کا علاج اور اصلاحِ حال کا مؤثر طریقہ، اشاعتِ قرآن

شاہ صاحبؒ نے اس مرض بلکہ وبائے عام کے علاج کے لئے قرآن مجید کے مطالعہ و تدبر اور اس کے فہم کو سب سے مؤثر علاج سمجھا، اور یہ بات محض ذہانت، قوتِ مطالعہ اور قیاس پر مبنی نہیں تھی، بلکہ ایک ایسی بدیہی حقیقت تھی، جس پر قرآن مجید خود شاہد، اور نہ صرف عہد بعثت کی تاریخ بلکہ اسلام کی پوری تاریخ دعوت اور سرگذشتِ اصلاح و تجدید گواہ ہے، خاص طور پر حقیقتِ توحید اور حقیقتِ شرک کو ظاہر کرنے کے لئے اس سے زیادہ واضح، اس سے زیادہ طاقتور، اور دلنشین ذریعہ کا تصور نہیں ہو سکتا، ترجمانِ قرآن شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے اپنے مقدمہ "موضح القرآن" میں جتنے سادہ اور دلنشین انداز میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے، اس سے زیادہ مشکل ہے، فرماتے ہیں:۔

---

[1] الفوز الکبیر ص ۹ مکتبہ محمدی۔

• بتلانے والے بہتیرا بتائیں جیسا خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں آپ بتایا ہے، ویسا کوئی نہیں بتا سکتا، اور جیسا اثر اور راہ پانا خدا کے کلام میں ہے کسی کے کلام میں نہیں ۔[1]

حجاز مقدس کے قیام میں شاہ صاحبؒ کو ہندوستان کی اس دینی صورت حال اور اس کے تعلیمات قرآن، اور تعلیمات اسلام سے بُعد اور منافات کا احساس اور شدت سے پیدا ہوا ہوگا، اور وہاں کی نورانی، روحانی اور قرآنی فضاہیں جہاں سے توحید کا زمزمہ سب سے پہلے بلند ہوا، شاہ صاحب کے قلب بیدار میں اس کا داعیہ کہ وہ ہندوستان میں قرآن مجید کی دولت کو عام کریں ایسی وضاحت اور شدت سے پیدا ہوا ہوگا جس کو اس الہام اور اشارۂ غیبی سے تعبیر کر سکتے ہیں، جو نفوس زکیہ پر ہر عہد میں کسی ضروری دینی کام کی تکمیل کے لئے وارد ہوا کرتا ہے، اور جس کی مقاومت اور جس پر غلبہ پانا ناممکن ہو جاتا ہے، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ شاہ صاحب نے قرآن مجید کے فارسی ترجمہ کا کام جس نے "فتح الرحمٰن" کے نام سے تکمیل پائی حجاز سے واپسی پر شروع فرمایا۔[2]

---

[1] مقدمہ "موضح القرآن" حضرت شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ۔ [2] مصنف "حیات ولی" نے ایک معاصر کے حوالہ سے ترجمۂ قرآن کے قصور میں علماء کی شورش اور مفسدوں کے شاہ صاحب پر قاتلانہ حملہ کی پُر اثر کہانی بیان کی ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شاہ صاحب نے اس شورش سے بچنے کے لئے حجاز کا سفر اختیار کیا، (ص ۲۱۸-۲۲۳)

لیکن کسی اور تاریخی ماخذ سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ خود "فتح الرحمٰن" کے مقدمہ میں اس کی تصریح ہے کہ شاہ صاحب نے ترجمہ کا کام ۱۰ ذی الحجہ سنہ ۱۱۵۰ھ کو شروع کیا اور سنہ ۱۱۵۱ھ میں اس کی تکمیل ہوئی، جس سے صاف طریقہ پر ثابت ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کا یہ مبارک اقدام سفر حجاز سے واپسی کے بھی چار یا پانچ سال بعد کا ہے، ہمارے خاندانی ذخیرۂ کتب میں فتح الرحمٰن کا ایک قلمی نسخہ دو جلدوں میں محفوظ ہے، یہ نسخہ خود شاہ صاحب نے ہمارے خاندان کے (باقی ص ۱۴۲ پر)

اس وقت ہندوستان کیا تقریباً تمام عجمی ممالک میں جن میں ترکستان و ایران اور افغانستان ہندوستان کے قریبی ہمسایہ تھے ——— اور انھیں کے رجحانات، مشاغل، ذوق اور تسلیم شدہ حقائق کا سایہ ہندوستان کی علمی و دینی حلقوں پر پڑتا تھا، یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ قرآن مجید اخص الخواص طبقہ کے مطالعہ، غور و فکر اور فہم و تفہیم کی کتاب ہے، جس کا سمجھنا ایک درجن سے زیادہ علوم پر موقوف ہے، اس کو عوام میں لانا، عوام کو براہ راست اس کے مطالب سے واقفیت پیدا کرنے اور اس سے ہدایت اور روشنی حاصل کرنے کی دعوت دینا سخت خطرناک، ایک بڑی گمراہی اور فتنہ کا دروازہ کھولنے کے مرادف ہے، اور عوام میں ذہنی انتشار، خود رائی، اور علماء سے بے نیازی، بلکہ بغاوت اور سرکشی کی دعوت دینا ہے، اس طرز خیال اور دلیل کو ایک مختصر رسالہ "تحفۃ الموحدینؒ" میں بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے:۔

•بعض لوگ کہہ بیٹھتے ہیں کہ قرآن مجید اور حدیث کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو بہت

(باقی ص ۱۴۱ کا) ایک متوسل میاں محمد اعظم عثمانی نصیر آبادی کو جو شاہ صاحب سے ارادت کا تعلق رکھتے تھے ہدیہ فرمایا، میاں محمد اعظم حضرت سید محمد نعمان (عم حقیقی حضرت سید احمد شہیدؒ) کے پروردہ اور تربیت یافتہ تھے، یہ نسخہ مولانا سید قطب الہدیٰ محدث شاگرد حضرت شاہ عبد العزیزؒ کی ملکیت میں آیا، اور منتقل ہوتے ہوئے والد ماجد مولانا حکیم سید عبد الحئیؒ کے پاس پہونچا، اس نسخہ کی کتابت ۱۱۶۵ھ میں مکمل ہوئی یعنی شاہ صاحب کی وفات سے گیارہ سال پہلے، یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ فتح الرحمن کی تکمیل سفر حجاز سے واپسی کے بعد کا کارنامہ ہے، سفر حجاز سے پیشتر صرف سورۂ بقرہ و نساء کا ترجمہ ہوا تھا۔ یہ رسالہ شاہ صاحبؒ کے نام اور نسبت کے ساتھ شائع ہوا ہے، لیکن چونکہ شاہ صاحب کی تصنیفات و رسائل کے قدیم تذکروں اور فہرست تالیفات میں عام طور پر اس کا نام نہیں آتا، اس لئے ہم جزم و وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ شاہ صاحب کے قلم سے ہے، البتہ جو مضمون نقل کیا جا رہا ہے وہ اس طرز خیال کی صحیح ترجمانی ہے جو عام طور پر پھیلا ہوا تھا، اور اس میں اس کا جواب شافی بھی موجود ہے۔

علم اور بے شمار کتابیں پڑھا ہوا ہو اور اپنے زمانہ کا علامہ ہو ان کے جواب میں
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ
آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ
مُّبِينٍ ۝ (الجمعہ۔۲) (خدا تعالیٰ وہ ہے جس نے ان پڑھوں میں پیغمبر بھیجا انہیں
ان پڑھوں میں سے پڑھتا ہے وہ پیغمبر ان پڑھوں پر خدا کی آیتیں اور ان کو
گناہ کے میل سے پاک کرتا، اور کتاب اور اس کی تدبیر سکھاتا ہے) یعنی رسول خدا
صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ان پڑھ اور آپ کے اصحاب بزرگوار بھی ان پڑھ تھے، مگر
جب رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کے سامنے قرآن کی آیتیں پڑھیں،
تو وہ ان کو سن کر ہر قسم کی برائی اور بگاڑ سے پاک صاف ہو گئے، پس اگر ناخواندہ آدمی
قرآن وحدیث نہیں سمجھ سکتا، اور اس کی سمجھ کی استعداد نہیں رکھتا تو صحابہ برائی ور
عیبوں سے کیونکر پاک صاف ہو گئے؟ اس قوم پر سخت افسوس ہے جو "صدرا" پڑھنے اور
"قاموس" جاننے کا تو دعویٰ کرتے ہیں، مگر قرآن وحدیث کو سمجھنے میں اپنے آپ کو محض نادان
ظاہر کرتے ہیں، اور بعضے یوں کہتے ہیں کہ ہم پچھلے لوگ ہیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم
کے زمانہ کی برکت اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دل کی سلامت کہاں سے
لائیں، جو قرآن وحدیث کے معنی بخوبی سمجھ سکیں، ان کے جواب میں حق تعالیٰ فرماتا ہے،
"وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ (الجمعہ۔۳) یعنی
پچھلے لوگ خواہ پڑھے ہوئے ہوں یا ان پڑھ مگر جبکہ وہ مسلمان ہوں اور اصحاب کے
طریقہ کی پیروی کا ارادہ کریں، اور قرآن وحدیث کو سنیں تو انھیں بھی پاک کرنے کے لئے
یہی قرآن وحدیث کافی ہو سکتی ہیں، اور فرماتا ہے" وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ

لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ" (القمر-۲۲) (اور البتہ ہم نے قرآن کو نصیحت کے واسطے آسان کر دیا، پس کیا کوئی نصیحت لینے والا ہے؟) یہ کیونکر آسانی ہو سکتی ہے کہ کافیہ پڑھنے والے اور "شافیہ" جاننے والے تو اس کے معنی سمجھنے سے عجز ظاہر کرتے اور عرب کے جنگلی لوگ اس کی حقیقت سے بہرہ ور ہوتے ہیں، اس کے علاوہ ایک جگہ یوں فرمایا ہے "اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ" (محمد-۲۴) کہ (قرآن میں کیوں نہیں فکر کرتے) پس اگر قرآن مجید آسان نہ ہو تو اس میں فکر کیونکر کیا جائے "اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا" (محمد-۲۴) (یا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں) یعنی باوجودیکہ دلوں پر قفل نہیں لگے ہوئے ہیں، پھر بھی کیسی گمراہی ہے قرآن کے فکر میں زور نہیں لگاتے"[1]

لیکن بقول شاعر ؎

نوا را تلخ تر می زن چوں ذوقِ نغمہ کمیابی
حُدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

شاہ صاحب نے اس بدمذاقی، بے توفیقی اور غلط اندیشی کو دیکھ کر جس کے "صُدُوْدٌ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ" (الاعراف-۱۴۵) سے مل جاتے تھے فیصلہ کیا کہ قرآن مجید کا اس سلیس فارسی زبان میں ضرور ترجمہ کرنا چاہئے، جو ہندوستان میں قیامِ حکومت اسلامیہ کے بعد سے ملک کی دفتری، علمی، تصنیفی اور خط و کتابت کی زبان تھی اور تقریباً ہر پڑھا لکھا مسلمان اگر اس میں بول لکھ نہیں سکتا تھا، تو اس کو سمجھتا ضرور تھا، ہندوستان میں فارسی زبان کی اس طویل عملداری میں جس کی مدت سات صدیوں سے کم نہ تھی، قرآن مجید کے فارسی میں ایک دو ترجمے بھی

---

[1] تحفۃ الموحدین صفحہ ۶-۷ مطبوعہ المکتبۃ السلفیۃ، شیش محل روڈ۔ لاہور۔

ترجمے ہوتے تو تعجب کی بات نہ تھی لیکن حسن بن محمد علقمی المشہور بنظام نیشاپوری ثم دولت آبادی کے ترجمہ سے پہلے جو آٹھویں صدی ہجری کے علماء میں تھے کسی فارسی ترجمہ کا سراغ نہیں لگتا نیشاپوری کا یہ فارسی ترجمہ ان کی عربی تفسیر "غرائب القرآن" میں شامل ہے[۱]۔

ہندوستان میں شیخ سعدیؒ کے ترجمہ کے نام سے ایک ترجمہ مشہور تھا، اور اگرچہ وہ بھی شیخ کی مقبول تصنیفات گلستاں اور بوستاں کی طرح رائج اور متداول نہیں تھا لیکن پھر بھی کہیں کہیں پایا جاتا تھا، مگر اس کا انتساب شیخ سعدیؒ کی طرف صحیح نہیں ہے، تحقیقی بات یہ ہے کہ وہ علامہ سید شریف علی الجرجانی (م ۸۱۶ھ) کا کیا ہوا ہے، تفسیر حقانی کے مؤلف مولانا عبدالحق حقانی کا چشم دید بیان ہے کہ :-

"جس کو آج کل جہلاء سعدیؒ کا ترجمہ کہتے ہیں، وہ دراصل سید شریف کا ترجمہ ہے، صاحب مطبع نے میرے سامنے رواج دینے کے لئے سعدیؒ کی طرف منسوب کردیا ہے[۲]۔"

الغرض شاہ صاحب نے سفر حجاز سے واپسی کے پانچ سال بعد (غالباً اصلاح عقائد کی ان کوششوں کا نتیجہ دیکھنے کے بعد جو خصوصی درس و تدریس اور وعظ و ارشاد کے ذریعہ ہو رہی تھیں) یہ فیصلہ کیا کہ ہدایتِ عام، اصلاح عقائد اور اللہ تعالیٰ سے طاقتور رابطہ پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ قرآن مجید کی ہدایت و تعلیمات کی براہ راست اشاعت و تبلیغ سے زیادہ مؤثر نہیں ہو سکتا، اور اس کا ایک ہی طریقہ ہے، اور وہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ اور اس کی اشاعت، خود شاہ صاحب کی زبان سے اس کے محرکات و اسباب

---

[۱] "جائزہ تراجم قرآنی" شائع کردہ مجلس معارف القرآن، دارالعلوم دیوبند، ص ۱۳-۱۴

[۲] البیان فی علوم القرآن مقدمہ تفسیر حقانی از مولانا عبدالحق صاحب حقانی ص ۵۰

اور اس اقدام کی تاریخ سنئے تفسیر فتح الرحمٰنؒ کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:۔

"یہ زمانہ جس میں کہ ہم لوگ موجود ہیں اور یہ ملک جس کے ہم باشندے ہیں اس میں مسلمانوں کی خیر خواہی تقاضا کرتی ہے کہ (ترجمۂ قرآن سلیس اور بامحاورہ فارسی میں بغیر اظہار فضیلت اور عبارت آرائی کے اور متعلق قصوں اور توجیہات کے ذکر کئے ہوئے بغیر) کیا جائے تاکہ عوام و خواص یکساں طور پر سمجھ سکیں اور چھوٹے بڑے سبھی معانی قرآن کا ادراک کر سکیں اس لئے اس اہم کام کا داعیہ فقیر کے دل میں ڈالا گیا، اور اس کے لئے مجبور کیا گیا۔

پہلے ترجموں پر غور کیا گیا تاکہ جس ترجمہ کو معیار کے مطابق پایا جائے اس کی ترویج کی جائے اور یہ ترجمہ حتی الامکان اہل زمانہ کے ذوق کے مناسب ہو، مگر ان ترجموں میں یا تو بے کیف طوالت ہے یا مخل انداز تقصیر و اجمال ہے، اس عرصہ میں زہراوین (سورہ بقرہ و نساء) کا ترجمہ ہو گیا، اس کے بعد سفر حرمین کا اتفاق ہو گیا، اور وہ سلسلہ ختم ہو گیا، کئی سال بعد ایک عزیز ترجمۂ قرآن پڑھنے لگے اور یہ کام اس گزشتہ عزم کا محرک بن گیا، اور یہ فیصلہ ہوا کہ سبق کے بقدر ترجمہ لکھ لیا جائے، جب ثلث قرآن مجید تک ترجمہ ہو گیا، تو ان عزیز کو سفر پیش آگیا اور ترجمہ پھر موقوف ہو گیا، ایک مدت کے بعد پھر ایک تقریب پیدا ہوئی اور وہ پرانا خیال تازہ ہوا اور دو ثلث تک ترجمہ ہو گیا۔

بعض دوستوں کو مسودہ صاف کرنے کے لئے کہا گیا اور یہ کہ اس کے ساتھ متن قرآن بھی لکھ دیں تاکہ مستقل نسخہ تیار ہو جائے، ان سعادت مند دوست نے عید الاضحیٰ سنہ ۱۱۵۰ھ سے تبییض شروع کی اس کے بعد پھر اس عزم کو تحریک ہوئی،

اور اخیر تک ترجمہ مکمل ہوگیا، اور اوائل شعبان میں تسوید ختم ہوئی اور ۱۱۵۱ھ میں سودہ صاف ہوگیا، اور ۱۱۵۶ھ میں برادر دینی عزیز القدر خواجہ محمد امین اکرمہ اللہ تعالیٰ بشہود کے اہتمام سے اس کتاب کی ترویج ہوئی اور اس کا درس شروع ہوا، اور اس کے متعدد نسخے تیار ہوگئے، اور معاصرین اس طرف متوجہ ہوئے ؎

للہ الحمد کہ آں نقش کہ خاطر می خواست
آمد آخر زپس پردۂ تقدیر پدید[1]

شاہ صاحب نے ترجمہ اور تفسیر فتح الرحمٰن کے علاوہ اصول ترجمہ پر ایک مقدمہ بھی لکھا ہے جو مختصر ہونے کے باوجود بڑا بصیرت افروز اور عالمانہ ہے ابتدا میں لکھتے ہیں:۔

"یقول الفقیر الی رحمۃ اللہ الکریم ولی اللہ بن عبد الرحیم ایں رسالہ ایست در قواعد ترجمہ مسماۃ بالمقدمۃ فی قوانین الترجمۃ کہ در وقت تسوید ترجمۂ قرآن قلم بہ ضبط آں جاری شد"[2]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ اور قرآن مجید کی تبلیغ عام کے راستہ میں جو چٹان حائل ہوگئی تھی، شاہ صاحب جیسی عظیم المرتبت ہستی کے (جس کے علمی تبحر، جامعیت، باطنی مرتبے اور اخلاص پر تقریباً اس عہد کے صحیح الخیال اور صاحبِ علم طبقہ کا اتفاق تھا) اقدام سے یہ چٹان ہٹ گئی اور راستہ صاف ہوگیا، اسلام کی تاریخ میں مسلسل ایسا ہوتا رہا ہے کہ کسی مسلّم الثبوت اور بلند شخصیت کے کسی کام کے آغاز کر دینے سے غلط فہمیوں اور

---

[1] دیباچہ فتح الرحمٰن مطبوعہ دہلی ۱۲۹۴ھ۔ [2] مخطوط محفوظ کتب خانہ ندوۃ العلماء مشتمل بر شش صفحات تقطیع کلاں۔

بدگمانیوں کا بادل چھنٹ گیا ہے اور شاہ راہ عام کھل گئی ہے، امام ابوالحسن اشعری کا متکلمانہ مباحث میں حصہ لینا اور عقلی استدلال سے کام لینا، حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کا فلسفہ کا مطالعہ اور اس کی تنقیح و تردید اور ایسے بہت سے اقدامات جو اپنے عہد کی ضرورت کے مطابق اسلام کی حفاظت یا مدافعت میں کئے گئے، اس کی روشن مثالیں ہیں۔

شاہ صاحب کے بعد کے اردو تراجم

شاہ صاحب کے فارسی ترجمہ کے بعد بہت جلد اردو میں ترجمۂ قرآن کی ضرورت محسوس ہوئی کہ بارہویں صدی کے آخری ہی حصہ میں اردو نے فارسی کی جگہ لینی شروع کردی تھی، اور اردو میں تحریر و تصنیف کا کام شروع ہو گیا تھا[1]۔ اس ضرورت اور انقلابِ حال کو سب سے پہلے خود شاہ صاحب کے فرزند ارجمند حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ دہلوی (م ۱۲۳۰ھ) نے محسوس کیا، اور ۱۲۰۵ھ میں گویا شاہ صاحب کے ترجمہ کے پچاس برس بعد انھوں نے بامحاورہ اردو میں اس کا ایسا ترجمہ کیا جس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید کا کسی غیر عربی زبان میں ایسا کامیاب اور شگفتہ ترجمہ جس میں زیادہ سے زیادہ قرآنی الفاظ کی روح آ گئی ہو ابھی تک علم میں نہیں، شاہ صاحبؒ اپنے ترجمہ کی تمہید میں لکھتے ہیں:۔

> "اس بندۂ عاجز عبدالقادر کے خیال میں آیا کہ جس طرح ہمارے بابا صاحب بہت بڑے حضرت شاہ ولی اللہ عبدالرحیم کے بیٹے سب حدیثیں جاننے والے ہندوستان کے رہنے والے نے فارسی زبان میں قرآن کے معنی آسان کر کے لکھے، الحمد للہ کہ

---

[1] ماخوذ از تاریخ نثر اردو از مولوی احسن مارہروی حصہ ۱ صفحہ ۷-۸

یہ آرزو ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء میں حاصل ہوئی۔[1]

شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے بعد انھیں کے برادر بزرگ شاہ رفیع الدین (م ۱۲۳۳ھ) نے قرآن مجید کا تحت اللفظ ترجمہ کیا، جو اپنی احتیاطوں اور مصنف کے علمی تبحر و اخلاص کی وجہ سے بہت مقبول ہوا، اور بعض حلقوں میں شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا بامحاورہ ترجمہ اور بعض حلقوں میں شاہ رفیع الدین صاحبؒ کا تحت اللفظ ترجمہ رائج اور قابل ترجیح قرار پایا۔

یہ دونوں ترجمے مسلمانوں کے گھروں میں ایسے عام ہوئے اور قرآن مجید کی تلاوت کے ساتھ اس کے پڑھنے کا ایسا رواج ہوا جس کی مثال کسی دوسری دینی کتاب کے بارے میں نہیں مل سکتی، جہاں تک اصلاح عقائد اور عقیدۂ توحید کی اشاعت کا تعلق ہے، ان دونوں ترجموں سے فائدہ اٹھانے والوں کی کوئی تعداد نہیں بیان کی جاسکتی کہ وہ لاکھوں سے متجاوز ہوگی، حقیقت میں کوئی اسلامی حکومت بھی اپنے وسائل کے ساتھ دعوت و اصلاح کا اتنا بڑا کام انجام نہیں دے سکتی تھی جو ان تین ترجموں نے انجام دیا، جو ایک ہی شجرۂ طوبیٰ کی شاخیں ہیں "وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ"

اس کے بعد اردو ترجموں کا ایک سیلاب رواں ہوگیا جس کی تعداد کا استقصاء ایک دشوار کام اور مستقل تحقیقی بحثوں کا طالب ہے۔[2]

---

[1] موضح القرآن جلد اول ص۲

[2] اس وقت ہمارے سامنے "جائزۂ تراجم قرآنی" کے نام کی کتاب ہے، اس میں شاہ عبدالقادر صاحبؒ اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ کے ترجموں کے بعد کے جن ترجموں کا جائزہ لیا گیا اور مختصر تعارف کرایا گیا ہے، ان کی تعداد پچپن ہے۔

درس قرآن

قرآن مجید کے ان اردو تراجم کے علاوہ جو اسی خاندان والا شان کے دو برگزیدہ افراد حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ اور حضرت شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے کیے، اور ہندستان میں جہاں جہاں اردو بولی جاتی تھی گھر گھر پڑھے جانے لگے، قرآن مجید کے ذریعہ تطہیر عقائد اور اصلاح اعمال و اخلاق کی سب سے طویل، سنجیدہ و عمیق اور مؤثر و وسیع کوشش خاندانِ ولی اللّٰہی کے سب سے بڑے فرد اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے کاموں کی تکمیل و توسیع کی سعادت حاصل کرنے والے بزرگ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ (م ۱۲۳۹ھ) کے ذریعہ انجام پائی، جنھوں نے تقریباً ۶۲-۶۳ سال تک دہلی جیسے مرکزی شہر اور تیرھویں صدی ہجری جیسے اہم زمانہ میں درس قرآن کا سلسلہ جاری رکھا اُس کو خواص و عوام میں جو مقبولیت حاصل ہوئی، اور اس سے اصلاحِ عقائد کا جو عظیم الشان کام انجام پایا ہمارے علم میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

الفوز الکبیرؒ

دعوت الی القرآن اور خواص و اہل علم کے حلقہ میں تدبر قرآن کی صلاحیت پیدا کرنے اور اس کے ذریعہ سے امت کی اصلاح کا جذبہ بیدار کرنے کے سلسلہ میں شاہ صاحب کی ایک تجدیدی و انقلابی خدمت اور کارنامہ "الفوز الکبیر" کی تصنیف ہے، جو اپنے موضوع پر (ہمارے علم میں پورے اسلامی کتب خانہ میں) منفرد کتاب ہے۔

اصول تفسیر پر کوئی چیز عام طور پر نہیں ملتی صرف چند اصول و قواعد تفاسیر کے

مقدمہ میں یا اپنا طرز تصنیف بیان کرنے کے لیے بعض مصنفین چند سطروں میں لکھ دیتے ہیں؛ شاہ صاحب کی کتاب "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" بھی اگرچہ مختصر ہے لیکن پوری کتاب سراسر نکات و کلیات ہے اور در حقیقت ایک جلیل القدر عالم کی جس کو فہم قرآن کے مشکلات کا علمی تجربہ ہے ایک قیمتی اور نادر بیاض ہے۔

اس کی قدر وہی لوگ جان سکتے ہیں، جن کو ان مشکلات سے واسطہ پڑا ہو بعض بعض اصول جو شاہ صاحب نے اپنے ذوق و وجدان اور فہم قرآن کی بنا پر لکھ دیئے ہیں دوسری کتابوں کے سیکڑوں صفحات کے مطالعہ سے نہیں حاصل ہو سکتے، اسی رسالہ کے مقدمہ میں شاہ صاحب کا یہ فرمانا حرف بحرف صحیح ہے کہ:۔

میگوید فقیر ولی اللہ بن عبد الرحیم	فقیر ولی اللہ بن عبدالرحیم (اللہ ان کے ساتھ
عاملہما اللہ تعالیٰ بلطفہ العظیم چوں	اپنے لطف عظیم کا معاملہ فرمائے) کہتا ہے کہ
بریں فقیر درے از فہم کتاب اللہ	جب اللہ نے اس فقیر پر کتاب اللہ کے
کشادند خواست کہ بعضے نکات	فہم کا دروازہ کھولا تو اس کی خواہش
نافعہ کہ در تدبر کلام اللہ یاراں را	ہوئی کہ بعض مفید نکات (جن سے
بکار آید در رسالہ مختصرے مضبوط	لوگوں کو تدبر قرآن میں مدد ملے گی)
نماید امید واری از عنایت حضرت	ایک مختصر رسالے میں لکھ دیئے جائیں
باری آں است کہ طالب علماں را	عنایت خداوندی سے امید ہے کہ
بہ مجرد فہم ایں قواعد راہے واسع	طالب علموں کے لئے ان قواعد کے
در فہم معانی کتاب اللہ کشادہ گردد کہ	فہم کے بعد فہم مطالب قرآن کی
اگر عمرے در مطالعہ تفاسیر یا گزرانیدن	ایسی کشادہ راہ مل جائے گی کہ اگر

آنہا بر مفسران علی انہم اقل قلیل	مطالعہ تفاسیر اور مفسرین (جن کی
فی ھذا الزمان بسر برند بآں ضبط	تعداد آجکل بہت ہی کم ہے) سے
و ربط بدست نیاند"[1]	رجوع کرنے میں ایک عمر بھی گزاریں گے
	تب بھی فہم قرآن سے ایسا ربط
	وضبط نہ پیدا کر سکیں گے۔

قرآن کے مضامین و مقاصد اس کے طرز و اسلوب کی خصوصیت اور انسانی تالیفات خصوصاً متاخرین کی کتب درسیہ سے اس کے اختلاف و امتیاز اور شانِ نزول کے متعلق چند لفظوں میں جو کچھ لکھا ہے آج اس میں ممکن ہے کوئی ندرت نہ معلوم ہو لیکن بارہویں صدی میں یہ قطعاً نئے خیالات تھے، اور آج بھی کتنے حلقوں میں یہ خیالات نامانوس ہیں، شانِ نزول کی روایتوں کی کثرت اور ان کی اہمیت پر زیادہ زور دینے سے (جو قرون متاخرہ کا شعار بن گیا تھا) قرآن کریم کے مضامین و قصص اور مواعظ وعبر سے ہر زمانہ میں جو فائدہ اٹھایا جانا چاہئے اور اپنے اپنے زمانہ اور حالات پر ان کا جس طرح انطباق ہونا چاہئے، اس میں بڑا فرق ہو گیا تھا شاہ صاحب کی اس تحقیق و تنقیح سے وہ پردہ ہٹ جاتا ہے اور قرآن مجید کا جمالِ جہاں آرا سامنے آجاتا ہے "الفوز الکبیر" کے باب اول میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"عام مفسرین نے ہر ایک آیت کو خواہ مباحثہ کی ہو یا احکام کی ایک قصے کے ساتھ ربط دیا ہے، اور اس قصے کو اس آیت کے لئے سببِ نزول مانا ہے لیکن حق یہ ہے کہ نزولِ قرآنی سے مقصودِ اصلی نفوسِ بشریہ کی تہذیب اور ان کے باطل عقائد اور فاسد اعمال کی تردید ہے، اس لئے آیاتِ مناظرہ کے نزول کے لئے متکلمین میں

---

[1] الفوز الکبیر

عقائد باطلہ کا وجود اور آیات احکام کے لئے ان میں اعمال فاسدہ اور مظالم کا شیوع،
اور آیات تذکیر کے نزول کے لئے ان کا بغیر ذکر آلاء اللہ و ایام اللہ اور موت
و واقعات بعد الموت کے بیدار نہ ہونا، اصلی سبب ہوا، خاص واقعات کو جن کے
بیان کرنے کی عام مفسرین نے زحمت اٹھائی ہے، اسباب نزول میں چنداں دخل
نہیں ہے، مگر سوائے چند آیات کے جن میں کسی ایسے واقعہ کی جانب اشارہ ہے، جو
رسول اللہ ؐ کے زمانے میں یا اس سے پیشتر واقع ہوا ہو۔[1]"

قرآن مجید نے جن فرقوں کی تردید کی ہے، ان کے اصلی اور صحیح خیالات و عقائد اور کمزوریوں کا بیان ان کی گمراہیوں اور غلط فہمیوں کے حقیقی اسباب اور ان کی تاریخ، نفاق کی تشریح اور مسلمانوں کی بعض جماعتوں پر ان کی تطبیق فہم قرآن کی اساس ہے، جو اختصار کے باوجود اس وضاحت کے ساتھ کسی بڑی سے بڑی تفسیر میں نہیں ملے گی۔

نسخ میں متقدمین و متاخرین کے اصطلاحی فرق کی توضیح اور منسوخ و ناسخ آیات میں تطبیق، صحابہ و تابعین کے تفسیری اختلافات کا حل شاہ صاحبؒ کی عمدہ تحقیقات میں سے ہے۔

نحو کے مشہور اور ظاہری قواعد کی بعض آیات سے بظاہر عدم مطابقت کی جو توجیہ شاہ صاحب نے کی ہے، اس کی قدر وہ لوگ کر سکتے ہیں، جو نحو کی تدوین کی تاریخ سے واقف اور بصرہ و کوفہ کے دبستان کے اختلافات پر نظر رکھتے ہیں، رسالہ کا بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس کو پڑھ کر ادیان سابقہ، فرق ضالہ اور اقوام و ملل کی پرانی بیماریوں اور کمزوریوں کی نشاندہی ہوتی ہے، اور اس کی توفیق ملتی ہے کہ قرآن کے آئینہ میں مسلمانوں کی نسلیں اور اپنے اپنے عہد کا مسلم معاشرہ اور طبقات امت اپنا چہرہ دیکھیں اور اس کی فکر کریں کہ مذاہب و فرق کی سابقہ بیماریاں اور کمزوریاں دبے پاؤں ان میں تو

---

[1] الفوز الکبیر باب اول ص۲۳

داخل نہیں ہوگئی ہیں :-

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ (سورۂ انبیاء ۱۰)	ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا تذکرہ ہے کیا تم نہیں سمجھتے۔

مسئلہ توحید کی علمی تنقیح و تحقیق

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اصلاح عقائد اور توحید خالص کی دعوت کے سلسلہ میں قرآن مجید کے ترجمہ اور درس قرآن ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ایک عالم و محقق کے انداز سے اس کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا، عقیدۂ توحید ملت ابراہیمیؑ کا سب سے بڑا شعار اور حضرت ابراہیمؑ کی دعوت اور جدوجہد کا سب سے بڑا مقصد خاتم الرسل صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کی بنیاد اور ابتدا اور انتہا تھی، سارا قرآن اور احادیث کا دفتر اور سیرت نبویؐ اس پر شاہد ہے آپ نے توحید و شرک کے درمیان ایسا خطِ امتیاز کھینچا، توحید کی حقیقت کو اس طرح عیاں کیا، شرک کے ادنیٰ سے ادنیٰ شائبہ اور اس کی ہلکی سے ہلکی پرچھائیں کے خلاف ایسا جہاد کیا، امت کے عقائد میں شرک کے داخل ہو جانے اور عقائد میں فتور واقع ہونے کے ذرائع کا ایسا سدِباب کیا جس سے زیادہ کا تصور ممکن نہیں[1]، یہ سب حقائق ایسے متواتر اور بدیہی ہیں، جن کے لئے دلائل اور مثالوں کی ضرورت نہیں، جس کی قرآن و حدیث پر ذرا بھی نظر ہے،

---

[1] قبور کی تشیید ان پر اجتماعات اور اعیاد کے اہتمام، سجدۂ تعظیمی، حلف بغیر اللہ کی ممانعت کے احکام، ایک بدو کے اِنْ شَاءَ اللّٰهُ وَشِئْتَ اگر اللہ چاہے اور آپ چاہیں، کہنے پر سخت ناگواری اور یہ فرمانا کہ تو نے مجھے خدا کا، سر بنا دیا؟ نہیں تنہا جو اللہ چاہے اور ایسی ہی بیسیوں مثالیں اس بات کی شاہد ہیں۔

وہ اس کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

پھر اس امت میں قرونِ مشہود لہا بالخیر کے گزرنے، نئے نئے ملکوں کے فتح ہونے، وہاں کی آبادی کے قبول اسلام، غیر مسلم اقوام کی مخالطت و مجاورت اور مرورِ زمانہ کے اثر سے عوام کے ایک بڑے طبقہ میں یہ مشرکانہ عقائد و اعمال کہاں سے داخل ہو گئے، اور ان کو توحید کے بہت سے شعائر و علامات کے ساتھ مسلم معاشرہ میں اپنی جگہ بنا لینے کا کیسے موقع مل گیا اور بہت سے مدعیانِ علم کو ان کی تاویل اور توجیہ کی اور ان کو گوارہ کرنے اور جائز قرار دینے کی جرأت کیسے ہوئی، اور بہت سے پڑھے لکھے مسلمان کیسے اس مغالطہ کے شکار ہو گئے؟

شاہ صاحبؒ کے نزدیک اس کی وجہ توحید کی حقیقت اور مشرکین جاہلیت اور اہل عرب کے خدا کے خالقِ کائنات اور مدبرِ امورِ عظام ہونے کے بارے میں عقیدہ کو صحیح طور پر نہ سمجھنا ہے، عوام کے ایک بڑے طبقہ نے شرک کی حقیقت یہ سمجھی کہ کسی ہستی کو (خواہ وہ زندہ ہو یا فوت شدہ) خدا کا بالکل ہمسر اور ہم پایہ بنا لیا جائے، خدا کی تمام صفات اور افعال اس کی طرف منسوب کئے جائیں، اسی کو خالق، رازق، اور مُحیی و مُمیت (زندہ کرنے والا اور مارنے والا) حقیقتاً و اصالتاً سمجھ لیا جائے، باقی اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کا اس کے کسی مقبول بندہ کی طرف منسوب کرنا اور بعض افعال کا (جو خدا کے ساتھ مخصوص ہیں) ان سے صدور ماننا، قدرت کے بعض کارخانوں کا ان سے متعلق ہو جانا، اور اللہ کا اپنی مرضی سے اپنے بعض اختیارات ان کے سپرد کر دینا، یہ توحید کے منافی اور شرک کے مرادف نہیں، اسی طرح کسی کی محض تقرب الی اللہ اور شفاعت عند اللہ کے لئے ایسی حد سے بڑھی ہوئی تعظیم کرنا اور ان کے ساتھ ایسے اعمال و حرکات سے پیش آنا جو عبادت کے حدود میں داخل ہیں، داخلِ شرک نہیں کہ یہ محض رضائے خداوندی کے حصول کا ایک ذریعہ اور اس بارگاہ بے چون و بے چگوں تک

پہونچنے کا (جس کے یہاں معمولی بشر کی رسائی نہیں) ایک مفید اور مؤثر طریقہ ہے کفار عرب کہتے تھے :۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۚ (الزمر۔۳)

(وہ کہتے ہیں کہ) ہم ان کو اس لئے پوجتے ہیں کہ ہم کو خدا کا مقرب بنادیں۔

یہ وہ مغالطہ اور التباس تھا جس کی وجہ سے اس امت کے بھی کثیر التعداد افراد شرک کی ارض ممنوعہ میں جا پڑے تھے اور اس سرحدی لکیر کو پار کر گئے تھے جو توحید و شرک کی حد فاصل (LINE OF DEMARCATION) ہے اس لئے سب سے پہلی اور اہم ضرورت یہ تھی کہ معلوم کیا جائے کہ اہل جاہلیت اور مشرکین عرب کا عقیدہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں کیا تھا، وہ اس کی ذات و صفات کے بارے میں کن کن چیزوں کے قائل تھے اللہ تعالیٰ کو فاطرِ کائنات، خالق ارض و سماوات، اور قادرِ مطلق سمجھنے کے باوجود اللہ کے رسول نے ان کو کیوں مشرک گردانا، اور قرآن نے ان کے مشرک ہونے کا کیوں اعلان کیا ؟

شاہ صاحبؒ اپنی بے نظیر کتاب "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" میں لکھتے ہیں :۔

"شرک یہ ہے کہ ماسوا اللہ کے لئے ان صفات کو ثابت مانا جائے جو خدا تعالیٰ کے ساتھ مختص ہوں، مثلاً عالم کے اندر تصرفاتِ ارادی جس کو کُنْ فیکون سے تعبیر کرتے ہیں، یا علم ذاتی جس کا اکتساب نہ حواس کے ذریعہ سے ہو نہ عقل کی رہنمائی سے اور نہ خواب اور الہام وغیرہ کے واسطہ سے، یا مریضوں کو شفا دینا یا کسی شخص پر لعنت کرنا اور اس سے ناراض ہونا جس کے باعث اس کو تنگ دستی اور بیماری اور شقاوت گھیر لیں یا رحمت بھیجنا جس سے اس کو فراخ دستی، تندرستی اور سعادت حاصل ہو۔

مشرکین بھی جواہر (اجسام) اور عظیم الشان امور کے پیدا کرنے میں کسی کو
خدا تعالیٰ کا شریک نہیں جانتے تھے، ان کا اعتقاد تھا کہ جب خدا تعالیٰ کسی کام
کے کرنے کا ارادہ کرلیتا ہے تو کسی میں اس کے روکنے کی قدرت نہیں ہے، ان کا
شرک فقط ایسے امور کی نسبت تھا جو کہ بعض بندوں کے ساتھ مخصوص تھے،
ان لوگوں کا گمان تھا کہ جیسے شاہان عظیم القدر اپنے مقربان خاص کو ملک کے
مختلف حصوں کا فرماں روا مقرر کرتے ہیں، اور بعض امور خاصہ کے فیصل کرنے
میں (جب تک کوئی شاہی حکم صریح موجود نہ ہو) ان کو مختار بنا دیتے ہیں، اور
اپنی رعایا کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خود انتظام نہیں کرتے اور اپنی کل رعایا کو
حکام کے سپرد کر دیتے ہیں، اور حکام کی سفارش ان کے ماتحت ملازمین اور متوسلین
کے حق میں قبول کی جاتی ہے، ایسے ہی بادشاہ علی الاطلاق جل مجدہٗ نے بھی
اپنے خاص بندوں کو رتبۂ الوہیت کے خلعت سے سرفراز کیا ہے، اور ایسے
لوگوں کی رضامندی و ناراضی دوسرے بندوں کے حق میں مؤثر ہے اس لئے
وہ ان بندگان خاص کے تقرب کو ضروری خیال کرتے تھے، تاکہ بادشاہ حقیقی کی
درگاہ میں مقبولیت کی صلاحیت پیدا ہو جائے اور جزائے اعمال کے وقت
ان کے حق میں شفاعت درجۂ قبولیت حاصل کرے، اور ان خیالی ضرورتوں
کو دیکھتے ہوئے وہ لوگ ان کو سجدہ کرنا اور ان کے لئے قربانی کرنا اور ان کے
نام کی قسم کھانا، اور ضروری امور میں ان کی قدرت کن فیکون سے مدد لینا
جائز سمجھتے تھے، انھوں نے پتھر، پیتل اور سیسہ وغیرہ کی مورتیں بنا کر ان
(بندگان خاص) کی روحوں کی طرف متوجہ ہونے کا ایک وسیلہ قرار دیا تھا،

لیکن رفتہ رفتہ جہلاء نے ان پتھروں ہی کو اپنا اصلی معبود سمجھنا شروع کر دیا اور غلط عظیم واقع ہوا۔[۱]

نیز حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:۔

"شرک کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کسی ایسے شخص کے بارے میں جو قابلِ تعظیم سمجھا جاتا ہے، یہ عقیدہ رکھے کہ اس سے جو غیر معمولی افعال و واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں، وہ اس بناء پر ہیں کہ وہ شخص صفات کمال میں سے کسی ایسی صفت کے ساتھ متصف ہے، جس کا مشاہدہ نوع انسانی کے افراد میں نہیں ہوا، وہ صفت واجب الوجود جلّ مجدہٗ کے ساتھ مخصوص ہے اس کے سوا کسی میں نہیں پائی جاتی، اس کی چند ہی شکلیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ وہ واجب الوجودؔ اپنے کسی مخلوق کو خلعت الوہیت سے سرفراز کرے، یا وہ مخلوق ذات الٰہی میں فنا ہو کر باقی باللہ بن کر رہ جائے، یا اسی طرح کی کوئی شکل جو اس عقیدہ کے حامل نے اپنی طرف سے گڑھ لی ہو، حدیث میں مشرکین کے جس تلبیہ (حج میں لبّیک لبّیک کہنا) کے الفاظ نقل کئے گئے ہیں وہ اسی عقیدہ کا ایک نمونہ اور اس کی مثال ہے، حدیث میں آتا ہے کہ مشرکین عرب (جاہلیت میں اور اسلام قبول کرنے سے پہلے) ان لفظوں میں لبیک کہتے تھے:

لبیک لبیک لاشریک لک،	خدایا! حاضر ہوں، حاضر ہوں!
إلاّ شریکاً ھولک، تملکہ	تیرا کوئی شریک نہیں، سوائے اس
وماملک۔	شریک کے جو تیرا بندۂ خاص ہے تو

---

[۱] الفوز الکبیر ماخوذ از ترجمہ مولوی رشید احمد صاحب انصاری صـ۸۰

اس کا بھی مالک ہے اور اس کی مملوکات

کا بھی مالک۔

اسی بناء پر یہ معتقد اس ہستی کے لئے (جس کو وہ خدا کے بعض صفات کا حامل اور

خلعت الوہیت سے سرفراز سمجھتا ہے) اپنے انتہائی تذلل اور فروتنی کا اظہار کرتا

ہے اور اس کے ساتھ وہ معاملہ کرتا ہے، جو بندوں کو خدا کے ساتھ کرنا چاہئے[1]"

حجۃ اللہ البالغہ میں ایک دوسری جگہ مشرکین کے شرک کی حقیقت بیان کرتے ہوئے اور اس بات کی وضاحت فرماتے ہوئے کہ اللہ تبارکؐ تعالیٰ کے بارے میں ان کے اور مسلمانوں کے درمیان (جو صحیح عقیدہ کے حامل ہیں) کئی باتوں پر اتفاق تھا، مشرکین عرب وجود باری اور اس کی یگانہ شان اور قدرت مطلقہ کے منکر نہیں تھے، صرف بعض صفات اور اختیارات میں وہ (خدا ہی کی مرضی اور منشا سے) اس کے بعض مقربین و محبوبین کو شریک اور صاحب اختیار سمجھتے تھے اور اس لئے ان کے ساتھ عبودیت اور بندگی کا معاملہ کرتے تھے باب التوحید کے عنوان کے ماتحت تحریر فرماتے ہیں:۔

"مشرکین اس بارے میں مسلمانوں کے ہم خیال اور ہم عقیدہ تھے کہ امور عظام

کے سرانجام اور جس چیز کا اللہ تعالیٰ فیصلہ فرما لیں اور اس کا ارادہ قطعی ہو جائے

تو اس میں کسی غیر کا اختیار باقی نہیں رہتا، باقی دوسرے امور میں انھوں نے

مسلمانوں سے الگ راستہ اختیار کیا تھا، ان کا خیال تھا کہ زمانۂ ماضی کے صلحاء

نے عبادت کی کثرت کی اور خدا کا قرب حاصل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو الوہیت

کا خلعت عطا فرمایا، اس بناء پر وہ خدا کے دوسرے بندوں کی عبادت کے

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۶۱ باب اقسام الشرک۔

مستحق بن گئے، جیسے شہنشاہ کا کوئی (مزاج داں) غلام بادشاہ کی خدمت کا حق ادا کرے تو شہنشاہ اس کو بادشاہی کا خلعت عطا فرماتا ہے، اور اپنے ملک کے کسی شہر کا انتظام اس کے سپرد کر دیتا ہے، تو اس طرح وہ شہر کے باشندوں کی سننے اور بات ماننے کا مستحق ہو جاتا ہے، وہ اس بات کے قائل تھے کہ خدا کی بندگی جب ہی قبول ہو سکتی ہے، جب ایسے مقبول اور برگزیدہ بندوں کی غلامی بھی اس میں شامل ہو، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں سے اس قدر بالا و برتر ہے کہ براہ راست اس کی عبادت کچھ کارگر اور اس کی وہاں رسائی نہیں ہے، ضروری ہے کہ ان مقربان بارگاہ الٰہی کی عبادت کی جائے، تاکہ وہ اللہ تک پہونچا دیں، وہ کہتے تھے کہ یہ (مقربین) سنتے، دیکھتے اور اپنے بندوں کی سفارش کرتے ہیں، اور ان کے معاملات کا انتظام کرنے اور ان کی مدد کرتے ہیں، انھوں نے ان کے ناموں پر پتھر تراشے، اور ان کو اپنا قبلۂ توجہ بنا لیا، بعد میں وہ لوگ آئے جو ان بتوں اور جن کے نام پر یہ بت تھے، ان کے درمیان فرق کو نہیں سمجھ سکے، اور انھوں نے ان کو بذات خود معبود سمجھ لیا۔[1]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"مشرکین عرب اس کے قائل تھے کہ اللہ تعالیٰ کا آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں کوئی شریک نہیں، اسی طرح ان دونوں کے درمیان جو اجسام و اشیاء ہیں ان کی خلقت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں، نیز اہم امور کے سرانجام میں بھی کسی کی شرکت نہیں، اس کے فیصلہ کو کوئی ٹالنے والا، اور اس کے حکم قطعی کو کوئی

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ۔ ج ۱ ص ۵۹ باب التوحید۔

روکنے والا نہیں، اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ط — اگر تم ان مشرکین سے پوچھو کہ آسمان وزمین کس نے پیدا کیا تو وہ یقیناً کہیں گے کہ اللہ نے۔ (لقمٰن ۔ ۲۵)

قرآن خود شہادت دیتا ہے کہ یہ مشرکین خدا کو مانتے تھے اور اس سے دعا بھی کرتے تھے۔

بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ . (الانعام ۔۴۱) — بلکہ اسی سے مانگتے ہو۔

نیز فرماتا ہے:۔

ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ . — اسی سے دعا کرنا کام بناتا ہے، دوسروں سے دعا بیکار جاتی ہے۔ (الاسراء ۔ ٦٧)

حقیقت میں ان مشرکین کی گمراہی اور بے دینی یہ تھی کہ ان کا اعتقاد تھا کہ کچھ فرشتے اور ارواح ہیں جو (بڑے امور کو چھوڑ کر) اپنے پرستار کے ان جزئی وضمنی معاملات کو سنبھال لیتے ہیں، اور ان کا کام کر دیتے ہیں، جن کا تعلق اس کی ذات، اولاد، اموال واملاک سے ہے، ان کے نزدیک ان کا خدا کے ساتھ ایسا ہی تعلق ہے جیسے کسی نازپروردہ غلام کا شہنشاہ سے، اور سفارشیوں اور مصاحبوں کا باجبروت بادشاہ سے ہوتا ہے، شرائع الٰہی میں جو کہیں اس بات کا تذکرہ آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کام بعض فرشتوں کے سپرد کر دیئے ہیں، یا یہ کہ مقربین کی دعائیں قبول ہوتی ہیں، ان جاہلوں نے اسی کو بنیاد بنا کر ان کو ایسا صاحب اختیار وصاحب تصرف مان لیا، جیسے خود بادشاہ بنفس نفیس ہوتے ہیں، حالانکہ یہ قیاس الغائب علی الشاہد تھا، اور اسی سے ساری خرابی

پیدا ہوئی۔[1]

اسی طرح شاہ صاحبؒ نے عوام اور خواص مشابہ بعوام کے بہت سے مشرکانہ عقائد واعمال کی جڑ پکڑ لی اور اس مغالطہ کا پردہ چاک کیا، جس کی وجہ سے بہت سے جہلاء اور مدعیان علم ان اعمال و رسوم، شعائر شرک، نذر و ذبح لغیر اللہ، بزرگوں کے نام پر روزے رکھنے، اولیاء و صالحین سے دعا و التجا، خوف و رجا، استمداد و استعانت، ان کے مقامات دفن اور ان سے نسبت رکھنے والی چیزوں کی حرم شریف اور بیت اللہ کی طرح تعظیم کرنے اور ان کے لئے انھیں آداب کو مرعی رکھنے، ان کے جزئی تصرف فی الکائنات، انسان کی شقاوت و سعادت، مرض و صحت، فراخی رزق و تنگی میں مؤثر ہونے کے عقیدۂ مشرکانہ میں گرفتار اور "فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ"[2] پر عمل کرنے، اور انابت و اخبات، توکل علی اللہ اور انقطاع الی اللہ کی جیسی بیش بہا دولت سے محروم تھے، اور جن کے بعض احوال سن کر اور اعمال دیکھ کر بے اختیار قرآن مجید کی آیت یاد آتی تھی:۔

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ	اور یہ اکثر خدا پر ایمان نہیں رکھتے مگر
إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ (یوسف۔۱۰۶)	(اس کے ساتھ) شرک کرتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ اور ان کے اخلاف کا اگر اس عقیدۂ توحید کی تجدید، اس کی تنقیح و توضیح اس کی اشاعت و ترویج اور اس کے سلسلہ کی غلط فہمیوں کے رفع کرنے کے سوا کوئی کارنامہ نہ ہوتا، تو تنہا یہی کارنامہ ان کو مجددین امت میں شمار کرنے کے لئے کافی تھا، چہ جائیکہ ان کے اور متعدد کارنامے ہیں، جن کی آئندہ صفحات میں وضاحت کی جائیگی۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ باب ما کان علیہ حال أهل الجاهلية فاصلحه الله ج ۱ صـ۱۲۵

[2] الزمر-۲

عقائد کی تفہیم و تشریح کتاب و سنت کی روشنی میں اور صحابہؓ و سلف کے مسلک کے مطابق

شاہ صاحبؒ کے اس بنیادی تجدیدی کارنامہ کے ماسوا جس کا تعلق عامۃ المسلمین اور پورے مسلم معاشرہ سے تھا، اور جس کے بغیر ہدایت و نجات مشتبہ اور نصرت و تائید الٰہی محال تھی، ایک ضمنی، علمی و اصلاحی کارنامہ یہ تھا کہ آپ نے عقائد کی تشریح و تفہیم کا کام کتاب و سنت کی روشنی میں انجام دیا اور اس بارے میں صحابہؓ اور سلف کے مسلک و ذوق کے مطابق عمل کرنے کی دعوت دی، اور خود اس کا آغاز کر کے اس کا علمی نمونہ پیش کیا، عالم اسلام کے علمی حلقوں کو عرصہ سے ایسے نابغۂ روزگار مفکرین اور پابند نصوص مجتہدین کی ضرورت تھی، جو فلسفہ اور فلسفیوں کے آراء و نظریات سے (جن کا خود علم کلام پر پورا اثر پڑ چکا تھا) آنکھیں ملا کر بات کریں، قرآن پر اس طرح ان کا ایمان ہو، جس طرح وہ نازل ہوا، خدا تعالیٰ کے صفات و افعال کو وہ بغیر کسی تحریف و تاویل کے ویسا ہی مانتے ہوں جیسا وہ خود ان کے بارے میں فرماتا ہے، اور ان حقائق کی ایسی تفسیر کرتے ہوں جن کا ایک طرف علم و دلائل شرعی مؤید ہوں، دوسری طرف عقل و منطق بھی ان کو تسلیم کرتے ہوں، یہ دانش کدۂ قرآنی، اور دبستان علوم نبویؐ سے فیض پانے والے علمائے حق ہی ہو سکتے تھے، جو علوم حکمت اور متکلمانہ موشگافیوں سے پوری طرح واقف ہونے کے ساتھ عقائد میں کتاب اللہ اور سنتِ متواترہ کے پابند تھے، اور خدا تعالیٰ پر انھیں صفات کے ساتھ ایمان و عقیدہ رکھتے تھے، جو اس نے اپنی کتاب میں بیان فرمائی ہیں، ایک حدیث میں علمائے حق کی جو تعریف آئی ہے، وہ ان پر پورے طور پر صادق تھی۔

ینفون عن ھذا الدین تحریف — وہ غالی لوگوں کی تحریف، باطل پرستوں

الغالین، وانتحال المبطلین — کے غلط انتساب اور جاہلوں کی تاویلات

وتاویل الجاھلین[1] — سے دین کی حفاظت کرتے ہیں۔

ان حمائے اسلام سے کوئی دور خالی نہیں رہا، ان نمایاں شخصیتوں میں آٹھویں صدی ہجری کے عالم جلیل شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ حرّانی (م ۷۲۸ھ) ان کے بعد ان کے تلمیذ رشید علامہ ابن قیم جوزیہ صاحبِ "زاد المعاد" (م ۷۵۱ھ) اور اس مسلک پر چلنے والے بعض دوسرے جلیل القدر علماء ہیں، جن کی فہرست زیادہ طویل نہیں۔

امام ابن تیمیہؒ کے بعد اگر اس سلسلہ میں کسی کا نام پورے اعتماد کے ساتھ لیا جا سکتا ہے، اور اس کا کام اہل علم کے سامنے ہے تو وہ حضرت شاہ ولی اللہؒ ہیں، وہ عقائد کی تشریح و تفہیم اور اس کو سلف کے فہم و مسلک کے مطابق پیش کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے، اس لئے کہ انھوں نے ایک طرف یونانی فلسفہ کا گہرا اور وسیع مطالعہ کیا تھا، اور علم کلام کا پورا سرمایہ ان کی نظر کے سامنے بلکہ ان کی دسترس میں تھا، دوسری طرف وہ قرآن کے دقیق النظر مفسر، علم حدیث کے ماہر خصوصی اور اسرار و مقاصد شریعت کے راز داں تھے، اس لئے وہ "تفظیت" اور "تاویل" کے درمیان راہ اعتدال پر قائم ہیں، ان کی کتاب "العقیدۃ الحسنۃ"[2] مطالعہ کی گہرائی

---

[1] بروایت بیہقی، حدیث کے الفاظ یوں ہیں: "یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عنہ تحریف الغالین الخ"۔ [2] یہ کتاب "العقیدۃ الحسنۃ" کے نام سے فارسی میں مطبع مفید عام آگرہ سے طبع ہوئی، دار العلوم ندوۃ العلماء کے فاضل استاد تفسیر مولانا محمد اویس ندوی نگرامی مرحوم نے اس کو اپنی شرح و مفید حواشی کے ساتھ (جو خود شاہ صاحبؒ کی دوسری تصنیفات سے ماخوذ ہیں) اس کو "العقیدۃ السنیۃ" کے نام سے مرتب کیا، اور راقم سطور کے مقدمہ کے ساتھ مطبع دار العلوم ندوۃ العلماء سے ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی، مصنف کی کتاب "العقیدۃ والعبادۃ والسلوک" اور اس کے (باقی ص ۱۶۵ پر)

اور عبارت کی سلاست و روانی دونوں کی جامع ہے، یہ کتاب علم توحید (جس کو عام طور پر علم کلام سے موسوم کیا جاتا ہے) کا ایک ایسا متن ہے، جس میں اہل سنت کے عقائد کا وہ لُبِ لباب آگیا ہے، جس سے ہر اس تعلیم یافتہ مسلمان کو واقف ہونا چاہیئے، جو اپنے تئیں اہل سنت میں شمار کرتا ہو، اور ان کے عقائد کو اپنا شعار بنانا چاہتا ہو۔

شاہ صاحبؒ اپنے رسالہ "وصایا" میں (جو فارسی زبان میں ہے) لکھتے ہیں:۔

اول وصیت ایں فقیر چنگ زدن	اس فقیر کی پہلی وصیت یہ ہے کہ
است بکتاب و سنت در اعتقاد	اعتقاد و عمل میں کتاب و سنت کو
و عمل، پیوستہ بتدبیر ہر دو مشغول	مضبوط ہاتھوں سے تھاما جائے
شدن ...... و در عقائد مذہب	اور ہمیشہ ان پر عمل کیا جائے،
قدماء اہل سنت اختیار کردن	عقائد میں متقدمین اہل سنت کے
وآں از تفصیل و تفتیش انچہ سلف	مذہب کو اختیار کیا جائے اور
تفتیش نکردند اعراض نمودن	(صفات و آیات متشابہات)
و بہ تشکیکات خام معقولیان	کے سلسلہ میں سلف نے جہاں تفصیل
التفات نکردن[1]۔	و تفتیش سے کام نہیں لیا، ان سے
	اعراض کیا جائے اور معقولیانِ خام

(باقی ص۱۶۴ کا) ترجمہ "دستورحیات" میں اس کا خلاصہ آگیا ہے" "تفہیمات" میں "العقیدۃ الحسنۃ" کا مضمون پورا آگیا ہے، غالباً اسی سے لے کر اس کو علیحدہ رسالہ کی شکل میں شائع کیا گیا (ملاحظہ ہو "التفہیمات الإلٰھیۃ" ج ۱ ص۱۲۸-۱۴۴) [1] شاہ صاحبؒ نے اس رسالہ کا نام جو فارسی میں ہے "المقالۃ الوضیۃ فی النصیحۃ والوصیۃ" رکھا تھا، یہ شاہ صاحبؒ کے بعض دوسرے رسائل کے مجموعہ میں بھی شامل ہے۔

کی تشکیکات کی طرف التفات

نہ کیا جائے۔

شاہ صاحب کے اسماء وصفات کے بارے میں ذوق ومسلک کا کسی قدر اندازہ

اس اقتباس سے ہوگا جو یہاں پیش کیا جاتا ہے:۔

خدا اس سے بالا اور برتر ہے کہ وہ عقل یا حواس سے دریافت ہو سکے، یا اس میں صفتیں اس طرح موجود ہوں کہ جس طرح عوارض جوہر میں ہو کر پائے جاتے ہیں، یا وہ اس طرح ہوں جن کو عام عقلیں ادراک کر سکیں یا متعارف الفاظ ان کو ادا کر سکیں، بااینہمہ یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں کو بتا بھی دیئے جائیں، تاکہ جہاں تک انسانیت کی تکمیل ہو سکتی ہے ہو جائے، ایسی حالت میں اس سے چارہ نہیں کہ ان صفتوں کا استعمال ان معنوں میں کیا جائے کہ ان کے نتائج اور لوازم سمجھ لئے جائیں مثلاً ہم خدا کے لئے "رحمت" ثابت کرتے ہیں، اس سے مقصود احسانات کا فیضان ہے، دل کی خاص کیفیت نہیں (جس کو اصل میں رحمت کہتے ہیں) اسی طریقہ سے خدا کی وسعتِ قدرت کے اظہار کے لئے مجبوراً ہم کو وہ الفاظ استعارۃً استعمال کرنے پڑیں گے جو انسانوں کی قدرت وقوت کے لئے بولے جاتے ہیں، کیونکہ ان معانی کے ادا کرنے کے لئے ہمارے پاس اس سے بہتر الفاظ نہیں اور اسی طرح تشبیہاً بہت سے الفاظ بولے جائیں گے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ان سے حقیقی معنی مراد نہ ہوں، بلکہ وہ معانی جو خدا کی ذات کے لائق اور مناسب ہیں...... تمام آسمانی مذاہب کا اس پر اتفاق ہے کہ صفات اسی طریقہ پر

بولے گئے ہیں، اور اس پر کہ یہ الفاظ اسی طرح بولے جائیں، اور اس کے علاوہ کوئی اور بحث و کاوش نہ کی جائے، اور یہی مذہب اس زمانہ کا تھا جس کے خیر و برکت کی شہادت دی گئی ہے، (یعنی تبع تابعین کے عہد تک) اس کے بعد کچھ ایسے لوگ مسلمانوں میں پیدا ہو گئے، جنھوں نے بغیر کسی نصِ قطعی اور دلیلِ مستحکم کے ان مسائل میں فکر و کاوش شروع کر دی۔[1]"

صدیوں سے عالمِ اسلام میں بالخصوص ان ملکوں میں جو علمی، عقلی اور درسی طور پر ایران کے زیرِ اثر تھے، جن متکلمانہ موشگافیوں، صفات کی دور از کار تاویلات جن سے نتیجۃً وہ معطّل اور بے معنی بن کر رہ جاتی ہیں، اور فلسفۂ یونان سے ذہنی غلامی کی حد تک مرعوبیت کا دور دورہ تھا، اور سلف کے متعلق ان کا خیال استخفاف تک پہونچا ہوا تھا، جو بہت احتیاط و انصاف سے کام لیتے تھے وہ کہتے تھے "مذهب السلف أسلم ومذهب الخلف اعلم" (سلف کے مسلک میں احتیاط اور خلف کی تحقیقات میں علم کی شان ہے) اس پسِ منظر میں شاہ صاحبؒ کی یہ خدمت و جرأت ایک مجتہدانہ اور مجددانہ کارنامہ ہے۔

اسماء و صفات کے بارے میں سلف کے مسلک کی تائید، فلاسفہ متکلمین سے (جنھوں نے دور از کار تاویلات سے کام لیا اور ان کے اقوال صفات کے بارے میں وہ تعطیل و نفیِ صفات کے حدود کو چھوتے ہوئے بعض اوقات نظر آتے ہیں) عدمِ مناسبت اور حدیث و سنت کی محبت و تعظیم نے ان کو شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی طرف سے دفاع اور ان کی جلالتِ شان کے اعتراف پر آمادہ کیا، جن کی ذات ان آخری صدیوں میں بڑی متنازع فیہ بلکہ

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ۔ جلد اول ص۶۳ باب الایمان بصفات اللہ۔ ترجمہ منقول از رسالہ اہل السنۃ والجماعۃ (مولانا سید سلیمان ندوی ص۲۴-۲۵)

مطاعن اور شبہات کا ہدف بن گئی تھی، شاہ صاحبؒ نے بڑے بلند الفاظ میں ان کی تعریف فرمائی، اور ان کی طرف سے دفاع کیا، وہ "تفہیمات الٰہیہ" میں فرماتے ہیں:۔

ولیس شئ منها الا ومعه دلیله	شیخ الاسلام کے اقوال میں کوئی چیز
من الکتاب والسنة وآثار السلف	ایسی نہیں ہے جس کے لئے ان کے پاس
فمثل هذا الشیخ عزیز الوجود	کتاب وسنت اور آثار سلف میں سے
فی العالم، ومن یطیق أن	کوئی دلیل نہ ہو، ایسا عالم دنیا میں
یلحق شأوه فی تحریره وتقریره	عزیز الوجود ہے، کون ایسا شخص ہے،
والذین ضیقوا علیه ما بلغوا	جو تحریر وتقریر میں ان کے مرتبہ کو
معشار ما آتاه الله تعالیٰ۔[1]	پہونچنے کی قابلیت رکھتا ہو، جن
	لوگوں نے ان پر اعتراضات کی بوچھار
	کی ہے ان کو ان کے کمالات کا
	دسواں حصہ بھی نصیب نہیں۔

---

[1] جلاء العینین صـ۲۶ بحوالہ تفہیمات الٰہیہ۔

بابِ ششم

حدیث و سنت کی اشاعت و ترویج، اور فقہ و حدیث میں تطبیق کی دعوت و سعی

حدیث کی اہمیت اور ہر ملک و ہر دور میں اس کی ضرورت

ہندوستان کے تحتی براعظم، بلکہ حقیقتاً دورِ آخر میں (جو بارہویں صدی ہجری کے وسط سے شروع ہو کر اس وقت تک قائم ہے) شاہ صاحبؒ نے حدیث کی ترویج و اشاعت درسِ حدیث کے احیاء، فنِ حدیث کے ساتھ اعتناء، اور اس موضوع پر اپنی محققانہ و بصیرانہ تصنیفات کے ذریعہ ایسا عظیم تجدیدی کارنامہ انجام دیا جو ان کے صحیفۂ تجدید اور کتابِ زندگی کا ایک اہم اور روشن باب ہے، اور جو ان کے دوسرے علمی کمالات اور دینی خدمات پر ایسا غالب آیا کہ "محدّث دہلویؒ" ان کے نام کا جزء اور ان کے تعارف کا عنوان بن گیا، اور زبان و قلم پر "حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ" جاری اور ساری ہو گیا۔

لیکن اس کارنامہ کی تاریخ اور تفصیل بیان کرنے سے پہلے اس کارنامہ کی عظمت سمجھنے کے لئے، اس کی ضرورت ہے کہ پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ حدیث، دین شریعت کے نظام، اسلام کو اپنی صحیح شکل میں باقی رکھنے کی کوششوں، اور اسلامی مزاج و ماحول کی

تشکیل وحفاظت میں کیا حیثیت رکھتی ہے؟ اس کی اشاعت وحفاظت ہر دور اور ہر ملک میں (جہاں مسلمان آباد ہوں) کیوں ضروری ہے، اور اس سے تغافل، جہل یا انکار کن خطرات کا حامل اور کیسے عظیم نقصانات کو اپنے جلو میں لئے ہوئے ہے، اس علم کا کسی عہد یا ملک سے ختم یا فراموش ہو جانا کون سا خلاء پیدا کرتا ہے، جو کسی اور چیز سے پُر نہیں ہو سکتا، اس کی وضاحت کے لئے مصنف اپنے ہی ایک رسالہ کا ایک اقتباس پیش کرے گا، جس میں اس حقیقت کو پورے طور پر واضح اور ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے[۱]۔

حدیث امت کے لئے صحیح میزان ومعیار

"حدیث نبویؐ ایک ایسی صحیح میزان ہے، جس میں ہر دور کے مصلحین ومجددین اس امت کے اعمال وعقائد، رجحانات وخیالات کو تول سکتے ہیں اور امت کے طویل تاریخی وعالمی سفر میں پیش آنے والے تغیرات وانحرافات سے واقف ہو سکتے ہیں، اخلاق واعمال میں کامل اعتدال وتوازن اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک قرآن وحدیث کو بیک وقت سامنے نہ رکھا جائے، اگر

---

[۱] یہ رسالہ جس کا نام عربی میں "دور الحدیث فی تکوین المناخ الاسلامی وصیانتہ" ہے اور اردو میں اس کا ترجمہ "اسلامی مزاج وماحول کی تشکیل وحفاظت میں حدیث کا بنیادی کردار" کے نام سے شائع ہوا ہے، حقیقتاً وہ مضمون ہے جس سے مصنف نے ۱۴۰۱ھ کے رابطہ عالم اسلامی کے دورِ محاضرات کا مکہ معظمہ میں افتتاح کیا، اور وہ مضمون ۱۶ ذی قعدہ ۱۴۰۱ھ (۱۳ ستمبر ۱۹۸۱ء) کو مکہ معظمہ میں اہل علم کے ایک مجمع کے سامنے پڑھا گیا۔ انگریزی میں بھی یہ رسالہ ROLE OF HADITH IN THE PROMOTION OF ISLAMIC CLIMATE & ATTITUDES کے نام سے مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی طرف سے شائع ہو گیا ہے۔

حدیث نبوی کا وہ ذخیرہ نہ ہوتا جو معتدل، کامل و متوازن زندگی کی صحیح نمائندگی کرتا ہے، اور وہ حکیمانہ نبوی تعلیمات نہ ہوتیں اور یہ احکام نہ ہوتے جن کی پابندی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلامی معاشرہ سے کرائی تو یہ امت افراط و تفریط کا شکار ہو کر رہ جاتی، اور اس کا توازن برقرار نہ رہتا، اور وہ عملی مثال نہ موجود رہتی جس کی اقتداء کرنے کی خدا تعالےٰ نے اپنے اس قرآن میں ترغیب دی ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب-۲۱)

یقیناً تمہارے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اسوۂ حسنہ ہے۔

اور یہ فرما کر آپ کے اتباع کی دعوت دی ہے:-

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ (آل عمران-۳۱)

آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہیں اللہ سے محبت ہے تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا، اور تمہارے گناہ معاف کردے گا۔

یہ ایک ایسا عملی نمونہ ہے جس کی انسانوں کو ضرورت ہے، اور جس سے وہ زندگی اور قوت و اعتماد حاصل کر سکتا ہے، اور یہ اطمینان کر سکتا ہے کہ دینی احکام کا زندگی پر نفاذ نہ صرف آسان، بلکہ ایک امر واقعہ ہے۔

حدیث نبوی زندگی، قوت، اور اثر انگیزی سے بھرپور ہے، اور ہمیشہ اصلاح و تجدید کے کام، فساد اور خرابیوں اور بدعتوں کے خلاف صف آرا، اور برسرِ جنگ ہونے اور معاشرہ کا احتساب کرنے پر ابھارتی رہی ہے، اور اس کے اثر سے ہر دور اور ہر ملک میں

ایسے افراد پیدا ہوتے رہے، جنھوں نے اصلاح و تجدید کا جھنڈا بلند کیا، کفن بردوش ہو کر میدان میں آئے، اور بدعتوں و خرافات اور جاہلی عادتوں سے کھلی جنگ کی اور دین خالص اور صحیح اسلام کی دعوت دی، اسی لئے حدیث نبوی امت اسلامیہ کے لئے ایک ناگزیر حقیقت اور اس کے وجود کے لئے ایک لازمی شرط ہے اس کی حفاظت، ترتیب و تدوین، حفظ اور نشر و اشاعت کے بغیر امت کا یہ دینی و ذہنی، عملی و اخلاقی دوام و تسلسل برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔

تاریخ اسلام میں اصلاح و تجدید کی تحریکیں علم حدیث سے وابستہ ہیں

سنت نبوی اور حدیث نبوی کے مجموعے ہمیشہ اصلاح و تجدید اور امت اسلامیہ میں صحیح اسلامی فکر کا سرچشمہ رہے ہیں، انھیں سے اصلاح کا بیڑا اٹھانے والوں نے تاریخ کے مختلف دوروں میں صحیح علم دین اور خالص فکر اسلامی اخذ کیا، انھیں احادیث سے انھوں نے استدلال کیا اور دین و اصلاح کی دعوت میں وہی ان کی سند اور ان کا ہتھیار اور سپر تھی، بدعتوں، فتنوں اور شر و فساد سے جنگ و مقابلہ کے معاملہ میں وہی قوت محرکہ و دافعہ تھی، آج جو بھی مسلمانوں کو دین خالص اور اسلام کامل کی طرف آنے کی پھر دعوت دینا چاہتا ہے، اور ان کے اور نبوی زندگی اور کامل اسوہ کے درمیان تعلق استوار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور جس کو بھی ضرورت اور زمانہ کے تغیرات نئے احکام کے استنباط کرنے پر مجبور کرتے ہیں، وہ اس سرچشمہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

اس حقیقت پر اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی حدیث و سنت کی

کتابوں سے مسلمانوں کے تعلق اور واقفیت میں کمی آئی، اور طویل مدت تک یہ کمی باقی رہی تو داعیوں اور اخلاق کی تربیت؛ نفوس کا تزکیہ کرنے والے روحانی مربیوں کی کثرت؛ دنیا میں زہد اختیار کرنے اور کسی حد تک سنت پر عمل کرنے کے باوجود۔ اس مسلم معاشرہ میں جو علوم اسلامیہ کے ماہرین؛ اور فلسفہ و حکمت کے اساتذۂ فن اور ادباء و شعراء سے مالامال تھا، اور اسلام کے قوت و غلبہ اور مسلمانوں کی حکمرانی میں زندگی گذار رہا تھا، نت نئی بدعتوں؛ عجمی رسم و رواج، اور اجنبی ماحول کے اثرات نے اپنا تسلّط قائم کر لیا، یہاں تک کہ اندیشہ ہونے لگا کہ وہ جاہلی معاشرہ کا دوسرا ایڈیشن اور اس کا مکمل عکس بن جائیگا، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی پیشین گوئی اور حدیث حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔

لتتبعنّ سنن من کان قبلکم شبرًا بشبرٍ و ذراعًا بذراعٍ ۔ (مستدرک حاکم)	تم پچھلی امتوں کے راستوں پر قدم بقدم چلوگے۔

اس وقت اصلاح کی آواز خاموش اور علم کا چراغ ٹمٹمانے لگا۔

دسویں صدی ہجری میں ہندوستان کے دینی حالات اور مسلمانوں کی زندگی کا جائزہ لیجیے؛ جبکہ برصغیر ہند کے علمی و دینی حلقوں کا حدیث شریف اور سنت کے صحیح مآخذ و مراجع سے تعلق تقریبًا منقطع ہو گیا تھا، علم دین کے مراکز، اور حجاز و یمن، مصر و شام کے ان مدارس سے جہاں حدیث شریف کا درس ہوتا تھا کوئی رابطہ نہ تھا، اور کتب فقہ، اصول اور ان کی شروح اور فقہی باریکیوں اور موشگافیوں اور حکمت و فلسفہ کی کتابوں کا عام چلن تھا، تو بآسانی دیکھا جا سکتا ہے کہ کس طرح بدعتوں کا دور دورہ تھا، منکرات عام ہو گئے تھے، اور عبادتوں اور تقرب الی اللہ

کی کتنی نئی شکلیں اور نئے طریقے ایجاد کرلئے گئے تھے۔

راقم الحروف نے "تاریخ دعوت وعزیمت" کے حصہ چہارم میں دسویں صدی ہجری کے ایک مشہور ومقبول شیخ طریقت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کی کتاب "جواہر خمسہ" کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"گجرات کو مستثنیٰ کر کے جہاں علمائے عرب کی تشریف آوری، اور حرمین شریفین کی آمد ورفت کی وجہ سے حدیث کی اشاعت ہو چکی تھی اور علامہ علی متقی برہان پوری اور ان کے نامور شاگرد علامہ محمد طاہر پٹنی پیدا ہوئے تھے (دسویں صدی ہجری میں ہندوستان صحاح ستہ اور ان مصنفین کی کتابوں سے نا آشنا تھا، جنھوں نے نقد حدیث اور رد بدعت کا کام کیا، اور سنت صحیحہ اور احادیث ثابتہ کی روشنی میں زندگی کا نظام اسلامی پیش کیا، ہندوستان کے ان مقامی روحانی فلسفوں و تجربوں کا اثر اپنے زمانہ کے مشہور ومقبول شطاری بزرگ شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کی مقبول کتاب "جواہر خمسہ" میں دیکھا جا سکتا ہے جس کی بنیاد زیادہ تر بزرگوں کے اقوال اور اپنے تجربات پر ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحیح احادیث کے ثابت ہونے یا معتبر کتب شمائل وسیر سے اخذ کرنے کو ضروری نہیں سمجھا گیا، اس میں نماز احزاب، صلوٰۃ العاشقین، نماز تنویر القبر اور مختلف مہینوں کی مخصوص نمازیں اور دعائیں ہیں، جن کا حدیث وسنت سے کوئی ثبوت نہیں ہے۔[1]"

یہ صرف "جواہر خمسہ" کی خصوصیت نہیں، بزرگوں کے ملفوظات کے غیر مستند مجموعوں میں اس کی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں، مشائخ کے لئے سجدۂ تعظیمی کا

---

[1] تاریخ دعوت وعزیمت حصہ چہارم ص ۲۴۳

عام رواج تھا، قبروں کو کھلے طریقہ پر سجدہ گاہ بنا لیا گیا تھا، ان پر چراغ جلائے جاتے تھے، چادریں چڑھائی جاتی تھیں، ان کے گرد و پیش کا ادب حرم کی طرح کیا جاتا تھا، عرس و فاتحہ کے نام سے طرح طرح کے جشن منائے جاتے تھے، جن میں بہت بڑی تعداد عورتوں کی ہوتی تھی، صلوٰۃ غوثیہ، صلوٰۃ معکوس، نذر لغیر اللہ اولیاءؒ و صلحاء کے نام پر، اور ان کی رضامندی کی نیت سے ذبح و قربانی، غیر اللہ کے نام پر روزہ، اور ایسی کتنی بدعات (جن کے حدود شرک سے مل جاتے تھے) مقبول عام و خاص تھیں، اولیاء و صالحین کے ایام پیدائش و وفات پر جلسے کئے جاتے تھے، اور میلے لگتے تھے۔

اگر علمائے اسلام کی دسترس میں کتب حدیث نہ ہوتیں، اور سنتوں و بدعتوں میں تفریق و امتیاز کا یہ معتبر و سہل ذریعہ نہ ہوتا تو شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (م ۷۲۸ھ) کے عہد سے حکیم الاسلام شاہ ولی صاحب (م ۱۱۷۶ھ) کے عہد تک مصلحین امت اور دین خالص کے مبلغین کا یہ سلسلہ وجود میں نہ آتا، اور مصلحین روزگار اور تصحیح عقائد و اصلاح رسوم کے علمبردار نظر نہ آتے۔

دسویں اور گیارہویں صدی ہجری میں افغانستان (کابل و ہرات و غزنی) کے علماء کے حالات پڑھئے، اور ان کی تصنیفات دیکھئے، حمایت سنت اور رد بدعت، علمی تحقیق اور مسائل کی تنقیح کا رنگ بہت کم نظر آئیگا، دفعۃً علامہ ملا علی قاری (علی بن سلطان محمد ہروی م ۱۰۱۴ھ) کی شخصیت سامنے آتی ہے، جنھوں نے حجاز جا کر وہاں کے محدثین عظام اور اساتذہ کبار سے کتب حدیث کا درس لیا، اور اس میں کمال پیدا کیا، کتب حدیث و فقہ کی شرح، مسائل کی

ترجیح، اور اپنے زمانہ کی بعض بدعات کی بلا رُورعایت تردید میں ان کا یہ مصلحانہ ومحققانہ رنگ صاف جھلکتا ہے، ان کو ان کے مطالعہ وتحقیق، اور حق گوئی اور انصاف پسندی نے اس مقام تک پہونچا دیا کہ انھوں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی حمایت کی، اور اس کی شہادت دی کہ وہ اکابر اہل سنت وجماعت اور اولیائے امت میں سے تھے[1]، یہی حال متعدد عرب ممالک عراق، شام، مصر، تونس، الجزائر، مراکش وغیرہ کا ہے[2]!

علم حدیث اور عرب

فلسفۂ تاریخ اسلام کا یہ نکتہ ہے کہ جن ملکوں میں اسلام عربوں کے ذریعہ سے پہونچا، وہاں حدیث کا علم بھی اسلام کے ساتھ پھیلا اور پھلا پھولا کہ اس کو عربوں کے مزاج، ان کی قوت حفظ، ان کی عملیت، حقیقت پسندی، اور ذات نبوی سے گہری وابستگی سے خاص مناسبت تھی، وہ جہاں گئے اپنے ساتھ علم حدیث بھی لیتے گئے، اور ان کی قیادت کے دور اور اثر ونفوذ کے حلقہ میں اس کے ساتھ پورا اعتنا کیا گیا، اور اس کے درس اور اس کے مختلف پہلوؤں پر تصنیف وتالیف کا سلسلہ پوری سرگرمی سے جاری رہا، یمن، حضرموت، مصر وشام، عراق، شمالی افریقہ اور اندلس (اسپین) جیسے ملکوں کا یہی حال ہے، خود ہندوستان میں صوبۂ گجرات اس کی ایک مثال ہے، جس نے شیخ علی متقی برہان پوری (صاحب کنز العمال) (م ۹۷۵ھ) اور شیخ محمد طاہر پٹنی (صاحب مجمع بحار الانوار) (م ۹۸۶ھ) جیسے بلند پایہ محدث پیدا کئے، اس کی وجہ وہی ہے، جو ہم نے اوپر بیان کی کہ گجرات کا تعلق حجاز مقدس سے دوسرے صوبوں کے

---

[1] مرقاۃ شرح مشکوۃ ج ۴ ص ۲۷ [2] رسالہ حدیث کا بنیادی کردار ص ۳۸-۳۵

مقابلہ میں زیادہ رہا، اور وہاں علمائے عرب کی آمد و رفت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

لیکن جن ملکوں میں اہل عجم کے ذریعہ اسلام پہونچا وہاں کا یہ حال نہیں ، ہندوستان میں ترکی النسل یا افغانی النسل خاندانوں نے حکومتیں قائم کیں اور ان مشائخ اور داعیانِ اسلام کے ذریعہ اسلام کی تبلیغ اور اشاعت ہوئی جن میں بیشتر عجمی نژاد اور ایران و ترکستان کے باشندے تھے پھر جب ہندوستان میں درس و تدریس، مدارس کے قیام اور نصاب کی ترتیب کا زمانہ آیا، تو اس پر عجمی فضلاء اور "دانشمندان ایران" کا پورا اثر پڑ چکا تھا، باب اول میں بتایا جا چکا ہے کہ ایران میں صفوی حکومت کے قیام اور شیعیت کے سرکاری مذہب ہو جانے کے بعد سے (جو دسویں صدی ہجری کے ابتداہی کا واقعہ ہے) ایران کا (جس نے ایوان حدیث کے اہم ستون پیدا کئے تھے) حدیث سے رشتہ ٹوٹ چکا تھا، اس لئے اس کے ذریعہ سے ہندوستان میں علم حدیث کی اشاعت اور اس کی اہمیت و عظمت قائم ہونے کا کوئی امکان نہ تھا، اس کے برعکس جس قدر اس کا اثر ہندوستان کے علمی حلقوں پر گہرا ہوتا جاتا تھا، حدیث سے بے اعتنائی بڑھتی جاتی تھی، بارہویں صدی ہجری جس میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا ظہور ہوا، اس کا نقطہ ارتقا تھا۔

ہندوستان میں علم حدیث کا عروج و زوال

ہندوستان میں علم حدیث کے عروج و زوال کا جائزہ لینے کے لئے ہم یہاں مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ کی کتاب "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں، جس میں سیکڑوں صفحات کے مطالعہ کا نچوڑ آگیا ہے :۔

"جب سندھ میں عربوں کی حکومت ختم ہوگئی اور ان کے بجائے غزنوی اور

غوری سلاطین سندھ پر قابض ہوئے اور خراسان اور ماوراء النہر سے سندھ میں علماء آئے تب علم حدیث اس علاقہ میں کم ہوتا گیا یہاں تک کہ معدوم ہوگیا، اور لوگوں میں شعر و شاعری، فن نجوم، فن ریاضی اور علوم دینیہ میں فقہ و اصولِ فقہ کا رواج زیادہ ہوگیا، یہ صورت حال عرصہ تک قائم رہی یہاں تک کہ علمائے ہند کا خاص شغلہ یونانی فلسفہ رہ گیا اور علم تفسیر و حدیث سے غفلت بڑھ گئی، مسائل فقہیہ کے سلسلہ سے جو تھوڑا سا تذکرہ کتاب و سنت میں آجاتا تھا بس اسی مقدار پر قانع تھے، فن حدیث میں امام صغانی کی مشارق الانوار کا رواج تھا، اگر کوئی شخص اس فن میں زیادہ ترقی کرتا تھا تو امام بغوی کی مصابیح السنۃ یا مشکوٰۃ پڑھ لیتا تھا، اور ایسے شخص کے بارے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ محدث ہوگیا، اور یہ سب محض اس لئے تھا کہ لوگ عام طور پر ہندوستان میں اس فن کی اہمیت و مرتبت سے ناواقف تھے، وہ لوگ اس علم کی طرف سے بالکل غافل تھے، نہ اس علم کے ائمہ کے حال سے واقف تھے اور نہ اس علم کا ان کے درمیان کوئی چرچا تھا، محض تبرکاً مشکوٰۃ شریف پڑھا کرتے تھے، ان کے لئے سب سے زیادہ سرمایہ علم فقہ کی تحصیل تھا، اور وہ بھی تقلید کے طور پر تحقیق کے طور پر نہیں، اسی وجہ سے اس زمانہ میں فتاوے اور روایات فقہیہ کا رواج بڑھ گیا تھا نصوص محکمات متروک ہوگئی تھیں، مسائل فقہیہ کی صحت کو کتاب و سنت سے جانچنا اور فقہی اجتہادات کو احادیث نبویہ سے تطبیق دینے کا طریقہ متروک ہوگیا تھا۔

پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہندوستان میں اس علم کی اشاعت کا

انتظام فرمایا، دسویں صدی ہجری میں بعض علماء ہندوستان آئے اور ان کے ذریعہ یہ علم ہندوستان میں رواج پذیر ہوا، مثلاً

شیخ عبدالمعطی مکی بن حسن بن عبداللہ باکثیر متوفی باحمدآباد ۹۸۹ھ۔

شہاب احمد مصری بن بدرالدین، متوفی باحمدآباد ۹۹۲ھ۔

شیخ محمد فاکہی ۱ بن احمد بن علی متوفی باحمدآباد ۹۹۲ھ۔

شیخ محمد مالکی مصری بن محمد عبدالرحمٰن متوفی باحمدآباد ۹۱۹ھ۔

شیخ رفیع الدین چشتی شیرازی متوفی باکبرآباد ۹۵۴ھ۔

شیخ ابراہیم بغدادی بن احمد بن حسن۔

شیخ ضیاء الدین مدنی مدفون کاکوری ضلع لکھنؤ۔

شیخ بہلول بدخشی، خواجہ میرکلاں ہروی متوفی باکبرآباد ۹۸۱ھ۔

اور بہت سے علمائے کرام۔

ہندوستان کے کچھ علمائے کرام نے حرمین شریفین کا سفر اختیار فرمایا، اور وہاں انھوں نے فن حدیث شریف حاصل کیا، اور اس فن کو لے کر ہندوستان واپس تشریف لائے اور عرصہ دراز تک گجرات میں درس حدیث دیتے رہے، پھر دوبارہ حجاز ہجرت کر گئے، شیخ یعقوب بن حسن کشمیری متوفی ۱۰۰۳ھ، شیخ جوہر کشمیری متوفی ۱۰۲۶ھ، شیخ عبدالنبی گنگوہی بن احمد، شیخ عبداللہ سلطان پوری بن شمس الدین، شیخ قطب الدین عباسی گجراتی، شیخ احمد بن اسماعیل مانڈوی، شیخ راجح بن داؤد گجراتی، شیخ علیم الدین مانڈوی، شیخ معمر ابراہیم بن داؤد مانیپوری مدفون باکبرآباد، شیخ محمد بن طاہر بن علی پٹنی مصنف "مجمع بحارالانوار"

سید عبدالاول حسینی بن علی بن العلاء الحسینی اور دوسرے علمائے کرامؒ[1]:

مصنف "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند" آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا کارنامہ

"اس کے بعد فن حدیث کی نشر و اشاعت کے لئے اللہ تعالیٰ نے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ بن سیف الدین بخاری متوفی ۱۰۵۲ھ کو منتخب فرمایا، ان کے ذریعہ علم حدیث کی اشاعت بہت عام ہوئی، انھوں نے دارالسلطنت دہلی میں مسند درس آراستہ فرمائی، اور اپنی ساری کوشش و صلاحیت اس علم کی نشر و اشاعت پر صرف فرمائی، ان کی مجلس درس سے بہت سے علماء نے فن حدیث کی تکمیل کی اور بہت سی کتابیں بھی فن حدیث میں تصنیف فرمائیں، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اس علم کی نشر و اشاعت میں بڑی جد و جہد کی، ان کی ذات اور ان کے علم سے اللہ کے بندوں کو بہت نفع پہونچا، فن حدیث کی نشر و اشاعت میں ان کی جدّ و جہد اور کوششیں اپنے پیشروؤں سے اس قدر نمایاں و ممتاز رہیں کہ لوگوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ فن حدیث کو ہندوستان میں سب سے پہلے لانے والے یہی شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ہیں، حالانکہ جیسا میں نے اوپر بتلایا تاریخی حیثیت سے یہ بات صحیح نہیں ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے بعد ان کے صاحبزادہ شیخ نورالحق متوفی ۱۰۷۳ھ نے اس علم کی خدمت اور نشر و اشاعت کا بیڑا اٹھایا، اور ان کے بعض تلامذہ

---

[1] اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں، ص ۱۹۵-۱۹۶

اور اولاد نے بھی اس فن کی خدمت کی ہے مثلاً شیخ الاسلام شارح بخاری اور
شیخ نور الحق کے صاحبزادہ مولانا سلام اللہ مصنف محلّیٰ وکمالین۔[۱]

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے صحیح لکھا ہے کہ:-

"بہر حال حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے جس وقت مسند درس بچھائی تھی، اس وقت شمالی ہندوستان میں حدیث کا علم تقریباً ختم ہو چکا تھا، انھوں نے اس تنگ و تاریک ماحول میں علوم دینی کی ایسی شمع روشن کی کہ دور دور سے لوگ پروانوں کی طرح کھنچ کر ان کے گرد جمع ہونے لگے، درس حدیث کا ایک نیا سلسلہ شمالی ہندوستان میں جاری ہو گیا، علوم دینی خصوصاً حدیث کا مرکز ثقل گجرات سے منتقل ہو کر دہلی آ گیا۔"[۲]

ایک مُجدد کی ضرورت

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے صدق و اخلاص اور برکت انفاس سے حدیث کی طرف توجہ شروع ہوئی اور انھوں نے اس کے درس و مطالعہ تدریس اور شرح و تحشیہ کا ایک نیا ذوق اور ایک نئی تحریک پیدا کر دی، امید تھی کہ ان کے جانشین و افراد خاندان جو اپنی اپنی جگہ پر محدث، مدرس اور صاحبِ تصنیف تھے اس سلسلہ کو اس طرح جاری رکھیں گے کہ اس فن شریف کو ہندوستان کے نظامِ تعلیم، نصابِ درس اور علمی و تصنیفی سرگرمیوں میں شایانِ شان مقام حاصل ہوگا، خود ان کے صاحبزادہ گرامی قدر علامہ مفتی نور الحق دہلوی (م ۱۰۷۳ھ) جنھوں نے صحیح بخاری کی فارسی میں چھ جلدوں میں شرح لکھی اور شمائل ترمذی

---

[۱] اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں، صفحہ ۱۹۷-۱۹۸ [۲] حیات شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ صفحہ ۲۴۳

پر بھی ان کی شرح ہے اس سلسلہ میں ان کے شروع کئے ہوئے کام کی تکمیل فرما سکتے تھے، لیکن غالباً عہدۂ قضا کی وجہ سے جس پر وہ اکبر آباد (آگرہ) جیسے مرکزی شہر میں فائز تھے ان کو زیادہ درس و تدریس و اشاعت علم حدیث کا موقع نہیں مل سکا، ان کے نبیرہ مولانا شیخ الاسلام دہلویؒ بھی بڑے محدث تھے، جن کی صحیح بخاری پر فارسی میں بسوط شرح ہے۔

لیکن بعض معلوم اور بعض نامعلوم اسباب کی بناء پر ان حضرات کی انفرادی مساعی سے ہندوستان میں حدیث کی طرف وہ رجوع عام اور اس کی اشاعت و درس و تدریس میں وہ جوش و سرگرمی نہیں پیدا ہوئی جس کی توقع تھی، شاید اس وجہ سے بھی کہ ان حضرات پر حدیث کے ذریعہ مذہب حنفی کی تائید کا جذبہ و رجحان غالب تھا، دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ بارہویں صدی کے وسط ہی میں تعلیم و تعلم کا مرکز نقل دہلی سے لکھنؤ منتقل ہو رہا تھا، اور وہاں استاد العلماء ملا نظام الدین سہالوی (م ۱۱۶۱ھ) کے بابرکت اور طاقتور ہاتھوں سے نئے نصاب کی تشکیل ہو رہی تھی، اس نصاب کے واضعین و مصنفین کا علمی رابطہ حرمین شریفین اور ان مقامات سے قائم نہیں ہو سکا تھا، جو حدیث کے درس و تدریس و خدمت و اشاعت کے مرکز تھے، اور ان پر (جیسا کہ درس نظامی کی تاریخ اور کتب سوانح و تذکرہ سے ظاہر ہوتا ہے) علوم حکمت اور علوم دینیہ میں سے اصول فقہ کا غلبہ تھا۔

بہرحال ہندوستان کا علمی و دینی حلقہ ایک ایسی شخصیت کا منتظر اور محتاج تھا، جو حدیث سے عشق و فریفتگی کا تعلق رکھتی ہو اور اس کے نشر و اشاعت کو اس نے اپنی زندگی کا مقصدِ اوّلین قرار دیا ہو، ہندوستان کو یہ شخصیت بارہویں صدی کے وسط میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی ذات میں حاصل ہوئی جنھوں نے صحیح معنی میں اس شعر پر عمل کیا۔ ع

ما آنچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم　　الا حدیث دوست کہ تکرار می کنیم

مصنف "الثقافة الاسلامية فی الهند" نے ان حضرات کا تذکرہ کرنے کے بعد جنھوں نے گیارہویں اور بارہویں صدی کے اوائل میں ہندوستان میں علم حدیث کی نشر و اشاعت میں حصہ لیا، اور اپنے درس و تصنیف سے بڑے حلقہ کو فیض پہونچایا حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی خدمت حدیث کا ذکر کیا، جو اس ملک ہی میں نہیں اس دور آخر میں تجدیدی و اجتہادی شان اور احیاء کا رنگ رکھتی ہے' اور جس سے اس ملک میں حدیث کا سکۂ رائج الوقت کی طرح چلن ہو گیا' وہ نصاب درس کا ضروری جزء اور معیار فضیلت قرار پائی، درس حدیث کے مستقل حلقے قائم ہوئے' مدارس میں صحاح ستہ کے درس بالخصوص کتب اربعہ بخاری، مسلم، ابوداؤد و ترمذی کو تحقیق کے ساتھ پڑھنے کا رواج ہوا، (جو اب عرب ممالک میں بھی مفقود ہے) شروح حدیث کا دور شروع ہوا' اور دیکھتے ہی دیکھتے اس پر ایک وسیع و عظیم کتب خانہ تیار ہو گیا، جس کی مثال ممالک عربیہ میں بھی نظر نہیں آتی،[1] کتب حدیث کے تراجم ہوئے' جن سے عامۃ المسلمین اور غیر عربی دانوں کو نیز مسلمان خواتین کو بیش بہا فائدہ پہونچا، اور عمل کی تحریک اور اتباع سنت کا شوق ہوا، اجازت حدیث اور سند کا شوق ہوا، اور ہندوستان اس فن شریف کا ایسا مرکز بن گیا کہ مصر کے جلیل القدر عالم علامہ سید رشید رضا مدیر "المنار" کے قلم سے حسب ذیل الفاظ نکلے:۔

ولولا عناية إخواننا علماء الهند — اگر ہمارے بھائیوں علمائے ہندوستان نے

---

[1] شاہ صاحب کی تعلیم و تربیت اور دعوت و تحریک کے اثر سے ہندوستان میں حدیث کے اساتذہ، شارحین و مصنفین کی جو جماعت کثیر پیدا ہوئی، اور اس کے نتیجہ میں حدیث اور علوم حدیث پر جو عظیم کتب خانہ وجود میں آیا' اس کی وسعت اور تنوع کا اندازہ کرنے کے لئے ملاحظہ ہو مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ کی کتاب "الثقافة الاسلامية فی الهند" باب ثانی کی فصل رابع "مصنفات أهل الهند فی الحديث" ص ۱۳۲-۱۰۲، یا اس کا اردو ترجمہ "اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں" از مولانا ابوالعرفان ندوی شائع کردہ دارالمصنفین۔ اعظم گڑھ۔

بعلوم الحديث في هذا العصر	اس زمانہ میں علوم حدیث کے ساتھ
لقضي عليها بالزوال من أمصار	اعتناء نہ کیا ہوتا تو مشرقی ممالک میں
الشرق، فقد ضعفت في مصر	مکمل طور پر ان کا زوال ہو چکا ہوتا،
والشام والعراق والحجاز منذ القرن	اس لئے کہ مصر، شام، عراق و حجاز
العاشر للهجرة، حتى بلغت	میں دسویں صدی ہجری ہی سے ان میں
منتهى الضعف في أوائل هذا	ضعف پیدا ہو گیا تھا، جو اس چودھویں
القرن الرابع عشر[1]	صدی ہجری کے اوائل میں اپنی انتہا کو
	پہونچ گیا۔

حدیث کے بارے میں شاہ صاحبؒ کے خیالات وجذبات

شاہ صاحبؒ کے لئے کون سا جذبہ اس علم کے ساتھ اشتغال، پھر اس کی نشر واشاعت کی سرگرمی اور اس کے لئے اپنی زندگی اور صلاحیتیں وقف کردینے کا محرک ہوا، اس کو معلوم کرنے کے لئے خود شاہ صاحبؒ ہی کی تحریرات کی طرف رجوع کرنا چاہئے کہ یہ ان کے خیالات کا صحیح آئینہ ہے "حجۃ اللہ البالغہ" کے مقدمہ کے پہلے ہی صفحہ پر لکھتے ہیں:۔

إن عمدة العلوم اليقينية	علوم یقینیہ کا معتمد علیہ سرمایہ و سرتاج
ورأسها، ومبنى الفنون الدينية	اور فنونِ دینیہ کی اصل و اساس
وأساسها، هو علم الحديث	علمِ حدیث ہے جس میں افضل المرسلین
الذي يذكر فيه ما صدر من	صلے اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل

[1] مقدمہ "مفتاح کنوز السنۃ"

أفضل المرسلين صلى الله عليه
وآله وسلم واصحابه اجمعين
من قول أو فعل أو تقرير، فهي
مصابيح الدجى ومعالم الهدى
وبمنزلة البدر المنير، من
انقاد لها ووعى فقد رشد واهتدى
وأوتي الخير الكثير، ومن أعرض
وتولى فقد غوى وهوى،
وما زاد نفسه الا التخسير، فانه
صلى الله عليه وآله وسلم نهى
وأمر، وأنذر وبشر، وضرب
الأمثال وذكر، وإنها لمثل
القرآن أو أكثر۔[1]

یا کسی بات پر آپ کے سکوت و رضامندی
کا ذکر ہوتا ہے، اس لئے یہ حدیثیں
تاریکی میں روشن چراغ، رشد و ہدایت
کا سنگِ میل اور بدر کامل کا حکم رکھتی
ہیں، جو شخص ان پر عمل پیرا ہوتا اور
ان کی نگہداشت کرتا ہے تو وہ
ہدایت یاب اور خیر کثیر سے فیض یاب
ہوتا ہے اور جو بدبخت اس سے
اعراض و روگردانی کرتا ہے وہ گمراہ
اور ہلاک ہوتا ہے، اور اپنا ہی نقصان
کرتا ہے، اس لئے کہ آنحضرت صلے اللہ
علیہ وسلم کی زندگی امر و نہی، انذار و تبشیر
اور نصیحت و تذکیر سے معمور ہے، اور
آپ کی حدیثوں میں یہ چیزیں قرآن ہی
کی طرح یا اس سے (مقدار میں) کچھ
زیادہ ہی ہیں۔

ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:-

اول چیزے کہ عقل آن را بخودش

پہلی چیز جس کو عقل اپنے اوپر

له مقدمہ حجۃ اللہ البالغہ ص ۲

واجب میگرود آنست کہ تتبع اخبار آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم دربیان احکام الٰہی و پیروی آن اخبار بدل وجوارح باید نمود زیراکہ کلام در شخصے است کہ تصدیق کردہ است بتکلیف اللہ تعالےٰ عبادخود را باحکام، و قصد خروج از عہدۂ تکلیف مصمم ساختہ۔[1]

واجب قرار دیتی ہے یہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے حالات وارشادات کا تتبع کیا جائے کہ آپؐ نے احکام الٰہی کے بارے میں کیا ارشاد فرمایا اور کس طرح ان پر عمل کیا، پھر قلب وجوارح سے ان اقوال واحوال کی پیروی کی جائے اس لئے کہ ہماری گفتگو اس شخص کے بارے میں ہے جس نے یہ حقیقت تسلیم کرلی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں کو اپنے احکام کا مکلّف بنایا ہے اور اس شخص نے تکلیف شرعی کی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کا عزم مصمم کرلیا ہے۔

ہندوستان میں علم حدیث سے بے اعتنائی کا شکوہ

شاہ صاحبؒ کے لئے ہندوستان میں علم حدیث کے احیاء اور اشاعت وترویج کا دوسرا محرک ہندوستان کی وہ صورت حال تھی جس کا ذکر کتاب کے باب دوم میں تفصیل سے

[1] کلمات طیبات صـ۱۷۲

گزر چکا ہے، دینی حلقوں پر بدعات، رسوم جاہلیت، غیر مسلموں کی تقلید اور غیر اسلامی شعائر اختیار کرنے کا دھواں چھایا ہوا تھا جس کے اندر سے اصل اسلام کی صورت زیبا دیکھنی مشکل تھی، علمی و درسی حلقوں پر یونان سے آئے ہوئے یونانی علوم جن کو وہ "فنون دانشمندی" کہتے تھے، اور علوم آلیہ اور فنون بلاغت، اور علم کلام کا غلبہ تھا، اور دونوں حلقوں میں علوم شرعیہ بالخصوص علم حدیث بار نہیں پانے پاتا تھا، اگر علوم دینیہ کی طرف توجہ بھی ہوتی تھی تو معاملہ فقہ اور اصول فقہ اور اس کی موشگافیوں سے آگے نہیں بڑھنے پاتا تھا، اس صورت حال کو دیکھ شاہ صاحب فرط تاثر اور شدت تأسف میں لکھتے ہیں:۔

"میں ان طالبان علم سے کہتا ہوں جو اپنے آپ کو علماء کہتے ہیں کہ اللہ کے بندو! تم یونانیوں کے علوم کے طلسم اور صرف و نحو و معانی کے دلدل میں پھنس کر رہ گئے، تم نے سمجھ لیا کہ علم اسی کا نام ہے، حالانکہ علم یا تو کتاب اللہ کی آیت محکم ہے یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ثابتہ، تمہیں چاہیئے تھا کہ تمہیں یہ یاد رہتا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیسے نماز پڑھی، آپ کیسے وضو فرماتے تھے، قضائے حاجت کے لئے کس طرح جاتے تھے، کیسے روزہ رکھتے تھے، کیسے حج کرتے تھے، کیسے جہاد کرتے تھے، آپ کا انداز گفتگو کیا تھا، حفظ لسان کا طریقہ کیا تھا، آپ کے اخلاق عالیہ کیا تھے؟ تم آپ کے اسوہ پر چلو اور آپ کی سنت پر عمل کرو، اس بناء پر کہ وہ آپ کا طریق زندگی اور سنت نبوی ہے، اس بناء پر نہیں کہ وہ فرض و واجب ہے، تمہیں چاہیئے تھا کہ تم دین کے احکام و مسائل سیکھو، باقی سیر و سوانح اور صحابہؓ اور تابعین کی وہ حکایات جو آخرت کا شوق پیدا کریں تو وہ ایک تکمیلی چیز اور امر زائد ہے، اس کے مقابلہ میں

تمہارے مشاغل اور جن باتوں پر تم پوری توجہ صرف کرتے ہو، وہ آخرت کے علوم نہیں ہیں یا دنیاوی علوم ہیں۔

تم اپنے سے پہلے کے فقہاء کے استحسانات اور ان کی تفریعات میں غوطہ لگاتے ہو اور یہ نہیں جانتے کہ حکم وہ ہے جو اللہ اور اس کا رسول دے، تم میں کتنے آدمی ہیں، جب ان کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی حدیث پہونچتی ہے تو اس پر عمل نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ہمارا عمل تو فلاں کے مذہب پر ہے حدیث پر نہیں ہے، پھر تم نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ حدیث کا فہم اور اس کے مطابق فیصلہ کاملین اور ماہرین کا کام ہے، حضرات ائمہ سے یہ حدیث مخفی نہیں ہو سکتی، پھر انھوں نے جو اس کو چھوڑا تو کسی وجہ سے جو ان پر منکشف ہوئی، مثلاً نسخ یا مرجوحیت۔

یاد رکھو کہ اس کا دین سے کچھ تعلق نہیں، اگر تمہارا اپنے نبی پر ایمان ہے تو اس کی پیروی کرو، وہ تمہارے مذہب کے موافق ہو یا مخالف، خدا کی مرضی تو یہ تھی کہ تم کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے ساتھ شروع سے اشتغال کرتے، اگر ان دونوں پر عمل کرنا تمہارے لئے آسان ہو تو کیا کہنا، اور اگر تمہارے فہم سے قاصر ہوں تو پھر کسی سابق عالم کے اجتہاد سے مدد لو، اور جس کو زیادہ صحیح، صریح اور سنت کے موافق پاؤ اس کو اختیار کرو، علوم آلیہ سے ذہن کے ساتھ اشتغال کرو کہ وہ آلات و وسائل ہیں، ان کی مستقل حیثیت اور مقصود کا درجہ نہیں کیا خدا نے تمہارے اوپر یہ واجب نہیں کیا کہ تم علم کی اشاعت کرو، یہاں تک کہ مسلمانوں کے ملک میں شعائر اسلام

ظاہر و غالب ہوں تم نے شعائر کا تو اظہار نہیں کیا، اور لوگوں کو زوائد میں مشغول کر دیا؟[1]

شاہ صاحبؒ کو حدیث کے ذکر میں جو سرشاری کی کیفیت اور ائمہ حدیث کی ذات کے ساتھ جو گہری عقیدت تھی اس کا کچھ نمونہ اس مکتوب میں دیکھا جا سکتا ہے، جو انھوں نے امام بخاریؒ کے مناقب میں اپنے ایک مسترشد کو لکھا ہے[2]۔

خدمت و اشاعتِ حدیث کی سرگرمی

اوپر گزر چکا ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ جب اپنے استاد و شیخ ابو طاہر مدنی سے رخصت ہونے لگے تو انھوں نے یہ شعر پڑھا ؎

نسیتُ کل طریق کنت أعرفه　　　إلا طریقاً یؤدینی لربعکم

(میں چلنے کا ہر راستہ بھول گیا سوائے اس راستے کے جو آپ کے گھر تک پہونچاتا ہے)

شاہ صاحبؒ نے بھی چلتے وقت فرمایا کہ "میں نے جو کچھ پڑھا تھا، سب بھلا دیا سوائے علم دین حدیث کے"!

شاہ صاحب کی پوری زندگی اس کی تصدیق کرتی ہے کہ وہ حدیث شریف ہی کی تشریح و تفہیم، تدریس و تعلیم اور اشاعت و تعمیم میں مصروف رہے، بقول شاعر ؎

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

---

[1] تفہیمات الٰہیہ مطبوعہ المجلس العلمی ڈابھیل ۱۹۳۶ء؁ حصہ اول ص ۲۱۴-۲۱۵

[2] ملاحظہ ہو "کلمات طیبات" ص ۱۶۸-۱۷۱

ہندوستان واپس آتے ہی انھوں نے حدیث کی نشر و اشاعت کے لئے گویا کمر کس لی بہت جلد ان کا مدرسہ رحیمیہ ہندوستان کے طول و عرض میں حدیث کی سب سے بڑی درسگاہ بن گئی، جہاں ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے تشنگانِ علم حدیث نے پروانہ وار ہجوم کیا، ان مقامات میں سندھ[1] اور کشمیر[2] جیسے دور دراز مقامات بھی تھے، دہلی اور اس کے اطراف اور شمالی ہند کا تو کچھ کہنا نہیں، مسند الہند حضرت شاہ عبدالعزیز کے ماسوا کہ وہ فرزند ارجمند اور شاہ صاحبؒ کے کاموں کی توسیع و تکمیل کرنے والے تھے، اسی درس حدیث سے فائدہ اٹھانے والے فخر ہندوستان علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی مشہور بزبیدی (۱۱۴۵ھ – ۱۲۰۵ھ) صاحب تاج العروس شرح قاموس اور اتحاف السادۃ المتقین شرح احیاء علوم الدین تھے، جن کے تبحر و تحدیث کی عالم عربی میں دھوم مچ گئی اور جن کی مجلس قاہرہ میں سلاطین کے درباروں سے چشمک کرتی تھی، انھیں تلامذہ میں بیہقی وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ (م ۱۲۲۵ھ) خلیفہ ارشد حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ، و مصنف تفسیر مظہری و ما لا بد منہ بھی تھے۔[3]

---

[1] سندھ کے مولانا محمد معین دہلی آئے اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ سے حدیث کا درس لیا اور استفادہ کیا، ان کی مشہور تصنیف "دراسات اللبیب فی الأسوۃ الحسنۃ بالحبیب" ہے جس میں شاہ صاحب کی تحقیقات اور مذاق کا عکس صاف نظر آتا ہے، ۱۱۶۱ھ میں وفات ہوئی (ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر ج ۶)

[2] شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے خاص تلامذہ اور ان کی تحقیقات و اذواق کے حامل و مبلغ خواجہ محمد امین کشمیری (م ۱۱۸۷ھ) تھے، جو محمد امین الولی اللّٰہی کے نام سے مشہور ہیں، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ ان کے شاگرد تھے، شاہ صاحبؒ نے ان کے لئے اپنے بعض رسائل بھی تصنیف فرمائے (ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر ج ۶)

[3] ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر ج ۷۔

اس طرح ہندوستان میں صدیوں کے بعد (غالباً پہلی مرتبہ) علم حدیث کا ایسا چرچا اور اس کی طرف ایسا رجوع ہوا کہ ہندوستان، یمن کا ہمسر بن گیا، اور اس کے جانفزا جھونکے خود سرزمین حجاز تک پہونچنے لگے[1] نواب سید صدیق حسن خاں مرحوم نے شاہ صاحبؒ کی خدمت واشاعت حدیث کی سرگرمیوں کو ذکر کرتے ہوئے، عربی کے دو بلیغ شعر لکھے ہیں، جو حقیقت حال کی صحیح تصویر ہیں ؎

مَن زار بابك لم تبرح جوارحه	تروی أحادیث ما أولیت من مننٍ
فالعین عن قُرَّةٍ والکف عن صِلَةٍ	والقلبُ عن جابرٍ والسمعُ عن حسنٍ

(جو تمہارے دروازہ پر آیا اس کے اعضاء وجوارح تمہارے احسانات کی روایتِ حدیث میں مشغول ہو گئے)

(آنکھ کہتی ہے کہ (قُرّۃ) سے مجھے ٹھنڈک ملی، ہاتھ کہتے ہیں کہ ہم (صلہ) سے مالا مال ہوئے، دل راوی ہے کہ اس کو (جابر کے ذریعہ) سکون کی دولت حاصل ہوئی، کانوں کی روایت ہے کہ وہ (حَسَن کی بدولت) اچھی اچھی باتوں سے معمور ہوئے۔)

لطف یہ ہے کہ ان اعضاء نے جن احسانات کا تذکرہ کیا ہے، اور ان کے سلسلہ میں جن جن کے نام لئے ہیں، وہ سب راویان حدیث اور شیوخ کاملین ہیں، مثلاً قرۃ بن خالد السدوسی، صلۃ بن اشیم العدوی، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ اور امام حسن بصریؒ۔

---

[1] اسی مدرسہ ولی اللّٰہی کے فضلاء اور شاہ صاحب کے تلامذہ کے تلامذہ شاہ اسحٰق صاحب دہلوی، اور شاہ عبدالغنی صاحب مجددی نے حرمین شریفین میں خدمت ودرس حدیث کی بساط بچھائی عرب وعجم کو فیض پہونچایا، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر ج ۷۔

شاہ صاحبؒ کی تصنیفی خدمات

شاہ صاحب نے حدیث اور علوم حدیث پر جو تصنیفات کیں ان کے نام حسب ذیل ہیں،

۱۔ مصفّٰی (مؤطا امام مالکؒ کی فارسی شرح)

۲۔ مسوّٰی (مؤطا کی عربی شرح)

شاہ صاحبؒ فقہ حدیث اور درس حدیث کا جو طریقہ رائج کرنا چاہتے تھے یہ دونوں کتابیں اس کا نمونہ ہیں، اور ان سے شاہ صاحبؒ کی علوم حدیث اور فقہ حدیث میں محققانہ اور مجتہدانہ شان کا اظہار ہوتا ہے، وہ مؤطا کو صحاح ستہ میں پہلے درجہ پر رکھتے تھے اور اس کو ان میں ابن ماجہ کی جگہ پر شمار کرتے تھے[1]، وہ مؤطا کے بے حد قائل اور اس کے ساتھ اعتناء کرنے اور اس کو درس حدیث میں اوّلیت دینے کے پرجوش داعی اور مبلغ ہیں[2]

شاہ صاحبؒ اپنے وصیت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

چوں قدرت بزبان عربی یافت	جب عربی زبان پر قدرت حاصل
مؤطا بروایت یحییٰ بن یحییٰ مصمودی	ہو جائے مؤطا کے اس نسخہ کو جو
بخوانانند وہرگز آں را معطل	یحییٰ بن یحییٰ مصمودی کی روایت
نگذارند کہ اصل علم حدیث	سے ہے پڑھائیں، ہرگز اس سے
ہست وخواندن آں فیضہا دارد مدا	پہلو تہی نہ کریں کہ وہ علم حدیث کی

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مولانا عبید اللہ سندھی کا مقالہ "الفرقان" شاہ ولی اللہؒ نمبر ص ۲۹۲-۲۹۸

[2] ملاحظہ: مقدمہ مصفّٰی نیز "الفائدۃ الثانیۃ فی درجۃ المؤطا من بین کتب الحدیث" مقدمہ اوجز المسالک، از حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب ص ۲۲-۳۳ مطبوعہ مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۳۹۳ھ

سماع جمیع آں مسلسل است[1] — اصل ہے اور اس کا پڑھنا بڑے فیوض کا حامل ہے، ہم کو مکمل مُؤطا کی سماعت مسلسل طریقہ پر حاصل ہے۔

۳۔ شرح تراجم ابواب صحیح بخاری: صحیح بخاری کے تراجم وابواب کی جو ہر زمانہ میں درس بخاری کے سلسلہ کی دقیق ترین چیز سمجھی گئی ہے اور ہر زمانہ میں بخاری کے شُرّاح اور اساتذہ نے اس میں اپنی ذہانت، اور دقیقہ سنجی کے نمونے پیش کئے ہیں، یہ رسالہ عربی میں ہے، پہلے ۱۳۲۳ھ میں دائرۃ المعارف، حیدرآباد سے شائع ہوا، پھر اصح المطابع، دہلی کے صحیح بخاری کے نسخے کے شروع میں بطور مقدمہ شامل کیا گیا۔[2]

۴۔ مجموعہ رسائل اربعہ: چار مختصر رسائل کا مجموعہ ہے جن میں "ارشاد الی مہمات الاسناد" اور تراجم البخاری (یہ شرح تراجم ابواب بخاری کے علاوہ ہے اور صرف ایک ورق پر ہے) شاہ صاحبؒ کی تصنیف ہیں۔

۵۔ "الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الأمین" "انوادر من حدیث سید الأوائل والأواخر" "اربعین" شاہ صاحبؒ نے اس فضیلت کے حصول کے لئے جو چالیس احادیث جمع کرنے کے بارے میں وارد ہوئی ہے، اور مختلف زمانوں میں علماء نے اس پر عمل کیا ہے، یہ رسالہ تصنیف کیا، یہ احادیث عام طور پر بہت مختصر قلیلۃ المبنی کثیرۃ المعنی ہیں، اور رسالہ اس قابل ہے کہ زبانی یاد کیا جائے، اور نصاب میں داخل کیا جائے۔

---

[1] وصیت نامہ فارسی ص۱۱

[2] شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سہارن پوری (م ۱۴۰۲ھ) کے رسالہ "تراجم ابواب بخاری" میں بھی وہ شامل ہے۔

۶۔ مسلسلات۔

وہ کتابیں جو براہ راست فن حدیث پر نہیں ہیں، مگر ان کا بالواسطہ حدیث سے تعلق ہے اور وہ مقدمات علم حدیث کے طور پر پڑھی جانی چاہئیں اور ان سے شاہ صاحب کی علم حدیث پر گہری نظر، فقہ و حدیث میں تطبیق اور مذاہب کے محاکمہ میں انصاف و وسعت قلب طبقات محدثین اور طبقات کتب حدیث کے بارے میں ان کی وسیع نظر اور عمومی طور پر ان کے اس توازن و اعتدال کا اندازہ ہوتا ہے جس سے اللہ تعالےٰ نے ان کو نوازا تھا، یہ کتابیں حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ "الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف"

"حجۃ اللہ البالغۃ" میں "تتمہ" کے عنوان سے چند عناوین و مضامین میں جو صفحہ ۱۴۰-۱۶۲ تک پھیلے ہوئے ہیں[۱]، یہ تتمہ چند[۲] ابواب پر منقسم ہے۔ ناشر کی تحقیق ہے کہ یہ تتمہ صرف ایک ہی نسخہ میں پایا گیا، اس باب کے آخر میں شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:۔

"میں نے ایک مستقل کتاب کی تالیف کا عزم کیا جس کا نام 'غایۃ الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف' رکھوں گا، اور اس میں تفصیل سے اسباب اختلاف پر بحث اور اس کے شواہد و امثال بھی پیش کروں گا، لیکن اس وقت تک اس کام کے لئے فرصت نہیں ملی، جب اس کتاب (حجۃ اللہ البالغہ) میں اس مقام تک بحث پہونچی تو میں نے مناسب سمجھا کہ جو کچھ اس وقت ذہن میں ہے اور اس کا قلم بند کرنا آسان ہے، اس کو پیش کر دوں[۲]"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں شاہ صاحبؒ کو اس کا موقعہ ملا اور حجۃ اللہ کے

---

[۱] نسخہ مکتبہ سلفیہ لاہور   [۲] حجۃ اللہ البالغہ ص۱۶۱ (سلفیہ)

اس مضمون کو لے کر کچھ اضافوں کے ساتھ علیحدہ رسالہ میں "الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف" کے نام سے مکمل کر دیا، اس لئے اس رسالہ اور حجۃ اللہ کے تتمہ دوم میں کہیں کہیں اختلاف اور خفیف حذف و اضافہ نظر آتا ہے۔

یہ رسالہ الانصاف (جو اپنے موضوع پر منفرد ہے) ہندوستان اور بیرون ہند میں کئی مرتبہ شائع ہوا، جن میں کہیں کہیں الفاظ کا اختلاف پایا جاتا تھا، ۱۳۲۷ھ میں "شرکۃ المطبوعات العلمیہ مصر" کی طرف سے پہلی مرتبہ اور "مکتبۃ المنصورۃ" مصر کی طرف سے دوسری مرتبہ رسالہ عربی ٹائپ میں شائع ہوا، اس وقت ہمارے سامنے "دار النفائس" بیروت کا عمدہ ٹائپ کا چھپا ہوا نسخہ ہے، جو چھوٹے سائز کے ایک سو گیارہ صفحات میں آیا ہے، عصر حاضر کے محدث جلیل شیخ عبدالفتاح ابو غدہ نے اس کے مقابلہ اور تصحیح کی خدمت انجام دی اور اس پر حواشی کا اضافہ کیا۔

۲۔ عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید۔

۳۔ حجۃ اللہ البالغۃ کا المبحث السابع۔[1]

درحقیقت حجۃ اللہ البالغہ کے پہلے حصہ کے القسم الثانی فی بیان اسرار ما جاء عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تفصیلاً سے لے کر دوسرے جز کے آخری حصہ "الفتن والمناقب" تک حدیث ہی کی حکیمانہ اور متکلمانہ شرح اور اس کے اسرار و حکم، اور اس کی عملی تطبیق کی وہ مجتہدانہ کوشش ہے جو شاہ صاحب ہی کا حصہ تھا، اور جس میں ان کو سبقت و اولیت حاصل ہے، افسوس ہے کہ حجۃ اللہ البالغۃ کا مطالعہ کرنے والے اور اس کا درس دینے والے بھی (علی أنهم أقل قليل) اس حصہ کو غیر اہم سمجھ کر

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ از ص ۱۲۵ تا ۱۵۴

نظر انداز کر دیتے ہیں۔

تطبیق بین الفقہ والحدیث

عرصہ سے عالم اسلام کے بہت سے علمی، تدریسی اور تصنیفی حلقوں میں فقہ و حدیث کے دو متوازی سلسلے چلے آرہے تھے، جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر (جب سے اس کا اجرا ہوا تھا) دوسرے سے مستغنی و بے نیاز ہو کر اپنا سفر طے کر رہا تھا، اور اکثر اوقات ایک دوسرے سے جدا ہو کر پھر وہ کسی نقطہ پر جا کر ہمکنار نہیں ہوتے تھے، بہت سے فقہی مسلکوں میں حدیث اسی وقت زیر بحث آتی، جب مسئلہ کی تائید اور دوسرے مذہب فقہی کے نمائندوں کے اس اعتراض کو دفع کرنا ہوتا کہ یہ مسئلہ حدیث کے خلاف ہے، یا دوسرے مذہب پر اس کی ترجیح ثابت کرنی ہوتی، صحاح کے درس میں یا تو ان احادیث کی تاویل کی جاتی جو اپنے مذہب کے خلاف پڑتیں یا دوسری کتابوں کی ان احادیث کو پیش کیا جاتا جو اپنے مذہب کی تائید میں ہیں، اگر کسی مذہب فقہی کی کسی مستند و معیاری کتاب میں احادیث سے استدلال کیا گیا ہے تو بعض اوقات اس مذہب کے ان علماء نے جن کی فن حدیث پر وسیع نظر تھی اور محدثانہ ذوق رکھتے تھے، ان احادیث کی تخریج کی کوشش کی ہے اور ان پر محدثانہ کلام کیا ہے، جن سے اس کتاب میں استدلال کیا گیا ہے[1]، تو یہ سعی محمود بھی اس مذہب فقہی کی تائید و نصرت اور اس کو مطابق حدیث ثابت کرنے کا ایک طریقہ اور اس مذہب کی ایک عالمانہ اور محققانہ خدمت تھی، جو قابل قدر اور مستحق شکر ہے، نفس مسائل پر نظر ثانی کرنے اور فقہ و حدیث میں تطبیق کی کوشش نہیں تھی۔

---

[1] اس کی ایک روشن مثال علامہ زیلعی کی کتاب "نصب الرایۃ فی تخریج احادیث الھدایۃ" ہے۔

مذاہب فقہیہ کے کچھ ایسے آہنی سانچے بن گئے تھے جن کا ٹوٹ جانا تو ممکن تھا[1] پھیلنا ممکن نہیں تھا، ہر مذہب کے پیرو اپنے مذہب کے متعلق یہ خیال قائم کئے ہوئے تھے کہ ان کے مذہب کا سو فیصدی صحیح ہونا تو اصل حقیقت ہے باقی بشریت کی بناء پر غلطی کا امکان ضرور ہے، کسی نے اس طرز فکر کو بڑے بلیغ انداز میں اس جملہ سے ادا کیا ہے "مذھبنا صواب یحتمل الخطاء ومذھب غیرنا خطاء یحتمل الصواب" (ہمارا مذہب اصل میں تو درست اور حق ہے خطا کا احتمال ہے، اور دوسرے کا مذہب (فقہی) اصلاً ناصواب ہے، صحت کا احتمال ہے) اس طرز فکر کا نتیجہ یہ تھا کہ مذاہب اربعہ (حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی) کے درمیان (جن کو امت نے عام طور پر سند قبول عطا کی اور جن کے متعلق اہل حق واہل علم کے درمیان شروع سے یہ اصولی طور پر تسلیم کیا جاتا رہا ہے کہ حق ان میں دائر ہے، ان کے بانی اور مؤسس ائمۃ الہدیٰ اور امت کے پیشوا تھے اور یہ مذاہب حقانی ہیں) خلیج روز بروز عمیق اور وسیع ہوتی چلی جارہی تھی ان پر عمل کرنے والوں کے درمیان اختلاف منافرت تک، اور بحث ومناظرہ بعض اوقات مجادلہ اور مقاتلہ تک پہونچ جاتا تھا، اس سے زیادہ سخت معاملہ ان اہل علم کے ساتھ ہوتا تھا،

---

[1] یعنی اس مذہب کو ترک کرکے دوسرے مذہب کو اختیار کرلینے حنفیت سے شافعیت یا بالعکس، یا عمل بالحدیث کا مسلک اختیار کرلینے کی مثالیں ہر زمانہ میں ملیں گی لیکن ایک ہی مذہب کے دائرہ میں رہ کر بعض مسائل سے جزئی طور پر عدول اور کسی دوسرے مذہب کے مسئلہ کو اختیار کرلینے، یا کسی مسئلہ میں حدیث پر عمل کرنے کی مثالیں بہت کم ملیں گی، اس لئے کہ بہت سے حضرات کے نزدیک "تجزّی تقلید" صحیح نہیں، یعنی کسی مذہب امام کا مقلد کسی مسئلہ میں بھی اگر دوسرے مذہب امام کی تقلید اور اس کے مسئلہ پر عمل کرے تو وہ اپنے امام کی تقلید کے دائرہ سے خارج ہوجاتا ہے۔

جو کُلّی یا جزئی طور پر عبادات میں حدیث پر عمل شروع کر دیتے تھے، اس کی ایک مثال اسی بارہویں صدی کے ایک سلفی عالم و محدّث مولانا شیخ محمد فاخر زائر الٰہ آبادی (۱۱۲۰ھ۔۱۱۶۴ھ) ہیں، جو (بعض مصنفین کی روایت کے مطابق) اپنے اتباع حدیث و سلفیت کی وجہ سے عوام کی ناراضگی کا نشانہ بنے۔[1]

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے مجددانہ کارناموں میں ایک کارنامہ اور خدمتِ حدیث اور انتصار للسنّۃ ہی کے سلسلۂ زریں کی ایک اہم کڑی ان کی فقہ و حدیث میں تطبیق کی اور پھر مذاہب اربعہ میں جمع و تالیف کی کوشش تھی، اس سے اس بشارت نبویؐ کی تصدیق ہوتی ہے جس میں کہا گیا تھا کہ "تم سے خدا اس امت کی شیرازہ بندی کے ایک خاص نوع کا کام لے گا"۔[2]

جہاں تک ہندوستان کے تحتی برِّ اعظم کا تعلق ہے، اس میں اس طرزِ فکر اور جمع و تطبیق کی اس کوشش کا سراغ نہیں ملتا اور اس کے تاریخی و علمی اسباب ہیں، یہ تحتی برِّ اعظم شروع سے ان فاتحین اور بانیانِ سلطنت کے زیرِ نگین رہا جو یا ترکی النسل تھے، یا افغانی النسل، اور یہ دونوں قومیں تقریباً اپنے اسلام قبول کرنے کے زمانہ سے مذہب حنفی کی حلقہ بگوش بلکہ اس کی حمایت اور نشر و اشاعت میں سرگرم اور پُرجوش رہیں، یہاں اسلام کی تقریباً آٹھ سَو سال کی تاریخ میں مذہب مالکی اور مذہب حنبلی کو تو قدم بھی رکھنے کا موقعہ نہیں ملا، شافعی مذہب سواحل تک محدود رہا، یا جنوبی ہند مدراس اور شمالی کنارے (موجودہ کرناٹک کے بعض حصوں بھٹکل وغیرہ اور کیرالا میں محدود رہا، ان میں بھی مالابار (قدیم بلاد المعبر) کو مستثنیٰ کر کے جہاں زیادہ تر شافعی مسلک کے داعیانِ اسلام، تجار، مشائخ اور فقیہ و عالم آئے، شیخ مخدوم

---

[1] شیخ فاخر الٰہ آبادی کے تذکرہ کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" ج ۶ [2] فیوض الحرمین صـ ۶۲

فقیہ علی مہائمی (م ۸۳۵ھ) صاحب تفسیر تبصیر الرحمان وتیسیر المنان، اور مالابار کے شیخ مخدوم اسماعیل فقیہ السکری الصدیقی (م ۹۲۹ھ) نیز مخدوم شیخ زین الدین ملیباری (م ۹۲۸ھ) صاحب فتح المعین کے علاوہ ہمارے محدود علم میں اس پایہ کے شافعی فقیہ و محدث نہیں پیدا ہوئے[۱] جو ہندوستان (بالخصوص شمالی ہند کے) علمی حلقوں پر گہرا اثر ڈالتے، اور علماء حنفیہ کو فقہ شافعی پر عمیق نظر ڈالنے اور اس سے استفادہ پر آمادہ کرتے، ہندوستان سے جو علماء اور طالبانِ علم حدیث وفقہ حجاز جاتے (جو ترکی سلطنت کے زیرِ انتظام تھا، اور ترک ہر دور میں سو فیصدی سنی اور حنفی رہے ہیں) وہ بھی زیادہ تر اپنے ہی مذہب کے علماء اور خصوصیت کے ساتھ اپنے ہم وطن اساتذۂ فقہ وحدیث سے رابطہ رکھتے، جو وہاں ہندوستان یا افغانستان سے ہجرت کر کے چلے گئے تھے اور ان کے شاگردوں کا بڑا حلقہ تھا۔[۲]

شاہ ولی اللہ صاحبؒ پہلے شخص تھے، جن کا حرمین شریفین میں اصل تلمذ اور استفادہ ایک جلیل القدر شافعی محدث شیخ ابو طاہر کردی مدنی سے تھا، وہ ان کے علم، ان کی شخصیت اور ان کے باطنی کمالات، وسعت نظر اور وسعت قلب سے بھی متاثر ہوئے، شاہ صاحبؒ نے "انسان العین" میں اپنے جن مشائخ حرمین کا تعارف کرایا، ان میں صرف ایک شیخ تاج الدین قلعی حنفی عالم و محدث تھے، ان مشائخ میں شیخ محمد وفد اللہ بن شیخ محمد بن محمد بن سلیمان مالکی المذہب تھے، جس دور میں شاہ صاحبؒ نے حرمین میں قیام کیا ہے، اس دور میں حجاز کی علمی قیادت اور تعلیم و تدریس کے میدان (بالخصوص فن حدیث کی تعلیم) میں سربراہی اور پیشوائی علماء و محدثین یمن یا کردی النسل علماء

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب "عرب و دیار ہند" تالیف مولانا خواجہ بہاء الدین اکرمی ندوی بھٹکلی۔

[۲] مثلاً علامہ شیخ علی متقی برہانپوری، صاحب کنز العمال، علامہ قطب الدین نہروالی، ملا علی قاری ہروی مکی، شیخ عبد الوہاب متقی اور شیخ محمد حیات سندی وغیرہ۔

کے ہاتھ میں تھی، اور وہ بعموم شافعی تھے، ان تمام اسباب کی بناء پر شاہ صاحب کو فقہ شافعی کے اصول و قواعد، اس کی خصوصیات اور بعض مابہ الامتیاز چیزوں سے واقف ہونے کا پورا موقعہ ملا، اور اسی طرح فقہ مالکی اور فقہ حنبلی سے بھی باخبر ہونے کا وہ موقعہ ملا جو علمائے ہندوستان کو طویل عرصہ سے (تاریخی، جغرافیائی، سیاسی، اور تمدنی اسباب کی بناء پر) میسر نہیں آیا تھا، اور اس طرح مذاہب اربعہ کا تقابلی مطالعہ (الفقہ المقارن) ان کے لئے ممکن اور آسان ہوا، جو ان علماء کے لئے دشوار تھا، جن کو یہ مواقع حاصل نہیں ہوئے تھے۔

شاہ صاحب ۱۱۴۳ھ میں تیس[۳۰] سال کی عمر میں جب وہ تقریباً بارہ[۱۲] سال ہندوستان میں درس دے چکے تھے، عازم حجاز ہوئے، لیکن اللہ تعالےٰ نے ان کی طبیعت میں فطری طور پر جو جامعیت نظر و قلب میں وسعت اور فطرتاً تطبیقی ذوق اور عارف رومیؒ کی اس وصیت پر عمل کرنے کا فطری رجحان پیدا کیا تھا کہ ؎

تو برائے وصل کردن آمدی

نے برائے فصل کردن آمدی

اس کی بناء پر سفر حجاز سے پہلے ہی ان کے اندر تطبیق بین الفقہ والحدیث کا جذبہ اور فقہائے محدثین کے مسلک کو ترجیح دینے اور اس کو اپنی زندگی کا وتیرہ بنانے کا عزم پیدا کر دیا گیا تھا۔ "الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف" میں خود تحریر فرماتے ہیں:۔

بعد ملاحظۂ کتب مذاہب اربعہ	مذاہب اربعہ اور ان کے اصولِ فقہ
واصول فقہ ایشاں واحادیثے کہ	کی کتابوں کے مطالعہ اور جن احادیث
متمسک ایشاں است قرار داد	سے وہ استدلال کرتے ہیں ان پر غور
خاطر بمدد نور غیبی روش فقہائے محدثین	و فکر کرنے کے بعد طبیعت میں فقہائے محدثین

افتاد، بعد ازاں شوق زیارت حرمین محترمین در سر افتاد۔[1]	کی روش کی پسندیدگی قرار پذیر ہوئی، اس میں نور غیبی کی مدد بھی شامل تھی، اس کے بعد حرمین محترمین کی زیارت کا شوق دامن گیر ہوا۔

شاہ صاحبؒ نے غالی فقہاء (جو اپنے مذہب سے سر موانحراف کرنے کے لئے تیار نہیں) اور فرقۂ ظاہریہ (جو مطلقاً فقہ کا منکر اور ان فقہاء کی شان میں لب کشائی کرتا ہے جو حاملین علم کے سرتاج اور اہل دین کے امام و پیشوا ہیں) کی روش پر سخت تنقید کی ہے، اور دونوں کے غلو و انتہا پسندی کو ناپسند کیا ہے، اور صاف لکھا ہے کہ "اِنَّ الحقَّ أمرٌ بین بین" معاملہ بین بین ہے، نہ پہلا فریق سَو فیصدی حق پر ہے، نہ دوسرا فریق۔

شاہ صاحبؒ اپنی معرکۃ الآراء کتاب حجۃ اللہ البالغۃ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ایک طرف کلام فقہاء پر تخریج، دوسری طرف احادیث کے الفاظ کا تتبّع دونوں کی دین میں مستحکم اصل موجود ہے، اور ہر زمانہ کے علمائے محققین ان دونوں اصولوں پر عمل کرتے رہے ہیں، بعض ایسے ہیں جن کا تخریج کے بارے میں قدم پیچھے اور حدیث کے الفاظ کے تتبّع میں قدم آگے ہے، اور بعض اس کے برعکس ان میں سے کسی ایک اصول سے بھی مطلقاً صرفِ نظر مناسب نہیں، جیسا کہ فریقین کے عوام کا شیوہ ہے، اس بارے میں صراطِ مستقیم یہی ہے کہ دونوں کے درمیان تطبیق کی کوشش کی جائے اور ایک کی کمی دوسرے سے پوری کی جائے اور یہی امام حسن بصریؒ کا قول ہے۔"[2]

---

[1] الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف شمول انفاس العارفین مطبع مجتبائی ص ۲۰۳-۲۰۴ [2] حجۃ اللہ البالغۃ ص ۱۵۱ جزء اول تفصیل کے لئے پوری بحث "حکایۃ حال الناس قبل المأۃ الرابعۃ وبعدھا" میں دیکھی جائے۔

اپنے فارسی وصیت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

در فروع پیروی علماء محدثین کہ جامع باشند میان فقہ و حدیث کردن و دائماً تفریعات فقہیہ را بر کتاب و سنت عرض نمودن۔	مسائل فروعی میں ایسے علماء محدثین کی پیروی کرنی چاہئے جو فقہ و حدیث دونوں کے عالم ہوں، مسائل فقہیہ کو کلام اللہ اور حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاتے رہنا چاہئے۔

آگے تحریر فرماتے ہیں:۔

امت را ہیچ وقت از عرض مجتہدات بر کتاب و سنت استغناء حاصل نیست۔[1]	امت کے لئے قیاسی مسائل کا کلام اللہ اور حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تقابل کرتے رہنا ضروری ہے اس سے کبھی بے نیازی نہیں ہوسکتی۔

شاہ صاحب کا سارا علمی نشوونما فقہ حنفی و اصول فقہ حنفی کے ماحول میں ہوا تھا، اور وہ مذہب حنفی کی خصوصیات سے اتنا ہی واقف اور ان کے اتنا ہی قائل تھے جتنا کہ کوئی بڑے سے بڑا حنفی عالم ہوسکتا ہے، وہ اس حقیقت سے واقف تھے اور جا بجا اس کا اظہار کرتے ہیں کہ مختلف تاریخی، علمی، سیاسی و تمدنی اسباب کی بناء پر جتنی فقہ حنفی (نیز فقہ شافعی) کی خدمت ہوئی ہے اور ان کی نوک پلک درست کی گئی ہے ان کے متون کی شرح اور اصول کی تفریع کی گئی ہے

---

[1] وصیت نامہ فارسی ص۲-۳

اکسی دوسرے مذہب کے سلسلہ میں پیش نہیں آیا، وہ امام ابو حنیفہؒ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

کان عظیم الشان فی التخریج علی	امام ابو حنیفہ کا مرتبہ ابراہیم نخعی اور
مذھب ابراھیم وأقرانہ	ان کے ہم مرتبہ علماء کے مذہب پر
دقیق النظر فی وجوہ التخریجات	اجتہاد و استنباط کے سلسلہ میں بہت
مقبلا علی الفروع اتم اقبال۔[1]	بلند تھا، ان تخریجات کے وجوہ و اشکال
	میں وہ بڑی دقت نظر رکھتے تھے، مسائل
	جزئیہ اور فروع کے استخراج میں ان کا
	انہماک بہت بڑھا ہوا تھا۔

لیکن اس کے ساتھ وہ امام مالکؒ کی عظمت اور خاص طور پر مؤطا کی صحت اس کے رتبہ و مقام، اور اس کی برکت کے نہ صرف قائل بلکہ داعی ہیں، اور اس کو حدیث کی اساسی کتاب مانتے ہیں[2]، دوسری طرف مذہب شافعی کے منقح و مصفّٰی اور حدیث سے اقرب ہونے کا ذکر بلند الفاظ میں کرتے ہیں، اور امام شافعی کی دقیق النظری کے بڑے قائل ہیں[3]۔

پھر اس کے ساتھ امام احمد بن حنبلؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:۔

فکان اعظمھم شأنا وأوسعھم	ان فقہاء و محدثین میں سب کے عالی مرتبہ
روایۃ، وأعرفھم للحدیث مرتبۃ	وسیع الروایۃ، حدیث سے باخبر اور
وأعمقھم فقھا احمد بن حنبلؒ	تفقہ میں عمیق النظر امام احمد بن حنبلؒ
ثم اسحاق بن راھویہ۔[4]	پھر اسحاق بن راہویہ ہیں۔

---

[1] الانصاف فی بیان أسباب الاختلاف، طبع دار النفائس، بیروت ص ۳۹ [2] ملاحظہ ہو مقدمہ مصفّٰی۔

[3] ملاحظہ ہو الخیر الکثیر ص ۱۳۲ و کتاب قرۃ العینین ص ۱۳۲ [4] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۵۰

ان ائمہ اربعہ کے علوِّ شان، وسعت علم، دقّت نظر اور امت پر احسان سے (ان کتابوں اور تاریخ و تراجم کے ذریعہ) براہ راست واقفیت اور ان سے دلی عقیدت کی بناء پر شاہ صاحب میں وہ جامعیت اور فقہ و حدیث کے تقابلی مطالعہ میں وہ توازن و اعتدال پیدا ہو گیا، جس کی قدرۃً ان علماء و مصنفین سے توقع نہیں کی جا سکتی، جن کا مطالعہ اور ذہنی وابستگی ایک ہی مذہب فقہی اور اس کے بانی و مؤسس سے تھی، اور ان کو اس دائرہ سے باہر نکلنے کی (بہت سے طبعی و شخصی اسباب کی بناء پر) نوبت نہیں آتی۔

اجتہاد و تقلید کے درمیان نقطۂ اعتدال

حضرت شاہ صاحبؒ کے ان وہبی کمالات اور تجدیدی امتیازات میں سے جن سے اللہ تعالیٰ نے ان کو خاص طور پر نوازا تھا، وہ متوازن و معتدل مسلک اور وہ نقطۂ اعتدال ہے، جو انھوں نے اجتہاد و تقلید کے درمیان اختیار کیا، اور جو ان کی طبع سلیم، ذوق صحیح اور حقیقت پسندی کا بہترین مظہر ہے، ایک طرف وہ لوگ تھے، جو ہر مسلمان کو خواہ عامی ہو یا خاص براہ راست کتاب و سنت پر عمل کرنے اور ہر معاملہ میں وہیں سے احکام حاصل کرنے کا مکلّف قرار دیتے تھے، اور تقلید کی مطلق حرمت کے قائل تھے، اگر ان کے کلام میں اس کی صراحت نہیں ملتی تو ان کے طرز عمل اور ان کی تحریروں سے قدرتی طور پر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے، اس گروہ میں متقدمین میں علامہ ابن حزمؒ پیش پیش نظر آتے ہیں، لیکن یہ بالکل ایک غیر علمی بات ہے اور اس کا ہر مسلمان کو مکلّف قرار دینا تکلیف مالا یطاق ہے۔

دوسری طرف وہ گروہ تھا جو تقلید کو اسی طرح ہر مسلمان پر واجب قرار دیتا تھا اور اس کے تارک کو سخت فقہی احکام "فاسق" اور "ضال" سے یاد کرتا تھا جیسا کہ پہلا گروہ مقلدین

اور کسی خاص مذہب فقہی کے تبعین کو، یہ گروہ اس حقیقت کو بھول جاتا تھا کہ تقلید عوام کو نفسانیت اور خود رائی سے بچانے، مسلم معاشرہ کو انتشار اور فوضویت (انارکی) سے محفوظ رکھنے، دینی زندگی میں وحدت و نظم پیدا کرنے اور احکام شریعت پر بسہولت عمل کرنے کا موقعہ دینے کی ایک انتظامی تدبیر ہے لیکن انھوں نے اس انتظامی عمل کو تشریعی عمل کا درجہ دے دیا، اور اس پر اس شدت سے اصرار کیا جس نے اس کو ایک مذہب فقہی اور مسلئہ اجتہادی کے بجائے منصوص اور قطعی عمل اور مستقل دین کا درجہ دے دیا۔

شاہ صاحبؒ نے اس بارے میں جو مسلک اختیار کیا، اور اس کی جو تعبیر کی وہ روح شریعت سے قریب تر، قرن اول کے عمل سے زیادہ ہم آہنگ، فطرت انسانی سے زیادہ مطابق اور عملی زندگی سے سازگار ہے اس سلسلہ میں شاہ صاحبؒ چوتھی صدی ہجری سے پیشتر کے طرز عمل کا ذکر کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ لوگوں کو اپنی دینی زندگی میں عبادات و معاملات میں جو نئے نئے مسائل و مشکلات پیش آتے تھے، ان کو وہ کس طرح حل کرتے تھے، اور اس سلسلہ میں وہ کیا راستہ اختیار کرتے تھے "حجۃ اللہ البالغۃ" کے باب "حکایۃ حال الناس قبل المأۃ الرابعۃ وبعدھا" (چوتھی صدی ہجری سے بیشتر اور اس کے بعد کے لوگوں کا مسائل دینی کی تحقیق و عمل کے بارے میں کیا طرز عمل تھا؟) میں تحریر فرماتے ہیں:-

قرون اولیٰ میں مسلمانوں کا طرز عمل

"معلوم ہونا چاہئے کہ چوتھی صدی سے قبل کے لوگ کسی ایک معین مذہب (فقہی) کی پابندی اور اس کی مکمل تقلید پر اجماع کئے ہوئے نہیں تھے، ابوطالب مکیؒ (اپنی مشہور کتاب) "قوت القلوب" میں لکھتے ہیں: کہ تصنیفی انداز کی کتابیں (اور

فقہی مسائل کے مجموعے) اس زمانہ کے بعد کی باتیں ہیں، لوگوں کی کہی ہوئی باتوں کا کہنا کسی ایک مذہب پر فتویٰ دینا، اس کے قول کو دستور العمل بنا لینا اور اسی کو نقل کرنا اور اسی مذہب کے اصولوں اور بنیادوں پر تفقہ کا پہلی اور دوسری صدی میں وجود نہیں تھا۔

میں اس میں اضافہ کر کے کہتا ہوں کہ دو ابتدائی صدیوں کے بعد تخریج کا کسی قدر سلسلہ شروع ہوا، لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ چوتھی صدی کے لوگ ایک ہی مذہب کے دائرہ میں رہ کر تقلید خالص کے پابند اور اسی کے مطابق مسائل و احکام میں تفقہ اور اسی مذہب کے تحقیقات و اجتہادات کی نقل و روایت کے عادی نہیں تھے، جیسا کہ تتبع سے معلوم ہوتا ہے۔

امت اور (مسلم معاشرہ) میں دو طبقے تھے ایک علماء کا ایک عوام کا۔

عوام کا تو قصہ یہ ہے کہ وہ ان اجماعی مسائل میں جن میں مسلمانوں یا جمہور مجتہدین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، وہ صرف صاحب شریعت (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تقلید کرتے تھے، وہ وضو، غسل کرنے اور نماز و زکوٰۃ ادا کرنے کا طریقہ اور اسی طرح کی عبادات و فرائض، اپنے والدین یا اپنے شہر کے استادوں، عالموں سے اخذ کرتے تھے، اور اسی کے مطابق عمل کرتے تھے، اور اگر کوئی نئی بات پیش آتی تو اس کے بارے میں کسی مفتی سے بھی جس تک ان کی رسائی ہوتی تھی، کسی خاص مذہب کے تعین کے بغیر رجوع کر لیتے تھے، اور اس سے مسئلہ پوچھ لیتے تھے۔

جہاں تک خواص کا تعلق ہے، ان کا معاملہ یہ تھا کہ جن کا فن حدیث تھا، وہ حدیث سے اشتغال رکھتے تھے، ان کو احادیث نبویہ اور آثار صحابہؓ کا اتنا ذخیرہ

مل جاتا تھا کہ اس کی موجودگی میں ان کو اس مسئلہ میں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں پڑتی تھی ان کے پاس کوئی نہ کوئی ایسی حدیث جو درجہ شہرت "استفاضہ یا صحت کو پہونچی ہوتی تھی یا صحیح حدیث ہوتی تھی" موجود تھی جس پر فقہاء اور علمائے کبار میں کسی نہ کسی نے عمل کیا ہوتا تھا، اور کسی کے پاس اس کو ترک کرنے کا کوئی معقول عذر نہیں ہوتا تھا، یا جمہور صحابہؓ اور تابعین کے پے در پے ایک دوسرے کی تائید کرنے والے اقوال ان کے پاس ہوتے تھے، جن سے اختلاف کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی تھی، اگر ان میں سے کسی کو مسئلہ میں کوئی ایسی چیز نہ ملتی جس سے اس کا قلب مطمئن ہوتا، نقول کے تعارض یا ترجیح کے اسباب کے عدم وضاحت کی وجہ سے یا کسی اور معقول سبب سے تو پھر وہ اپنے پیشرو فقہاء اور علماء کے کلام کی طرف رجوع کرتا تھا، اگر اس کے بارے میں اس کو دو قول ملتے، تو ان میں سے وہ اس کو اختیار کرلیتا جو زیادہ قوی اور مُدلّل ہوتا، چاہے یہ قول علمائے مدینہ کا ہوتا، یا علمائے کوفہ کا، جو تخریج (اجتہاد و استنباط) کی اہلیت رکھتے تھے، وہ ایسے مسئلہ میں جس میں ان کو کوئی صراحت نہیں ملتی تھی تخریج و اجتہاد سے کام لیتے تھے، یہ لوگ اپنے اساتذہ یا اہل گروہ کی طرف منسوب کئے جاتے تھے، مثلاً کہا جاتا تھا کہ فلاں شافعی ہے، فلاں حنفی، علمائے حدیث میں بھی جو کسی مذہب سے زیادہ اتفاق کرتا تھا، اس کی طرف منسوب ہو جاتا تھا، مثلاً نسائی اور بیہقی کی نسبت امام شافعیؒ کی طرف کی جاتی تھی، اس زمانہ میں قضاء و افتاء پر اسی کا تقرر کیا جاتا تھا جس میں اجتہاد کی صلاحیت ہوتی تھی فقیہ بھی وہی کہلاتا جو مجتہد ہوتا، پھر ان صدیوں کے بعد دوسری طرح کے لوگ

پیدا ہوئے جنھوں نے چپ وراست کا راستہ اختیار کیا"۔[1]

تقلید کی جائز اور فطری شکل

شاہ صاحبؒ غایتِ انصاف اور حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے ایسے شخص کو تقلید کے بارے میں معذور سمجھتے ہیں جو کسی مذہب فقہی یا معیّن امام کا مقلّد تو ضرور ہے لیکن اس کی نیت محض صاحب شریعت کی پیروی اور اتباع نبویؐ ہے لیکن وہ اپنے اندر اس کی اہلیت نہیں پاتا کہ وہ حکم شرعی اور جو چیز کتاب و سنت سے ثابت ہے اس تک براہ راست پہونچ جائے اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں، مثلاً وہ عامی شخص ہے، یا اس کے پاس براہ راست تحقیق کرنے کے لئے وقت و فرصت نہیں، یا ایسے وسائل (علم و تحقیق) حاصل نہیں جن سے وہ نصوص کا خود پتہ چلالے، یا ان سے مسئلہ استنباط کرلے، شاہ صاحبؒ علامہ ابن حزم کا یہ قول نقل کرنے کے بعد کہ تقلید حرام ہے اور کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کسی کے قول کو بلا دلیل قبول کرلے تحریر فرماتے ہیں:۔

> "ابن حزم کے قول کا مصداق وہ شخص نہیں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول کے علاوہ کسی کو اپنے لئے واجب الاطاعت نہیں سمجھتا، وہ حلال اسی کو گردانتا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے حلال کیا، اور حرام اسی کو مانتا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام کیا، لیکن چونکہ اس کو براہ راست آں حضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم (کے اقوال و احوال) کا علم حاصل نہیں، اور وہ آپ کے مختلف اقوال میں تطبیق دینے کی صلاحیت اور آپ کے کلام سے

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص۱۵۲-۱۵۳

مسائل استنباط کرنے کی قدرت نہیں رکھتا، وہ کسی خدا ترس عالم کا دامن پکڑ لیتا ہے' یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ صحیح بات کہتا ہے' اور اگر مسئلہ بیان کرتا ہے تو س میں وہ محض سنت نبوی کا پیرو اور ترجمان ہوتا ہے' جیسے ہی اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہ خیال صحیح نہیں تھا، اسی وقت وہ بغیر کسی بحث و اصرار کے اس کا دامن چھوڑ دیتا ہے' بھلا ایسے آدمی کو کوئی کیسے مطعون کرے گا، اور اس کو د شریعت کا مخالف قرار دے گا؟!

سب کو معلوم ہے کہ استفتاء اور افتاء کا سلسلہ عہد نبوی سے لے کر برابر چلتا رہا ہے' اور ان دونوں میں کیا فرق ہے کہ ایک آدمی ہمیشہ ایک سے فتویٰ لیتا ہے' یا کبھی ایک سے فتویٰ لیتا ہے کبھی دوسرے سے' ایسی حالت میں کہ اس کا ذہن صاف ہے' اس کی نیت سلیم ہے' اور وہ صرف اتباع شریعت چاہتا ہے' یہ بات کیسے جائز نہیں؟ جبکہ کسی فقیہ کے بارے میں ہمارا یہ ایمان نہیں ہے کہ اللہ نے اس پر آسمان سے فقہ اتاری' اور ہم پر اس کی اطاعت فرض کی ہے' اور یہ کہ وہ معصوم ہے تو اگر ہم نے ان فقہاء اور ائمہ میں سے کسی کی اقتداء کی تو محض اس بناء پر کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا عالم ہے' اس کا قول (فتویٰ) دو حالتوں میں سے کسی ایک حالت سے خالی نہیں' یا وہ کتاب و سنت کے صریح حکم پر مبنی ہے' یا وہ استنباط کے اصولوں میں سے کسی اصول کے مطابق اس سے مستنبط کیا ہوا ہے' یا اس نے قرائن سے یہ سمجھ لیا ہے کہ حکم فلاں علت کے ساتھ وابستہ ہے (اور وہ علت یہاں پائی جاتی ہے) اور اس کا قلب اس بات پر مطمئن ہو گیا ہے'

اس بناء پر اس نے غیر منصوص کو منصوص پر قیاس کیا، گویا وہ زبان حال سے کہتا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا کہ جہاں یہ علت پائی جائے وہاں حکم یہ ہوگا، اور یہ قیاسی مسئلہ اس عموم اور کلیہ میں شامل ہے، اس طرح اس حکم کی نسبت بھی آں حضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کی جاسکتی ہے، لیکن ظنی طریقہ پر، اگر صورت حال یہ نہ ہوتی تو کوئی صاحب ایمان کسی مجتہد کی تقلید نہ کرتا، اگر ہمیں رسول معصوم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جن کی طاعت کو اللہ تعالٰی نے ہم پر فرض کیا ہے کوئی حدیث قابلِ وثوق سند سے پہونچے جو اس مجتہد یا امام کے فتوے اور قول کے خلاف ہو، اور ہم اس حدیث کو چھوڑ دیں اور اس ظنی طریقہ کی پیروی کریں، تو ہم سے بڑھ کر ناروا طریقہ اختیار کرنے والا کون ہوگا، اور کل ہمارا خدا کے سامنے کیا عذر ہوگا؟"[1]

مذاہب اربعہ کی خصوصیت

اس منصفانہ اور محققانہ تجزیہ کے بعد شاہ صاحبؒ ان چار فقہی مذاہب (حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی) کے بارے میں جن پر عالم اسلام میں عام طور پر عمل کیا جا رہا ہے، اپنے رسالہ "عقد الجید فی أحکام الاجتهاد والتقلید" میں جو بہ قامت کہتر بقیمت بہتر کا مصداق ہے، تحریر فرماتے ہیں:۔

"یاد رکھو کہ ان مذاہب اربعہ کے اختیار کرنے میں بڑی مصلحت ہے، اور

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۵۵-۱۵۶

ان چاروں کو بالکل نظر انداز کر دینے میں بڑا مفسدہ ہے، اس کے کئی وجوہ واسباب ہیں، ایک یہ کہ امت کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ شریعت کے معلوم کرنے کے بارے میں وہ سلف متقدمین پر اعتماد کرے، تابعین نے اس بارے میں صحابہؓ پر اعتماد کیا اور تبع تابعین نے تابعین پر، وعلی ہذا القیاس ہر دور کے علماء نے اپنے پیشروؤں پر اعتماد کیا، عقل سے بھی اس کا مستحسن ہونا ثابت ہوتا ہے، اس لئے کہ شریعت کے علم کا ذریعہ نقل اور استنباط ہے اور نقل جب ہی ممکن ہے، جب ہر طبقہ اپنے اس پہلے طبقہ سے جو اس سے متصل ہے اخذ کرے، استنباط میں بھی یہ ضروری ہے کہ متقدمین کے مذاہب معلوم ہوں تاکہ ان کے اقوال کے دائرہ سے خارج ہو کر خرق اجماع نہ ہو جائے، اس لئے ان اقوال کے جاننے اور سابقین سے مدد لینے کی ضرورت ہے، دوسرے علوم وفنون اور ہنروں اور پیشوں کا بھی یہی حال ہے، صرف نحو، طب، شاعری، لوہاری، نجاری، رنگ ریزی سب اسی وقت حاصل ہوتے ہیں، جب ان کے استادوں اور ان کے ساتھ اشتغال رکھنے والوں کی صحبت اختیار کی جائے، اس کے بغیر مہارت حاصل ہو جائے ایسا بہت کم پیش آتا ہے، اگرچہ عقلاً ایسا ممکن ہے لیکن واقعۃً ہوتا نہیں۔

جب یہ بات متعین ہو گئی کہ سلف کے اقوال وتحقیقات پر اعتماد ضروری ہے تو پھر یہ ضروری ہو گیا کہ جن اقوال پر اعتماد کیا جا رہا ہے، وہ سند صحیح سے مروی، مشہور کتابوں میں مدوّن ہوں، اور ان پر ایسا کام ہوا ہو کہ اس میں راجح اور مرجوح اور عام وخاص کا امتیاز آسان ہو، جہاں اطلاق پایا جاتا ہے، وہاں

یہ پتہ چل سکے کہ اس میں مقید کیا ہے؟ مختلف اقوال میں تطبیق دی جاچکی ہو، اور احکام کے علل پر روشنی ڈالی جاچکی ہو، نہیں تو ایسے مذاہب واجتہادات پر اعتماد صحیح نہیں ہوگا۔ ان پچھلے ادوار میں کوئی مذہب (فقہی) بھی ایسا نہیں ہے، جس میں یہ صفات پائے جاتے ہوں، اور یہ شرطیں پوری ہوتی ہوں سوائے ان مذاہب اربعہ کے۔[1]

اس طرح شاہ صاحب نے اجتہاد و تقلید کے درمیان وہ نقطۂ اعتدال اختیار کیا ہے، جو مقاصد شریعت، فطرت انسانی اور واقعات کی دنیا سے پورے طور پر مطابق ہے انھوں نے تقلید کے ساتھ یہ شرط لگا دی ہے کہ اس بارے میں ذہن صاف اور نیت درست ہو کہ مقصود صاحب شریعت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اتباع اور کتاب وسنت کی پیروی ہے اور یہ اس اعتماد پر ہے کہ ہم جس کو واسطہ بنا رہے ہیں، وہ کتاب وسنت کا عالم اور شریعت اسلامی کا محض نمائندہ اور ترجمان ہے، نیز یہ کہ ذہن اس کے لئے تیار رہے (خواہ اس کا موقعہ مدتوں میں آئے) کہ جب اس بات کا یقین پیدا ہو جائیگا کہ صورت حال اس سے مختلف ہے، اور سنت سے ثابت حکم دوسرا ہے تو ایک صاحب ایمان کو دوسری شکل کے اختیار کرنے میں کبھی تامل نہ ہوگا۔

فلا وربك لا يؤمنون حتى يحكموك	تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ جب تک
فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا في	اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں
انفسهم حرجا مما قضيت	اور جو فیصلہ تم کر دو اس سے اپنے دل میں
ويسلموا تسليما ○	تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے
(سورۂ نساء-۶۵)	مان لیں تب تک مومن نہیں ہوں گے۔

---

[1] عقد الجید ص ۳۶-۳۸

ہر زمانہ میں اجتہاد کی ضرورت

مذاہب اربعہ کی خصوصیات اور فقہائے محدثین کی خدمات اور ان کی عظمت کا پورا اعتراف کرتے ہوئے اور اس فقہی و حدیثی ذخیرہ کو بیش قیمت اور قابل استفادہ قرار دیتے ہوئے اور اس سے بے نیازی و استغناء کو ضرر و محرومی کا سبب مانتے ہوئے شاہ صاحب اس کے قائل ہیں کہ اجتہاد (اپنی شرطوں اور ضروری احتیاطوں کے ساتھ) ہر دور کی ضرورت، حیات انسانی اور تمدن و معاشرت کی تغیر پذیری، اور نمو و ارتقا کی صلاحیت اور انسانی ضروریات' حوادث و تغیرات کے تسلسل کا فطری تقاضا اور شریعت اسلامی کی وسعت' اس کے من جانب اللہ ہونے اور قیامت تک انسانوں کی رہنمائی اور معاشرہ کے جائز تقاضوں کی تکمیل کی صلاحیت رکھنے کا ثبوت ہے، جس کا اظہار اور ثبوت ہر دور میں ضروری اور حاملین شریعت کا فرض ہے۔

مقدمہ مصفّٰی میں لکھتے ہیں:۔

"اجتہاد ہر زمانہ میں فرض بالکفایہ ہے' یہاں اجتہاد سے مراد اجتہاد مستقل نہیں، جیسا کہ امام شافعیؒ کا اجتہاد تھا جو جرح و تعدیل' زبان دانی وغیرہ میں کسی دوسرے کے محتاج نہ تھے' اور اسی طرح اپنی مجتہدانہ درایت میں (اپنے پورے اقسام کے ساتھ) وہ دوسرے کے تابع نہ تھے، مقصود اجتہاد منتسب ہے' اور وہ نام ہے احکام شرعی کو ان کے تفصیلی ادلہ کے ذریعہ جاننے کا، اور مجتہدینؒ کے طریقہ پر تفریع مسائل اور ترتیب احکام کا، خواہ وہ کسی صاحب مذہب کی رہنمائی سے ہو۔

اور ہم جو یہ کہتے ہیں کہ اجتہاد اس زمانہ میں فرض ہے (اور یہ محققین اہل علم کا اجماعی مسئلہ ہے) اس کی وجہ یہ ہے کہ مسائل کثیر الوقوع ہیں جن کا حصر ممکن نہیں، اور ان کے بارے میں اللہ کے حکم کا جاننا واجب ہے، اور جو تحریر و تدوین میں آچکا ہے وہ ناکافی ہے، اور ان کے بارے میں اختلافات بہت ہیں، جن کا حل کرنا دلائل کی طرف رجوع کئے بغیر ممکن نہیں، ائمہ مجتہدین سے جو مسائل کی روایات منقول ہیں ان میں اکثر میں انقطاع ہے کہ قلب ان پر اطمینان کے ساتھ اعتماد نہیں کر سکتا، اس لئے ان کو قواعد اجتہاد پر پیش کئے اور تحقیق کئے بغیر معاملہ بنتا نہیں[1]۔"

---

[1] مقدمہ مصفّٰی (فارسی) صـ۱۲ مطبع فاروقی دہلی۔

بابِ ہفتم

شریعتِ اسلامی کی مربوط و مدلل ترجمانی اور اسرار و مقاصدِ حدیث کی نقاب کشائی حجۃ اللہ البالغۃ کے آئینہ میں

حجۃ اللہ البالغہ کا امتیاز و انفرادیت

شاہ صاحبؒ کی سب سے معرکۃ الآراء کتاب اور علمی کارنامہ "حجۃ اللہ البالغہ" ہے جس میں دین و نظامِ شریعت کا ایک ایسا مربوط، جامع اور مدلل نقشہ پیش کیا گیا ہے، جس میں ایمانیات، عبادات، معاملات، اخلاق، علم الاجتماع و تمدن، سیاست و احسان" کو ایک ایسے ربط و تعلق اور صحیح تناسب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ وہ ایک ہار کے موتی اور ایک زنجیر کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں اور ان میں اصول و فروع، مقاصد و وسائل اور دائمی و موقت کا فرق نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے پاتا، جو ان بہت سی تصنیفات و تحقیقات کی قدیم کمزوری ہے جو کسی غلو یا نا انصافی کے ردِ عمل یا کسی جذبہ یا جوش کے ماتحت لکھی گئی ہیں، اس ربط و تناسب کی وجہ (شاہ صاحب کی فطری سلامتِ طبع و اعتدال کے علاوہ) ان کا علمِ حدیث کا گہرا اور وسیع مطالعہ اور وہ مخصوص مزاج ہے جو حدیث اور سیرت کے اشتغال یا مزاجِ نبویؐ سے مناسبت رکھنے والے کسی "عالمِ ربانی" کی صحبت و تربیت میں پیدا ہوتا ہے، اسلام کی یہ مربوط و جامع ترجمانی جو حجۃ اللہ کے صفحات میں دیکھنے میں آتی ہے،

بہت کم دینی تصنیفات میں نظر آئیگی[1]، اس طرح حجۃ اللہ البالغہ اس دورِ عقلیت کے لئے ایک نیا علم کلام بن گیا ہے، جس میں ایک حق پسند و سلیم الطبع انسان کے لئے (جس کو علمی استعداد اور دقتِ نظر کا بھی کچھ حصہ ملا ہو) تشفی کا وافر سامان ہے، ہمارے علم میں کسی مذہب کی تائید اور اس کی حکیمانہ توجیہ و تشریح میں (ان زبانوں میں جن سے ہم واقف ہیں) اس پایہ کی کتاب نہیں لکھی گئی، اور اگر لکھی گئی تو اس وقت علمی دنیا کے سامنے نہیں ہے۔

بارہویں صدی کے کچھ بعد ہی ہندوستان اور پورے عالم اسلام میں (مختلف تعلیمی، تمدنی، علمی و عقلی اسباب کی بناء پر) ایک خاص طرح کی "عقلیت" کا جو دور شروع ہونے والا تھا، اور احکام شریعت کے اسرار و مصالح کی جستجو کا جو عام ذوق پیدا ہونے والا تھا اور اس کی وجہ سے بہت سے ذہن بھٹکنے اور بہت سے قلم بہکنے کے لئے تیار تھے، خاص طور پر حدیث اور سنت (خاص اسباب کی بناء پر) اعتراضات و شبہات کا سب سے زیادہ نشانہ بننے والی تھی[2]، ان نئے تقاضوں سے صحیح طور پر وہی شخص عہدہ برآ ہو سکتا تھا جو کتاب و سنت علومِ حکمت، علمِ کلام، علم الاخلاق، علم النفس (اور اپنے زمانہ کے حدود کے اندر) علم الاقتصاد، علم المعیشت اور علم السیاست سے واقف ہو، پھر ان سب کے ساتھ احسان اور تزکیہ کے

---

[1] معاصر عرب فضلاء و اہل نظر میں راقم سطور نے زعیمِ مغرب علامہ علال الفاسی مراکشی مصنفِ "مقاصد الشریعۃ الاسلامیہ و مکارمہا" اور معالی الاستاذ محمد المبارک سابق عمید کلیۃ الشریعۃ و وزیر شام کو شاہ صاحب کی روح اور حجۃ اللہ البالغہ کی تعریف میں ہمیشہ رطب اللسان پایا، وہ خاص طور پر اسی پہلو سے متاثر تھے کہ اس کتاب میں دین کے تمام شعبوں یہاں تک کہ اخلاق اور تزکیۂ نفس و احسان تک کی نمائندگی و ترجمانی ہے۔

[2] اس کی تفصیل مصنف کے رسالہ "اسلامی مزاج و ماحول کی تشکیل و حفاظت میں حدیث کا بنیادی کردار" میں دیکھی جا سکتی ہے، ملاحظہ ہو صفحہ ۲۱-۲۵

فن کے جوہر و حقیقت سے نہ صرف آگاہ بلکہ اس میں درجۂ اجتہاد پر فائز ہو۔

اس سب کا اقتضاء تھا کہ اس دور کے شروع ہونے سے پہلے بارہویں صدی کے امام کے قلم سے ایسی کتاب لکھوا دی جائے، جو اس ضرورت کو اس بڑی حد تک پورا کرے، جو کسی ایسے انسان کے قلم سے ممکن ہے، جو بہرحال انسان ہے، وہ نہ معصوم ہے، نہ اس کا علم سارے زمانوں، مقامات، اور معلومات پر محیط ہے، اس پر اپنے زمانہ کی (کم سے کم درجہ میں) چھاپ اور اس نظام تعلیم و تربیت کا اثر بھی ہے، جس میں اس نے نشو و نما پایا ہے، پھر بھی وہ اصلاً دانش کدۂ قرآنی اور درس گاہ حدیث و سنت کا فیض یافتہ اور ان کا ترجمان نظر آتا ہے۔

شاہ صاحبؒ کتاب کی تصنیف کے محرّکات و دواعی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"علوم حدیث میں سب سے باریک، دقیق و عمیق، رفیع و بدیع علم اسرار دین کا وہ علم ہے، جس میں احکام کی حکمتیں اور ان کے لِمّیات اور خواص اعمال کے اسرار و نکات بیان کئے جائیں، جن کے ذریعہ انسان شریعت کی لائی ہوئی چیزوں کے بارے میں صاحب بصیرت بن جاتا اور خلط و خبط سے محفوظ رہتا ہے[1]۔"

موضوع کی نزاکت

لیکن حقائق دینی اور احکام شرعی کی حکمتوں، مصالح اور اسباب و علل کے بیان کرنے کا موضوع بڑا نازک ہے، ذرا سی بے اعتدالی، کسی خاص رُجحان کے غلبہ یا زمانہ کے اثر سے پڑھنے والے کا ذہن شرائع سماوی اور تعلیمات نبویؐ کی پٹڑی سے اتر کر جس میں اصل مقصود رضائے الٰہی، قربِ خداوندی اور نجاتِ اخروی کو قرار دیا گیا ہے، مادّی منافع زندگی

---

[1] مقدمہ حجۃ اللہ البالغہ صٓ۳

بہتر تنظیم اور تمدنی فوائد یا سیاسی مقاصد کے حصول کی پٹری پر پڑ جاتا ہے اور سعی و جہد کے پورے سلسلہ سے ایمان و احتساب[1] کی روح یا تو بالکل نکل جاتی ہے یا بہت کمزور و مجروح ہو کر رہ جاتی ہے، مثال کے طور پر نماز کی حکمت و مصلحت یہ بیان کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک فوجی پریڈ ہے اور اس سے نظم و اطاعتِ امیر اور حکومت اسلامی کے قیام میں مدد ملتی ہے، روزہ صحت کے لئے مفید ترین طریقہ ہے، زکوٰۃ اہل دولت پر غریبوں کا ٹیکس ہے، حج ایک سالانہ بین الاقوامی اسلامی موتمر (کانفرنس) ہے، جس میں ملت کے مفاد میں مسائل پر غور و مشورہ کیا جاتا ہے۔

ان خطرات کے پیش نظر (جنھوں نے امکانات و احتمالات سے بڑھ کر واقعات اور عملی مثالوں کی جگہ لے لی ہے) اس موضوع سے صحیح طور پر وہی عالم عہدہ برآ ہو سکتا تھا، جس کے ہاتھ میں دین و شریعت کا اصل سر رشتہ ہو، جو شرائع الٰہی کے نزول اور انبیاء کی بعثت کے مقصد سے آگاہ ہو، اور جس کے رگ و پے میں ایمان و احتساب کی روح سرایت کر چکی ہو، اور جس کا ذہنی و علمی نشو و نما کتاب و سنت اور ایمان و احتساب کے ماحول میں اور ان کے زیر سایہ ہوا ہو، اور شاہ صاحب (جیسا کہ ان کے حالات سے معلوم ہو چکا ہے) اس نازک موضوع پر قلم اٹھانے کے لئے موزوں ترین شخصیت تھے۔

---

[1] حدیث و سنت کی اصطلاح میں کسی عمل کو اجر و ثواب کی لالچ اور شوق اور اس پر اللہ کی طرف سے جو وعدے ہیں ان کے یقین کے ساتھ کرنے کو "احتساب" کہتے ہیں، صحیح حدیث میں آتا ہے "من صام رمضان ایمانا واحتسابا غفرلہ ما تقدم من ذنبہ" (بخاری) (جو رمضان کے روزے اللہ کے وعدوں پر یقین کرتے ہوئے اور اس کے اجر و ثواب کے شوق و طمع میں رکھے گا اس کے سب پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے) قیام لیلۃ القدر کے بارے میں بھی ایسی ہی حدیث وارد ہوئی ہے۔

مستقل تالیف کی ضرورت اور علمائے متقدمین کی ابتدائی کوششیں

شاہ صاحبؒ اس موضوع پر متقدمین کی مختصر کاوشوں کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"متقدمین نے ان مصالح کی نقاب کشائی کی ہے جن کی ابواب شرعی میں رعایت کی گئی ہے بعد کے محققین نے بعض بڑے قیمتی نکتے بھی بیان کئے ہیں، لیکن اس کی مقدار اتنی ہی ہے کہ اب اس موضوع پر کلام کرنا خرق اجماع نہیں رہا، کسی نے اس موضوع پر مستقل تصنیف نہیں کی، اور اس کے اصول و فروع کو پورے طور پر مرتب نہیں کیا۔"[1]

اس سلسلہ میں شاہ صاحب نے امام غزالیؒ، علامہ خطابی، اور شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام کا حوالہ دیا ہے، جن کی کتابوں اور تحریروں میں جستہ جستہ ایسے مضامین اور اشارے ملتے ہیں[2]، شاہ صاحب نے اس دعوے کی تردید کے سلسلہ میں کہ احکام شرعی مصالح پر مشتمل نہیں ہیں، اور اعمال و جزا میں مناسبت کا ہونا کچھ ضروری نہیں ہے، ان آیات و احادیث سے استدلال کیا ہے، جن میں اعمال اور ان کے نتیجہ میں ربط بتایا گیا ہے، بعض احکام کی علت و مصلحت بھی بیان کی گئی ہے نیز ان احادیث کا بھی ذکر کیا ہے جن میں کسی عبادت یا عمل کی مشروعیت کا سبب یا تعیینات کے اسرار بیان کئے گئے ہیں، نیز بعض ممانعتوں کے ان اسباب اور حکمتوں کی مثالیں بھی دی ہیں، جو حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ سے منقول ہیں[3]، اور ان خیالات و ظنون کی تردید فرمائی ہے، اور ان کا جواب دیا ہے، جو اس نازک عمل کی تدوین کو ناممکن یا غیر مفید یا "فعل جدید" بتلاتے ہیں، اور اس کی وضاحت کی ہے کہ اس موضوع کی طرف اس وقت پوری توجہ نہ ہونے کے

---

[1] مقدمہ حجۃ اللہ البالغہ ص۳ [2] ایضاً ص۱ [3] ایضاً ص۵-۶

کیا اسباب تھے[1]

اس فن کی تدوین کی ضرورت و حکمت بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ بعض ایسی احادیث کو جو بظاہر ہر طرح سے مخالفِ قیاس معلوم ہوتی ہیں، بعض فقہاء نے مخالف عقل بتا کر ان کو رد کرنا جائز سمجھا، اس لئے بھی احادیث کے مطابق عقل و قیاس ہونے کو ثابت کرنا ضروری ہو گیا[2]، امت کے مختلف طبقات کا متعارض طرز عمل بعض کا عقل و قیاس سے بالکل آنکھیں بند کر لینا، بعض کا تاویل اور ایسے موقع پر "صرف عن الظاہر" کا بے تکلف عمل کرنا جہاں احادیث اصول عقلیہ کے مخالف نظر آئیں اور اس بارے میں بہت سی جماعتوں کی بے اعتدالی، شاہ صاحب کے نزدیک اس فن کی تدوین جدید کو نہ صرف جائز و مفید قرار دیتی ہے، بلکہ اس کو دین کی عظیم ترین خدمت اور وقت کی اہم ضرورت ثابت کرتی ہے[3]۔

ضرورت کے اس احساس، علمی تجربے اور وقت کے تقاضے کے ماسوا شاہ صاحب کو اس کام کی تکمیل کے لئے بعض بشارات غیبی اور بارگاہِ رسالتؐ سے ایک ایسا اشارہ بھی معلوم ہوا جس سے اندازہ ہوا کہ دین کی ایک نئی نوعیت کی شرح مطلوب ہے، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ "میں نے سینہ میں ایک ایسی روشنی پائی جو برابر بڑھتی رہی، مکہ معظمہ کے زمانۂ قیام میں امام حسنؓ اور امام حسینؓ کو خواب میں دیکھا کہ انھوں نے مجھے قلم عطا کیا اور کہا کہ یہ ہمارے نانا رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا قلم ہے[4]!"

شاہ صاحب کے تلامذہ اور اصحاب میں سب سے زیادہ ان کے ماموں زاد بھائی، برادر نسبتی، سفر حضر کے رفیق اور تلمیذ رشید شیخ محمد عاشق پھلتی کا اس کام کی تکمیل کے لئے سب سے زیادہ تقاضا و اصرار تھا جو شاہ صاحب کے سب سے بڑے مزاج داں اور ان کے علوم و کمالات سے سب سے زیادہ واقف تھے[5]۔

---

[1] مقدمہ حجۃ اللہ البالغہ ص۷ [2] ایضاً ص۹ [3] ایضاً [4] ایضاً ص۱۳ [5] ایضاً ص۱۲

بہر حال اللہ تعالیٰ نے شاہ صاحب کو اس اہم کام کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائی اور ان کے قلم سے یہ جلیل القدر کتاب نکل کر اہل علم کے ہاتھوں تک پہونچی۔[1]

تمہیدی و بنیادی مضامین، تکلیف و مجازات

کتاب کے ابتدائی حصہ میں شاہ صاحب نے ان تمہیدی مباحث کو شامل کیا ہے جن سے ہدایت ربانی، تعلیمات آسمانی اور انبیاء کی بعثت اور ان کی تعلیم و تربیت کی ضرورت ثابت ہوتی ہے، یعنی اصولی

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ سب سے پہلے بھوپال کے عالم و باخدا وزیر و منتظم ریاست مدار المہام مولانا جمال الدین (م ۱۲۹۹ھ) کے ایماء و ہدایت پر انہیں کے مصارف سے مولانا محمد حسن صدیقی (م ۱۳۱۲ھ) کے اہتمام میں مطبع صدیقی بریلی میں ۱۲۸۶ھ میں طبع ہوئی، دوسری مرتبہ امیر الملک والاجاہ نواب سید صدیق حسن خان بہادر (م ۱۳۰۷ھ) کے حکم سے ۱۲۹۶ھ میں مطبع بولاق مصر سے اس کی اشاعت ہوئی، مصر سے اس کے دو ایڈیشن اور نکلے ۱۳۵۲ھ (۱۹۳۳ء) میں مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب کے اہتمام میں المکتبۃ السلفیہ لاہور نے اس کا ایک ایڈیشن نکالا جو مصری ایڈیشن کا آفسٹ ہے، مصر سے حال میں اس کا چوتھا ایڈیشن نکلا ہے جو مشہور مصری عالم اور اخوانی رہنما سید سابق کی تحقیق و مراجعت، مفصل مقدمہ اور مصنف علام کے تعارف اور سوانح کے ساتھ دار الکتب الحدیثہ قاہرہ اور مکتبۃ المثنیٰ بغداد کی طرف سے شائع ہوا ہے، لیکن کتاب کی تصحیح و تحشیہ، تخریج احادیث اور اشارات کی توضیح کے ذریعہ جو خدمت ہونی چاہیے تھی وہ ابھی تک نہیں ہوئی۔

اردو میں اس کے دو ترجمے شائع ہوئے، پہلا ترجمہ اپنے عہد کے فاضل جلیل عالم متبحر مولانا عبد الحق حقانی کے قلم سے "نعمۃ اللہ السابغۃ" کے نام سے دو حصوں میں مکمل ہوا، یہ ترجمہ ۱۳۰۵ھ میں مکمل ہوا تھا اور ۱۳۱۲ھ میں مطبع احمدی دہلی سے شائع ہوا، بعد میں نور محمد اصح المطابع آرام باغ کراچی سے دوبارہ شائع ہوا، دوسرا ترجمہ مولانا خلیل احمد صاحب اسرائیلی کے قلم سے "آیات اللہ الکاملہ" کے نام سے مطبع اسلامی کی طرف سے شائع ہوا۔

لیکن یہ کتاب ان کتابوں میں نہیں ہے جن کا محض کسی زبان میں منتقل کر دینا اور لفظی ترجمہ کر دینا کافی ہو، اس لیے اگر اردو خواں اصحاب ان ترجموں سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا سکے اور ان کو اس کتاب کے مضامین کی بلندی اور افادیت کا صحیح اندازہ نہیں ہوا۔

اور بنیادی بحث وہ ہے جو انھوں نے "باب سرّ التکلیف" کے عنوان کے ماتحت پیش کی ہے اور جس میں ثابت کیا ہے کہ "تکلیف[1]" نوعِ انسانی کے فطری تقاضوں میں سے ہے، انسان اپنی زبانِ استعداد سے سوال کرتا ہے کہ خدا اس پر ایسی چیز واجب کرے جو قوتِ ملکیہ کے مناسب ہو، پھر اس پر ثواب دے، اور اس پر قوتِ بہیمیہ میں انہماک کو (جو اس کے اندر ودیعت ہے) حرام کرے اور اس کو سزا دے[2]، اس سلسلہ میں شاہ صاحب کے حیوانات، نباتات اور نوعِ انسانی کے وسیع اور دقیق مطالعہ کا اظہار ہوتا ہے، نیز طبیعیات و طب اور نباتات سے واقفیت بھی ظاہر ہوتی ہے، شاہ صاحب نے عقلی طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ انسانوں کو حیوانات و نباتات سے جو امتیاز حاصل ہے، اور ان میں جو استعدادیں اور فطری طلب رکھی گئی ہے، وہ زبانِ حال سے تکلیفِ شرعی اور ہدایتِ ربانی کا سوال کرتی ہے، شاہ صاحب اس کو "التکفّف الحالی" (زبان حال سے بھیک مانگنا اور ہاتھ پھیلانا) کے بلیغ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، اس کے ساتھ التکفّف العلمی (علمی دریوزہ گری) کا اضافہ کرتے ہیں۔

ان کے نزدیک انسان کے اندر (عقل و نطق کے علاوہ) دو چیزیں اور ہیں "زیادۃ القوۃ العقلیۃ" اور "براعۃ القوۃ العملیۃ" اس میں انسان کے اندر صرف قوتِ عقلیہ اور قوتِ عملیہ کا وجود ہی نہیں، بلکہ ان کی ترقی، بلند ہمتی، طلب کمال، ناآسودگی بھی اس کی فطرت میں ہے، شاہ صاحب کے نزدیک خلقِ ملائکہ، حوادثِ عظیمہ اور ارسالِ رُسل اسی کا نتیجہ ہے، وہ یہ سب (عنایۃ بالنوع) اس اعتنا و اہتمام کا کرشمہ ہے جو پوری نوعِ انسانی کے شاملِ حال ہے، اور یہ سب ربوبیت و رحمتِ الٰہی کی تجلّیات ہیں، ان کے نزدیک

---

[1] خدا کا اپنے بندوں کو مخاطب کرنا اور اوامر و احکام پر عمل کرنے اور مناہی سے بچنے کا مکلّف بنانا جس کو قرآن مجید میں "الأمانۃ" کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے "اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ" (الأحزاب۔ ۷۲) کی تفسیر ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۹

[2] ایضاً ص ۲۰

عبادات اور عمل بالشرائع نوعِ انسان کا ایسا ہی نوعی تقاضا ہے جیسا درندوں کا گوشت کھانا، بہائم کا گھاس چرنا، اور شہد کی مکھیوں کا اپنے سردار (یعسوب) کی فرماں برداری کرنا البتہ حیوانات کے علوم الہامِ جبلّی سے تعلق رکھتے ہیں، اور انسان کے علوم، اعمال، کسب، نظر یا وحی یا اتباع سے تعلق رکھتے ہیں۔[1]

اس کے بعد پھر شاہ صاحب مجازات (جزا و سزا) کو تکلیف شرعی کا قدرتی تقاضا بتاتے ہیں، ان کے نزدیک اس کے چار[2] اسباب ہیں (۱) صورت نوعیہ کا تقاضا (۲) ملأ اعلیٰ کے اثرات[3] (۳) شریعت کا مقتضیٰ (۴) نبی کی بعثت کا نتیجہ و تقاضا، اور اللہ تعالیٰ کے اس کی قبولیت و نصرت کے فیصلہ کا لازمہ[4]، پھر انسانوں میں اپنی جبلت میں اختلاف کی وجہ سے اخلاق و اعمال اور مراتب کمال میں بھی اختلاف ہوتا ہے، اس موقع پر شاہ صاحبؒ نے "ملکیت" اور "بہیمیت" کے اجتماع، ان کے غلبہ و ضعف کے تناسب اور ان کے باہمی تعلق کی نوعیت کی (جن کو وہ "تجاذب" و "اصطلاح" کے الفاظ سے ادا کرتے ہیں) آٹھ[5] شکلیں اور ان کے خواص بیان کئے ہیں، اور ان میں جن کو ترجیح حاصل ہے اس کا ذکر کیا ہے، یہ بحث اور تفریع شاہ صاحبؒ کی قوتِ استقراء اور ذہانت کا نمونہ اور کتاب کی خصوصیات میں ہے[6]، اور ان سے انسانوں کے احوال و فطرت کا دقیق مطالعہ معلوم ہوتا ہے۔

اعمال کی اہمیت اور ان کے اثرات

شاہ صاحبؒ اعمال کی اہمیت، ان کا ملکاتِ انسانی پر اثر، ان اعمال کے دنیا اور

---

[1] باب انتفاق التکلیف من التقدیر ص۲۰-۲۲ [2] شاہ صاحبؒ نے کتاب کے شروع ہی میں عالم مثال اور ملأ اعلیٰ کو ثابت کیا ہے کہ ان دونوں کے حوالہ کی بار بار ضرورت پیش آئیگی، اور بہت سی احادیث و آیات کا ان دونوں کے بغیر سمجھنا مشکل ہے، ملاحظہ ہو ص۱۳-۱۵ [3] ایضاً ص۲۵ [4] ایضاً

آخرت میں اثرات مرتب ہونے کی شکلیں بیان کرتے ہیں[1] وہ فرماتے ہیں کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اعمال میں (ملأ اعلیٰ کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کی وجہ سے) وہ اثر پیدا ہو جاتا ہے، جو ان تعویذوں اور نقوش میں ہوتا ہے، جو ایسی ہیئت خاصہ اور شرائط کے ساتھ سلف سے منقول ہیں[2]

اس طرح یہ ابتدائی مباحث کتاب کے مطالعہ کرنے والے کے ذہن کو آگے کے ان مباحث کے لئے تیار کر دیتے ہیں، جن کی بنیاد ہی انسان کے نوعی تقاضوں کے سمجھنے، تکلیفات شرعی کے اسباب اور ان پر مرتب ہونے والی مجازات، ربوبیت و رحمت کے تقاضوں اعمال کی اہمیت اور ان کے انسانوں کی ہیئت اجتماعی اور حیاتِ انسانی سے ربط و تعلق اور ان غیبی حقائق اور غیر مرئی عوالم و اشیاء کے وجود کے تسلیم کرنے پر منحصر ہے۔

ارتفاقات

حجۃ اللہ کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کی دور بین نگاہ اور بدلتے ہوئے حالات کے عمیق اور حقیقت پسندانہ مطالعہ نے (تائید الٰہی کی مدد سے) یہ دیکھ لیا تھا کہ جلد وہ زمانہ آنے والا ہے جس میں ایک طرف لوگ احکام شریعت بالخصوص حدیث و سنت کی تعلیمات اور ارشادات نبوی کے حکم و اسرار کے سمجھنے کی کوشش کریں گے اور ان کے تمدنی، اجتماعی، معاشرتی و عقلی فوائد معلوم کرنا چاہیں گے دوسری طرف وہ دین و زندگی میں ربط معلوم کرنا چاہیں گے، اور دینی تعلیمات اور آسمانی ہدایات کو زندگی کے وسیع دائرہ (CANVAS) اور انسانوں کے باہمی روابط اور اسباب و نتائج کے باہمی تعلق کے سیاق و سباق (CONTEXT) میں سمجھنے اور ان کی افادیت معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔

---

[1] ایضاً ص ۲۹-۳۲ [2] ایضاً ص ۳۰

اس لئے شاہ صاحب نے "حجۃ اللہ البالغہ" کو جو اصلاً شریعت کے اسرار و حِکَم اور حدیث وسنت کی عقلی تشریح کے لئے لکھی گئی، نظام تشریعی سے شروع کرنے سے پہلے جو ان اوامر و نواہی پر مشتمل ہوتا ہے جن کا اصلاً تعلق ثواب وعقاب، نجات و فلاح اخروی اور شاہ صاحب کی اصطلاح میں "مبحث البرّ والاثم" سے ہے، کتاب کو ان مباحث سے شروع کیا ہے جن کا تعلق دنیا کے نظامِ تکوینی اور حیاتِ انسانی سے ہے، اور جن کی پابندی سے ایک صحت مند ہیئتِ اجتماعی، اور ایک صالح تمدّن وجود میں آتا ہے، شاہ صاحب نے اس کے لئے "ارتفاقات[1]" کی اصطلاح استعمال کی ہے، جو ہمارے علم میں اس سے پہلے مسلمان متکلمین، فلاسفہ اور علمائے اجتماع نے (کم سے کم اس وضاحت اور تسلسل سے) استعمال نہیں کی۔

ارتفاق کی اہمیت

ارتفاق سے شاہ صاحب کی مراد افراد کا ایک دوسرے سے جائز انتفاع، تعاون، اشتراکِ عمل، اور معتدل و متوازن شہری زندگی کے قیام کے لئے "تدبیرات نافعہ" ہیں[2]۔

اس طرح شاہ صاحب نے انسانی سعادت کے انفرادی و اجتماعی دونوں پہلوؤں اور دنیوی و اخروی دونوں زندگیوں سے بحث کی ہے، شاہ صاحب کے نزدیک یہ نظامِ تکوینی انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے نظامِ تشریعی کے نہ صرف مطابق ہونا چاہیئے، بلکہ اس کے لئے

---

[1] عربی زبان کے سب سے بڑے لغت "لسان العرب" میں رفق کے ذیل میں ہے "یقال للمتطبّب متَرَفِّق و رفیق، والرِّفق والمِرفق والمَرفِق والمَرفَق ما استُعین به، وقد ترفّق به وارتفق، وفی التنزیل "وَيُهَيِّئْ لَكُم مِّنْ أَمْرِكُم مِّرْفَقًا" وهو ما ارتفقت وانتفعت به، وقد ترفّق علیه وارتفق توکّأ، وقال عزّ وجلّ "نِعْمَ الثَّوَابُ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا" وترافق القوم وارتفقوا صاروا رفقاء۔ (لسان العرب باختصار)

[2] مولانا عبدالحق حقانیؒ نے ارتفاقات کا ترجمہ اسی طرح کیا ہے۔

متدو معاون اور ان کے مقاصد کا خادم بن کر رہنا چاہئے، انھوں نے (علمائے اخلاق اور ماہرین اقتصادیات میں) پہلی مرتبہ اقتصادیات وعلم المعیشت کا علم الاخلاق سے گہرا ربط ثابت کیا ہے، شاہ صاحب کے نزدیک یہ ربط جب ٹوٹ جاتا ہے تو معاشیات اور اخلاقیات دونوں کو شدید بحران سے واسطہ پڑتا ہے جس کا اثر مذہب و اخلاق، پُرسکون زندگی انسانوں کے باہمی روابط اور تمدن و تہذیب سب پر پڑتا ہے ان کے نزدیک انسانوں کے اجتماعی اخلاق اس وقت بالکل برباد ہو جاتے ہیں، جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جائے اس وقت انسان (جن کے اندر اللہ نے اعلیٰ روحانی ملکات اور ترقی کے امکانات ودیعت فرمائے ہیں) گدھے اور بیل کی طرح سے روٹی حاصل کرنے کے لئے سرگرداں رہنے لگتے ہیں اور ہر طرح کی سعادتوں اور زرقیوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔

شہری واجتماعی زندگی کی اہمیت اور ان کی شکلیں

شاہ صاحب شہری اور اجتماعی زندگی کی (جس کے مرکز کو وہ "المدینة" سے تعبیر کرتے ہیں) تعریف ایسے علمی انداز میں کرتے ہیں جس سے بہتر اور جامع تعریف اس زمانہ تک (مصنفین وحکماء کے یہاں) نہیں کی گئی تھی "باب سیاسة المدینة" میں لکھتے ہیں:۔

وأعني بالمدينة جماعة متقاربة تجري بينهم المعاملات ويكونون أهل منازل شتى۔[1]	المدینہ (شہر) سے ہماری مراد انسانوں کی وہ جماعت ہے جس میں کسی نوع کی قربت ہو اور ان کے درمیان معاملات میں اشتراک ہو اور وہ مختلف ٹھکانوں میں

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص۴۳

وہ سیاست المدینہ کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

ھی الحکمۃ الباحثۃ عن کیفیۃ حفظ الربط الواقع بین أھل المدینۃ۔[1]	سیاست مُدن سے ہماری مراد وہ حکمت ہے جو اس شہری زندگی کے افراد کے درمیان اس ربط و تعلق کی حفاظت کے طریقوں سے بحث کرے جو ان کے درمیان موجود ہے۔

پھر اس تمدنی زندگی یا المدینہ کی مزید تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

المدینۃ شخص واحد من جھۃ ذلک الربط مرکبٌ من اجزاء و ھیئۃ اجتماعیۃ۔[2]	شہر کو اس ربط کی وجہ سے جو اس کے افراد کے درمیان پایا جاتا ہے، شخص واحد تصور کرنا چاہیئے، جو مختلف اجزاء اور ایک ہیئت اجتماعیہ سے مرکب ہے۔

ان کے نزدیک "ارتفاق" کی دو قسمیں ہیں:۔

۱۔ ابتدائی اور ضروری، جو اہل بادیہ کو بھی حاصل ہوتا ہے۔

۲۔ اجتماعی یا ترقی یافتہ، جو اہل مصر (شہریت و تمدن والوں کو) حاصل ہوتا ہے۔

ان دو کے بعد تیسری قسم آتی ہے، وہ سیاست و انتظام کی ہے پھر اس کے نتیجہ میں چوتھی قسم خلافتِ عامہ کی ہے، ارتفاق رابع میں شاہ صاحب اہل اقالیم (ملک کے متفرق اور دور دراز علاقوں) سے کے باہمی ربط کی حفاظت پر زور دیتے ہیں، یہ ربط (مختلف علاقوں کے درمیان)

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص۴۲ [2] ایضاً

اتنا ہی ضروری ہے، جتنا کہ ایک شہر کے افراد کے درمیان ابتدائی اور محدود حالت میں ضروری تھا۔[1]

مکاسب اور وجوہ معاش کی محمود و مذموم شکلیں

ارتفاقات کے سلسلہ میں حصولِ مکاسب اور وجوہِ معاش بیان کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ غیر طبعی اور غیر اخلاقی ذرائع معاش کا ذکر فراموش نہیں کرتے، فرماتے ہیں:۔

وبقيت نفوسٌ أعيت بهم	بہت سی طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو
المذاهب الصالحة فانقدروا	جائز اور صحت مند راستوں سے
إلى أكساب ضارة بالمدينة	کسب معیشت مشکل معلوم ہوتا ہے تو وہ
كالسرقة والقمار والتكدي۔[2]	ایسے ذرائع معاش کی پستی کی طرف
	اتر آتی ہیں جو شہری و اجتماعی زندگی
	کے لئے ضرر رساں ہوتے ہیں، مثلاً
	چوری، جُوا، دریوزہ گری (بھیک مانگنا)
	اور غیر قانونی و اخلاقی طریقہ مبادلہ۔

اس موضوعِ ارتفاقات کے باب میں شاہ صاحبؒ کے قلم سے بعض ایسے حقائق نکل گئے ہیں، جن سے تمدن و معاشرہ اور انسانیت کے عروج و زوال کی تاریخ پر ان کی گہری نظر معلوم ہوتی ہے، فرماتے ہیں:۔

كلما رقت النفوس وأمعنت	جب طبیعتوں میں غیر طبعی نزاکت،

[1] حجۃ اللہ البالغہ صـ۴۲ [2] ایضاً صـ۴۳

فی حُبِّ اللذّۃ الرفاھیۃ تفرّعت حواشی المکاسب واختص کلّ رجل بکسب۔[۱]

حدِ اعتدال سے بڑھی ہوئی لذت پسندی اور غلو کی حد تک پہونچی ہوئی خوشحالی اور فارغ البالی پیدا ہو جاتی ہے تو کسبِ معیشت کی باریکیاں اور ذیلی قسمیں پیدا ہو جاتی ہیں اور ہر شخص ایک خاص ذریعۂ معاش کا اجارہ دار بن جاتا ہے۔

شاہ صاحب شہری زندگی کو نقصان پہونچانے والی چیزوں میں اس کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ سب اہل شہر ایک ہی ذریعۂ معاش اختیار کرلیں مثلاً سب تجارت شروع کردیں زراعت چھوڑ دیں یا جنگ کے ذریعہ کسب معاش حاصل کریں ان کے نزدیک زراعت بمنزلہ طعام کے ہے اور صنعت و تجارت اور نظم و نسق بمنزلہ نمک کے ہے اسی سلسلہ میں شاہ صاحبؒ ایک بڑے نکتہ کی بات لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ملک کی تباہی کے اس زمانہ میں دو بڑے سبب ہیں۔

۱۔ بیت المال پر بغیر کسی محنت کے بار بننا۔[۲]

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ ص[illegible] [۲] ان بار بننے والوں میں بطور مثال کے شاہ صاحبؒ نے ان سپاہیوں، عالموں، زہد پیشہ صوفیوں اور شعراء اور ان دوسرے گروہوں کو شامل کیا ہے جو ملک میں سلطنت کی کسی خدمت کے بغیر جاگیروں کے مالک اور مفت کی کمائی اور انعامات واکرام کے عادی ہو جاتے ہیں اس میں وہ نظام جاگیرداری بھی آگیا جس نے سلطنت کے مالیہ کو سخت نقصان پہونچایا تھا اور مفت خوروں اور تن آسانوں کا ایک لشکر پیدا کر دیا تھا، اس سے شاہ صاحبؒ کی سیاسی بصیرت اور زوال سلطنت مغلیہ کے اسباب سے گہری واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۲۔ اہل زراعت وتجارت اور اہل حرفہ واہل ہنر پر بھاری ٹیکس لگانا، آخر میں فرماتے ہیں:

فلينتبه أهل الزمان لهذه النكتة۔[1]	ہمارے زمانہ کے لوگوں کو اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے اور ہوشیار ہوجانا چاہئے۔

تمدن ومعاشرہ میں فساد پیدا کرنے والے اسباب میں شاہ صاحب تفریحات کی کثرت کو بھی شمار کرتے ہیں جس سے معاش ومعاد دونوں تغافل کا شکار ہوتے ہیں ان میں شطرنج میں انہماک شکار کی کثرت اور کبوتر پالنے کو شامل کرتے ہیں[2] اسی طرح سے اخلاقی جرائم اور ایسے اعمال کو برداشت کرنا جن کو عام طور پر سلیم الفطرت لوگ اپنی ذات کے لئے برداشت نہیں کرسکتے ہیں، اور ان کو تمدن کے لئے مضر سمجھتے ہیں ان کے نزدیک اس سے حکومتوں کا زوال ظہور میں آتا ہے۔[3]

سعادت اور اس کے اصول چہارگانہ

کتاب کا مبحث رابع مبحث السعادة ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ سعادت کا حصول انسان کے لئے سب سے اہم ہے، اور وہ تہذیب نفس اور قوت بہیمیہ کو قوت ملکیہ کے تابع بنانے سے حاصل ہوتی ہے۔[4]

شاہ صاحبؒ کے نزدیک سعادت کے اصل اصول چار ہیں جن کے لئے انبیاء کی بعثت ہوئی اور ان کی تفصیل شرائع سماوی ہیں، یہ درحقیقت ادیان وشرائع کی بنیادی شعبوں کے جامع عنوانات اور مقاصد بعثت کی تکمیل کے موثر ذرائع ہیں۔

---

[1] ایضاً ص۴۵ [2] ایضاً ص۴۹ [3] ایضاً ص۵۰ [4] ملاحظہ ہو ص۵۸

۱۔ طہارت (جسمانی پاکیزگی جو انسان کو توجہ الی اللہ و تعلق باللہ کے لئے تیار کر دیتی ہے)

۲۔ اخبات الی اللہ تعالیٰ (انابت و توجہ الی اللہ اور عجز و تواضع)

۳۔ سماحت، مکارم اخلاق و معالی امور۔

۴۔ عدالت[1] (ایسا نفسانی ملکہ جس کے افعال کی وجہ سے شہر و قوم کا انتظام بسہولت قائم ہو جاتا ہے۔)

اس طرح شاہ صاحب نے انسان کی شخصیت کی تکمیل تعلق مع اللہ کی تحصیل اور ایک صحت مند اور متعاون معاشرہ کی تشکیل کی بنیادوں پر روشنی ڈالی ہے، جو شریعت آسمانی اور بعثت انبیاء کے مقاصد میں ہے۔

اس کے بعد ان خصال اربعہ کے اکتساب کا طریقہ بتایا ہے[2]، پھر ان حجابات کا ذکر کیا ہے، جو فطرت کے ظہور سے مانع ہیں، ان میں تین قسموں کو لیا ہے، (۱) حجاب الطبع (بشری و نفسانی تقاضوں کا غلبہ) (۲) حجاب الرسم (خارجی حالات و ماحول کا مضر اثر) (۳) حجاب سوء المعرفۃ[3] (غلط تعلیم و تربیت اور پھیلے ہوئے فاسد عقائد کا اثر)، پھر ان کے رفع کرنے کے طریقے بتائے ہیں[4]۔

عقائد و عبادات

کتاب کا اصل مضمون المبحث الخامس ”مبحث البر والاثم“ سے شروع ہوتا ہے، حقیقت میں کتاب کا یہی موضوع و مقصد ہے[5]۔

اصول بر میں شاہ صاحب نے سب سے پہلے توحید کو لیا ہے، اس لئے کہ اسی پر اخبات و انابت کا

---

[1] ان اصول کی تعریف ص۵۲ پر دیکھی جائے۔ [2] ص۵۵-۵۶ [3] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ص۵۶

[4] ص۵۶-۵۹ پر ان کی تشریح ملاحظہ کی جائے۔ [5] ص۵۹

انحصار ہے، جو سعادت کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اس سلسلہ میں شاہ صاحبؒ نے توحید کے چار مراتب بیان کئے ہیں، اور مشرکین عرب کے شرک کی حقیقت واضح کی ہے[1]، توحید کے بعد صفات خداوندی پر ایمان، ایمان بالقدر اور شعائر اللہ کی تعظیم کے (جن میں شاہ صاحب کے نزدیک قرآن، کعبہ، نبی اور صلوٰۃ سب سے واضح اور اہم شعائر ہیں) ذکر کے بعد شاہ صاحبؒ عبادات و فرائض پر آجاتے ہیں، اور وضو و غسل کے اسرار، اسرار الصلاۃ، اسرار الزکاۃ، اسرار الصوم اور اسرار الحج پر اجمالی طور پر بحث کرتے ہیں[2]، یہ مباحث اگرچہ اصولی اور اجمالی ہیں پھر بھی ان میں بعض ایسے نکتے آگئے ہیں، جن کا دوسری جگہ ملنا مشکل ہے۔

مثلاً اسرار الصلاۃ میں شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ عبادت کا یہ طریقہ اوضاع ثلاثہ، قیام رکوع، سجود کا جامع ہے، اس میں بجائے اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف منتقل ہونے کے ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف (قیام سے رکوع، رکوع سے سجود کی طرف) ترقی رکھی گئی ہے، اور یہی عقل و فطرت کے مطابق ہے، پھر شاہ صاحب نے عبادت کے سلسلہ میں اللہ کی عظمت میں تفکر و مراقبہ اور دوامِ ذکر پر اقتصار نہ کرنے کی (جو اشراقیین، حکماء اور ہندوستانیوں کا طریقہ رہا ہے، اور بعض بے قید صوفیوں نے بھی اس کو اختیار کیا) وجہ بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ تفکر و مراقبہ انھیں لوگوں کے لئے ممکن و مفید تھا جن کی طبیعتیں ان سے مناسبت رکھتی تھیں، اور وہ ان کے ذریعہ سے ترقی کر سکتے تھے، نماز فکر و عمل، ذہنی توجہ اور جسمانی مشغولیت کا معجون مرکب ہے، وہ ہر طبقہ کے لئے مفید اور تریاق قوی الاثر ہے، غوائل رسم (ماحول کے خراب اثرات) سے نفع دینے اور طبیعت کے عقل کے تابع ہونے کی مشق کے لئے نماز سے زیادہ کوئی مفید و موثر طریقہ نہیں[3]۔

---

[1] یہ بحث اس کتاب کے باب پنجم میں گذر چکی ہے۔ [2] تفصیل کتاب کے حصۂ دوم میں آئی ہے جس میں احادیث کو سامنے رکھ کر ان پر علیحدہ علیحدہ تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ [3] ص ۳۰

جہاں تک روزہ و حج کا تعلق ہے ان کے بارہ میں اگرچہ اس مبحث میں بھی اشارے کئے گئے ہیں لیکن کتاب کے حصۂ دوم میں ان کے مقاصد اور اسرار و حکمتوں پر جو لکھا گیا ہے، اس کی نظیر اس سے پہلے کسی کتاب میں دیکھنے میں نہیں آئی۔ اس کا ذکر آئندہ صفحات میں اپنی جگہ آئیگا۔

سیاسیاتِ ملّی اور انبیاء کی ضرورت

المبحث السادس کا عنوان "مبحث السیاسات الملّیۃ" ہے، یہ کتاب کا بہت اہم مبحث ہے[1]، اس کے پہلے باب میں شاہ صاحب نے بڑی نکتہ سنجی اور حقیقت پسندی کے ساتھ بتایا ہے کہ انسانی نسلوں کو ہادیانِ طریق اور مقیمینِ ملل (انبیاء) کی ضرورت کیوں پیش آتی رہی ہے، اس کے لئے ان کی فطرت سلیم اور عقل عام کیوں کافی نہیں تھی؟ پھر اس گروہ کے صفات اور ضروری شرائط سے بحث کی ہے اور یہ کہ وہ کب اور کس طرح اپنے مقصد کی تکمیل کر سکتا اور اس میں کامیاب ہو سکتا ہے، یہ باب علم الکلام کی کتابوں میں اثباتِ نبوت کی عام بحثوں سے بالکل الگ نظر آتا ہے، اور اس میں عقلِ عام اور عقلِ سلیم کو مطمئن کرنے کا وہ سامان ہے جو علمِ کلام اور عقائد کی کتابوں میں عام طور پر نہیں ملتا۔ اس مبحث میں منصبِ نبوت اور اس کے خواص پر جو باب ہے، وہ شاہ صاحب کی روحِ شریعت اور حقیقت مزاج نبوت سے واقفیت نفسِ انسانی کے گہرے مطالعہ اور اخلاق کے اندرونی سرچشموں سے باخبری پر دلالت کرتا ہے اس باب میں بعثت انبیاء کے اسباب سے تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

---

[1] صـ ۸۳-۸۴

بعثت مقرونہ

شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ سب سے کامل بعثت اس نبی کی ہوتی ہے جس کی بعثت "مقرون" ہوتی ہے یعنی اس کی بعثت کے ساتھ ایک پوری قوم تبلیغ و دعوت پر مامور اور اس کے فیض صحبت سے تیار ہو کر دوسرے انسانوں کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ بنتی ہے، نبی کی بعثت بالاصالت ہوتی ہے (اور اس کو نبوت کہتے ہیں) امت کی ماموریت اور تفویض خدمت کی نوعیت بالواسطہ و بالنیابۃ ہوتی ہے، آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ایسی ہی جامع بعثت تھی جس کے ساتھ ایک پوری امت کو آپ کے منصب نبوت کی خدمت و اشاعت کے لئے "جارحہ" اور آلہ کار بنایا گیا، اور اس کے لئے بعثت اور بعثت کے ہم معنی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے :-

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	جتنی امتیں پیدا ہوئیں تم ان میں
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ	سب سے بہتر ہو لوگوں کو نیک کام کرنے کو
عَنِ الْمُنكَرِ (آل عمران - ۱۱۰)	کہتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو۔

اور حدیث میں بعثت ہی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے آپ نے صحابہ کرامؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:

فانما بعثتم میسرین ولم تبعثوا	تم تیسیر (آسانی پیدا کرنے کے لئے)
معسرین[1]۔	پیدا کئے گئے ہو تعسیر (مشکلات پیدا
	کرنے کے لئے) نہیں مبعوث کئے گئے ہو۔

اس باب کا خاص مضمون وہ ہے جس میں انبیاء علیہم السلام کی سیرت اور ان کے

---

[1] ص ۸۳

مذاق و مزاج اور ان کے طریق دعوت اور طرز خطاب و تفہیم کو بیان کیا گیا ہے، اس سے شاہ صاحبؒ کی دقیق النظری اور خصائص نبوت اور انبیاء کے گہرے مطالعہ اور قرآن مجید کے عمیق تدبر کا اندازہ ہوتا ہے۔[1]

ایرانی و رومی تمدن میں اخلاقی و ایمانی قدروں کی پامالی اور انسانیت کی زبوں حالی

عہد جاہلیت اگرچہ عرب کے ساتھ مخصوص نہیں تھا، وہ ایک عالمگیر اعتقادی، اخلاقی، معاشرتی اور اقتصادی و سیاسی بحران تھا جو ساری دنیا پر محیط تھا، لیکن ایرانی اور رومی اس کے قائد اور اصل ذمہ دار تھے کہ انھیں کا تمدن اس وقت دنیا میں معیاری سمجھا جاتا تھا، اور اسی کی تقلید ہر جگہ کی جاتی تھی، اور انھیں کے ممالک مرکزی شہر اور معاشرہ سب سے زیادہ اس کی زد میں تھا۔

اس صورت حال کا جو نقشہ شاہ صاحب نے کھینچا ہے اور اس کے جو اسباب بیان کئے ہیں، اس سے بہتر نقشہ سیرت و تاریخ کی کسی کتاب میں جو دور ماضی میں لکھی گئی اور فلسفۂ تاریخ اور علوم عمرانیہ کے کسی فاضل کے قلم سے دیکھنے میں نہیں آیا، یہاں پر آ کر شاہ صاحب کا قلم اپنے پورے جوہر دکھاتا ہے، اور ان کی قوت تحریر اور حسن انشا اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتا ہے۔[2]

یہ مضمون یہاں نقل کیا جاتا ہے کہ اس سے شاہ صاحب کی تاریخ پر گہری نظر حقیقت تک پہونچنے کی صلاحیت، اور صورت حال کے صحیح تجزیہ کی خداداد قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے، شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:-

---

[1] ص ۸۶ [2] یہ حصہ سلاست، زور بیان، حسن انشاء کا ایک نمونہ ہے، اسی بناء پر مصنف نے اس کو عربی ادب کے منتخبات کے مجموعہ "مختارات" میں ایک نمونہ کے طور پر شامل کیا ہے۔

صدیوں سے آزادانہ حکومت کرتے کرتے اور دنیا کی لذتوں میں منہمک رہنے، آخرت کو یکسر بھول جانے اور شیطان کے پورے اثر میں آجانے کی وجہ سے ایرانیوں اور رومیوں نے زندگی کی آسائیوں اور سامانِ راحت میں بڑی موشگافی اور نازک خیالی پیدا کر لی تھی، اور اس میں ہر قسم کی ترقی اور نفاست میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے اور فخر کرنے کی کوشش کرتے تھے، دنیا کے مختلف گوشوں سے ان مرکزوں میں بڑے بڑے صناع اہل ہنر اور اہل کمال جمع ہو گئے تھے، جو اس سامان آرائش و راحت میں نزاکتیں پیدا کرتے تھے، اور نئی نئی تراش خراش نکالتے تھے، ان پر عمل فوراً شروع ہو جاتا تھا، اور اس میں برابر اضافے اور جدتیں ہوتی رہتی تھیں، اور ان باتوں پر فخر کیا جاتا تھا، زندگی کا معیار اتنا بلند ہو گیا تھا کہ امراء میں سے کسی کا ایک لاکھ درہم سے کم کا پٹکا باندھنا اور تاج پہننا سخت معیوب تھا، اگر کسی کے پاس عالی شان محل، فوارہ، حمام، باغات، خوش خوراک اور تیار جانور، خوش رو جوان اور غلام نہ ہوتے، کھانے میں تکلفات اور لباس و پوشاک میں تجمل نہ ہوتا تو ہم چشموں میں اس کی کوئی عزت نہ ہوتی، اس کی تفصیل بہت طویل ہے، اپنے ملک کے بادشاہوں کا جو حال دیکھتے اور جانتے ہو اس سے قیاس کر سکتے ہو۔[1]

یہ تمام تکلفات ان کی زندگی اور معاشرت کا جزو بن گئے تھے، اور ان کے دلوں میں اس طرح رچ بس گئے تھے کہ کسی طرح نکل نہیں سکتے تھے، اس کی وجہ سے ایک ایسا لاعلاج مرض پیدا ہو گیا تھا جو ان کی پوری شہری زندگی اور ان کے

---

[1] شاہان دہلی اور مغل بادشاہوں کی طرف اشارہ ہے۔

پورے نظام تمدن میں سرایت کر گیا تھا، یہ ایک مصیبت عظمیٰ تھی جس سے عام و خاص اور امیر و غریب میں سے کوئی محفوظ نہیں رہا تھا، ہر شہری پر یہ پُر تکلف اور امیرانہ زندگی ایسی مسلط ہو گئی تھی جس نے اس کو زندگی سے عاجز کر دیا تھا، اور اس کے سر پر غم و افکار کا ایک پہاڑ ہر وقت رکھا رہتا تھا۔

بات یہ تھی کہ یہ تکلفات بیش قرار رقمیں صرف کئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے تھے، اور یہ رقمیں اور بے پایاں دولت کاشتکاروں، تاجروں اور دوسرے پیشہ وروں پر محصول اور ٹیکس بڑھانے اور ان پر تنگی کئے بغیر دستیاب نہیں ہو سکتی تھیں، اگر وہ ان مطالبات کے ادا کرنے سے انکار کرتے تو ان سے جنگ کی جاتی اور ان کو سزائیں دی جاتیں، اور اگر وہ تعمیل کرتے تو ان کو گدھے اور بیلوں کی طرح بنا لیتے، جن سے آبپاشی اور کاشت کاری میں کام لیا جاتا، اور صرف خدمت کرنے کے لئے ان کو پالا جاتا ہے، اور محنت و مشقت سے ان کو کسی وقت چھٹی نہیں ملتی۔

اس پُر مشقت اور حیوانی زندگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو کسی وقت سر اٹھانے اور سعادت اُخروی کا خیال بھی کرنے کا موقعہ اور مہلت نہیں ملتی تھی، بسا اوقات پورے پورے ملک میں ایک فرد بشر بھی ایسا نہ ملتا جس کو اپنے دین کی فکر اور اہمیت ہوتی؟[1]

بعض دوسری مفید بحثیں

اس کے بعد یہ بحث آتی ہے کہ دین کی اصل ایک ہے اور شرائع مناہج میں کیوں خاص

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ، باب اقامۃ الارتفاقات واصلاح الرسوم، ج ۱ ص ۱۰۶-۱۰۷

عصر و قوم کی رعایت سے اختلاف ہوتا ہے، پھر اس کی تشریح فرماتے ہیں کہ دین کی ایک اصل ہونے کے باوجود ان مناہج پر مؤاخذہ کیوں ہوتا ہے؟

تیسیر، ترغیب و ترہیب کے اسرار وغیرہ کی ذیلی بحثوں کے بعد شاہ صاحب ایسے دین کی ضرورت ثابت فرماتے ہیں جو تمام ادیان کا ناسخ ہو، اور یہ کہ دین کو تحریف سے کیسے بچایا جا سکتا ہے، تحریف کن کن دروازوں اور ناکوں سے دین میں داخل ہوتی ہے، وہ کن کن شکلوں میں جلوہ گر ہوتی ہے اور کیسے کیسے قالب اختیار کرتی ہے؟ اور شریعت نے اس کے سدِ باب کے لئے کیا راستے اختیار کئے ہیں اور کیا انتظامات کئے ہیں؟ پھر تفصیل سے بیان کیا ہے کہ عہد بعثت میں عہد جاہلیت کا کیا حال تھا جس کی آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اصلاح فرمائی۔؟

حدیث وسنّت کا مقام اور ان کے بارہ میں امت کا طرزِ عمل

مبحث سابع کا عنوان ہے "مبحث الشرائع من حدیث النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" یہاں پر وہ مباحث آتے ہیں، جن کا براہ راست حدیث وسنت کے فہم، اس سے استنباط مسائل، علوم نبوی کے اقسام، نبی سے شریعت کے اخذ کی کیفیات اور طریقوں، کتب حدیث کے طبقات، کتاب وسنت سے شرعی مطالب کے اخذ کے طریقوں اور مختلف احادیث میں جمع و تطبیق یا ترجیح سے تعلق ہے، اس سلسلہ میں غایت نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی سے بحث کرتے ہوئے شاہ صاحب فروع میں صحابہؓ اور تابعین کے اختلاف کے اسباب بیان کرتے ہیں، ان کی مثالیں دینے کے بعد فقہاء کے مذاہب میں اختلاف اور اہل حدیث و اصحاب الرائے کے اختلاف کے فرق کو بیان کرتے ہیں، چوتھی صدی سے پہلے

اور اس کے بعد لوگوں کے مسائل دریافت کرنے اور ان پر عمل کرنے اور اس بارے میں عوام وخواص کا رویہ اور طرز کیا تھا؟ اس کی تفصیل سے وضاحت فرماتے ہیں جو بڑی دقیق وعمیق بحثوں پر مشتمل ہے اور جن کا علم کلام یا اصول فقہ کی کسی کتاب میں ملنا بہت مشکل ہے۔

فرائض وارکان کے اسرار وحِکَم

شاہ صاحب نے عقائد سے لے کر عبادات، معاملات، احسان وتزکیہ، مقامات، واحوال، کسب معیشت کے طرق، تبرع وتعاون، تدبیر منزل، خلافت، قضا، جہاد، آداب طعام، آداب صحبت، معاشرت اور آخر میں فتن، حوادث مابعد اور علامات قیامت تک کی احادیث سے بحث کی ہے اور اس سلسلہ میں سیرت نبوی کا خلاصہ بھی پیش کر دیا ہے، اور ان مختلف ابواب کے اسرار ومقاصد اس طرح بیان فرمائے ہیں کہ ان مسائل کا ربط زندگی، تمدن اور اخلاقیات سے کہیں ٹوٹنے نہیں پاتا، اور حقیقت میں کتاب کا یہی مرکزی مضمون ہے، شاہ صاحب کا منشا تھا کہ حدیث کی تدریس انھیں حِکَم واسرار کی روشنی میں عمل واخلاق، تمدن ومعاشرت، انسانی سعادت اور باہمی روابط کے تعلق کے ساتھ ہو تاکہ ان کا زندگی، عمل واخلاق، تمدن ومعاشرت پر پورا اثر پڑے، عقل ونقل کا تطابق ثابت ہو اور معترضین کو ان پر اعتراض کرنے اور حدیث وسنت کی قیمت وافادیت اور ان کی اہمیت وضرورت کو کم کرنے (جس کو شاہ صاحبؒ کی دور بین اور حقیقت رس نگاہ نے دیکھ لیا تھا) اور ذہنی انتشار پیدا کرنے کا موقعہ نہ ملے، عملی ارکان اور فرائض چہارگانہ پر شاہ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، وہ انھیں کا حصہ اور "حجۃ اللہ" کے خصائص میں سے ہے، یہاں بطور نمونہ کے صرف روزہ (صیام) اور حج کے مقاصد واسرار اور ان کی اسلامی وشرعی شکل کی حکمت پر

شاہ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کو پیش کیا جاتا ہے۔

صوم پر کلام کرتے ہوئے اور اس کی مقدار اور روزوں کی تعداد کے تعین کی حکمت (جو شریعت اسلامی کے ساتھ مخصوص ہے) اور اس کے شرعی احکام پر گفتگو کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"روزہ میں (وقت اور تعداد و مقدار کا) اختیار دے دینے سے تاویل اور فرار کا دروازہ کھل جائیگا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دروازہ بند ہو جائے گا اور اسلام کی یہ سب سے بڑی اطاعت غفلت کا شکار ہو جائیگی"۔[1]

اس کے بعد اس کی مقدار و تعداد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اس کی (مدت کی) تعیین بھی ضروری تھی تاکہ اس میں افراط و تفریط کا موقع نہ ہو، اگر ایسا نہ ہوتا تو کوئی اس پر اتنا عمل کرتا کہ جس سے اس کو کوئی فائدہ نہ پہونچتا اور کوئی اثر مرتب نہ ہوتا، اور کوئی اتنے غلو سے کام لیتا اور اتنی کثرت کرتا کہ اس کی ناطاقتی اور کمزوری حد کو پہونچ جاتی، اور وہ نیم مردہ ہو کر رہ جاتا، اصل میں روزہ تریاق ہے جو نفس کے زہر کو مارنے کے لئے مہیا کیا جاتا ہے، اس لئے اس میں مقدار کی رعایت ضروری ہے"۔[2]

پھر روزہ کی دونوں قسموں (یعنی ایک وہ روزہ جس میں کھانے پینے اور ان تمام چیزوں سے جو روزہ کے منافی ہیں، مکمل پرہیز کیا جاتا ہے، اور دوسرے وہ روزہ جس میں بعض چیزوں سے پرہیز کیا جاتا ہے اور بعض سے نہیں) کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے اوّل الذکر کو ترجیح دیتے ہیں اور تجربہ، تحلیل علمی اور علم النفس کی روشنی میں اس کی افضلیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۳۷ [2] ایضاً

"تقلیلِ غذا کے دو طریقے ہیں ایک یہ کہ خوراک کی مقدار کو کم کر دیا جائے، دوسرؔ
یہ کہ کھانوں کے درمیان وقفہ اتنا طویل کر دیا جائے کہ یہ مقصد پورا ہو سکے،
شریعت میں یہی آخر الذکر صورت اختیار کی گئی ہے، اس لئے کہ اس سے بھوک
اور پیاس کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، حیوانی خواہشات پر چوٹ پڑتی ہے اور
محسوس طور پر نظر آتا ہے کہ اس میں کمی آئی ہے، اس کے برخلاف اول الذکر
صورت میں ۔ اس کے کہ آدمی پر کوئی خاص اثر مرتب ہو، غذا کے تسلسل کی وجہ سے
یہ بات پیدا نہیں ہو پاتی، دوسرے یہ کہ اول الذکر کے لئے کوئی عمومی قانون بنانا
بہت مشکل بات ہے، اس لئے کہ لوگ مختلف حالات رکھتے ہیں، ایک آدمی
ایک پاؤ کھاتا ہے، دوسرا آدھ سیر کھاتا ہے، چنانچہ اس قسم کے تعین سے اگر ایک کا
بھلا ہو گا تو دوسرے کا نقصان بھی ہو گا۔"[1]

وہ کہتے ہیں کہ اس تعین اور اوقات کی پابندی میں اعتدال ضروری ہے، لکھتے ہیں:۔

"یہ بھی ضروری تھا کہ یہ مدت تکلیف مالا یطاق میں مبتلا کرنے والی نہ ہو مثلاً
تین دن تین راتیں، اس لئے کہ یہ شریعت کے موضوع سے خارج اور اس کے مقصد
کے خلاف ہے، اور عام طور پر اس پر عمل بھی ناممکن ہے۔"[2]

حج کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے، وہ بالکل منفرد اور یگانہ بحث ہے، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

"(حج کے مقاصد میں) اس میراث کی حفاظت بھی ہے، جو سیدنا ابراہیمؑ اور
سیدنا اسمٰعیلؑ نے ہمارے لئے چھوڑی ہے، اس لئے کہ یہ دونوں ملتِ حنیفی کے
امام اور عرب میں اس کے مؤسس اور بانی کہے جا سکتے ہیں، حضور صلے اللہ

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۳۷ [2] ایضاً ص ۳۱

علیہ وآلہ وسلم کی بعثت بھی اسی لئے ہوئی تھی کہ ملت حنیفی آپؐ کے ذریعہ دنیا میں غالب آئے اور اس کا پرچم بلند ہو۔

اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے "مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ"[1] (ملت ہے تمہارے باپ ابراہیمؑ کی) اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس ملت کے امام سے جو چیزیں ہم کو ورثہ میں ملی ہیں مثلاً خصائل فطرت[2] اور مناسک حج، اس کی ہم حفاظت کریں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

قفوا علی مشاعرکم فانکم علی إرث من إرث أبیکم۔	اپنے مشاعر (مقامات حج) پر ٹھہرو اس لئے کہ تم اپنے باپ کی ایک وراثت کے وارث ہو[3]۔

نیز اس کی ایک دوسری حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"جس طرح حکومت کو ہر تھوڑے عرصہ کے بعد ایک عام جائزہ اور معائنہ کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ اس کو معلوم ہو جائے کہ کون وفادار ہے، کون باغی، کون فرض شناس ہے کون کام چور؟ نیز اس کے ذریعہ اس کی ایمانداری کی شہرت ہو اور اس کا نام اونچا ہو، اس کے کارندے اور باشندے ایک دوسرے سے تعارف حاصل کریں، اسی طرح ملت کو حج کی ضرورت ہے تاکہ منافق و غیر منافق

---

[1] سورہ حج ۔ ۷۸ [2] ان خصائل فطرت سے مراد یہ دس چیزیں ہیں، مونچھیں ترشوانا، داڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، پانی سے ناک صاف کرنا، ناخن کاٹنا، انگلی کے پوروں کا دھونا، بغل کے بال اکھاڑنا، موئے زیر ناف صاف کرنا، پانی سے استنجا کرنا، ختنہ کرنا، ابوداؤد بروایت حضرت عائشہؓ (دسویں چیز کے بارے میں راوی کہتے ہیں میں بھول گیا شاید وہ کلی ہے لیکن قاضی عیاضؒ اور امام نوویؒ نے دسویں چیز ختنہ بتائی ہے) [3] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۴۲

میں تمیز ہو سکے، اللہ تعالیٰ کے دین میں اور اللہ تعالیٰ کے دربار میں جوق جوق جماعتیں حاضر ہوں، لوگ ایک دوسرے سے تعارف حاصل کریں اور ہر شخص اس چیز میں جو اس کے پاس نہیں ہے دوسرے سے استفادہ کرے اس لئے کہ بہترین ومرغوب اشیاء بالعموم صحبت ورفاقت سے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر ہی حاصل ہوتی ہیں۔"[1]

نیز وہ فرماتے ہیں:۔

"حج چونکہ ایک ایسا موقعہ ہے جس میں سبھی جمع ہوتے ہیں اس لئے وہ غلط قسم کے رسوم[2] سے حفاظت کے لئے بہت مفید ہے، ملت کے اپنے اماموں اور پیشواؤں کے حالات یاد کرنے اور ان کی اتباع کا جذبہ دل میں پیدا کرنے کے لئے کوئی چیز اس درجہ کی نہیں جو اس کا مقابلہ کر سکے۔"[3]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

"(حج کے) مقاصد میں وہ بات بھی ہے جس کے لئے حکومتیں نمائش یا سرکاری جشن کیا کرتی ہیں، جس کو دیکھنے کے لئے قریب ودور ہر جگہ کے آدمی جمع ہوتے ہیں، ایک دوسرے سے ملتے ہیں، اپنی حکومت اور اپنی ملت کی تعلیمات سے آشنا ہوتے ہیں اور اس کے مقدس مقامات کی تعظیم بجالاتے ہیں، اسی طرح حج مسلمانوں کی نمائش یا سرکاری جشن ہے جس میں ان کی شوکت ظاہر ہوتی ہے، ان کی قوتیں مجتمع ہوتی ہیں، ان کی ملت کا نام روشن ہوتا ہے۔"

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۵۹۔۶۰ [2] اس میں دینی تحریف، بدعات، اور مقامی اضافے اور جدتیں سب شامل ہیں۔ [3] ایضاً ص ۵۹۔۶۰

اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے :۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا[لہ] — اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے خانہ (کعبہ) کو لوگوں کے لئے ایک مقامِ رجوع اور مقامِ امن مقرر کیا۔[۲]

کتاب کی جامعیت

اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ فقہ، حدیث، عقائد، عبادات و معاملات سے تعلق رکھنے والے ابواب و مباحث کے، سوا اس میں تدبیرِ منزل، خلافت و قضا، ابوابِ معیشت اور آدابِ صحبت کے مباحث بھی ہیں، جو اخلاق و معاشرت اور تمدن و معیشت سے تعلق رکھتے ہیں اور عام طور پر کسی فقہی یا کلامی کتاب میں ان کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

احسان و تزکیۂ نفس

پھر اس پر مستزاد شاہ صاحب نے اس میں حدیث و سیرت کی روشنی میں احسان و تزکیہ کا ایسا نظام مرتب کر کے پیش کر دیا ہے جس پر چل کر انسان قربِ خداوندی کے اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج، مراتبِ ولایت اور مقامات و احوال تک پہونچ سکتا ہے، احسان کا یہ باب کتاب کے ص ۲۲ سے ص ۱۰۱ تک پھیلا ہوا ہے، اس باب میں شاہ صاحب نے انھیں وسائل سے بحث کی ہے جو احادیثِ صحیحہ میں آئے ہیں، صرف ان میں استحضار، عزم و نیت اور کیفیاتِ باطنی اور قالب کے ساتھ روح کی طرف توجہ کرنے پر زور دیا ہے، ساتھ ہی ساتھ ان عوارض

لہ سورہ بقرہ ۔ ۱۲۵ ؎۲ حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۳۲

وامراض کا جو پیش آتے رہتے ہیں، علاج انھیں طرقِ مشروعہ اور انھیں فرائض وعبادات واذکار سے تجویز کیا ہے، اس کے ساتھ اخلاق رذیلہ کے علاج اور اخلاق فاضلہ کے حصول کا طریقہ بھی شریعت وسنت کے منصوص طریقوں سے بتایا ہے۔

اس بحث میں اذکار ماثورہ، ادعیہ مشروعہ اور استغفار کے اہم صیغے بھی جمع کر دیئے ہیں، اور مؤثر اور مقبول دعا کا طریقہ اور اس کے شرائط بھی بتائے ہیں، اس سلسلہ میں طبعی تقاضوں اور زندگی کی ضرورتوں اور دینی اعمال کو نیت کے استحضار کے ساتھ ادا کرنے پر زور دیا ہے، اور ان کے اثر وکیفیت کے جدا ہونے کو واضح کیا ہے، فرماتے ہیں:-

اعلم ان النیّة روح والعبادة	یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ نیت روح ہے،
جسد، ولاحیاة للجسد بدون	اور عبادت جسد، جسد کی حیات روح
الروح، والروح لها حیاة	کے بغیر ممکن نہیں، روح بدن کی
بعد مفارقة البدن، ولکن	مفارقت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے،
لایظهر آثار الحیاة کاملة بدونه	لیکن آثارِ حیات کا کامل طور پر بدن
	کے بغیر ظہور نہیں ہوتا۔
ولذلک قال الله تعالیٰ "لَنْ	اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اللہ تک
يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا	ان قربانیوں کے گوشت اور خون
وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ"	نہیں پہونچیں گے، وہاں پہونچنے والی
(الحج-۳۷)	چیز تمہارا تقویٰ ہے۔
وقال رسول الله صلی الله علیه	اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے
وآله وسلم "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ"	فرمایا، اعمال کا دارومدار نیات پر ہے۔

پھر نیت کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

واعنی بالنیۃ المعنی الباعث علی العمل من التصدیق بما أخبر بہ اللہ علی ألسنۃ الرسل من ثواب المطیع وعقاب العاصی أوحبّ امتثال حکم اللہ فیما أمر ونھی۔[1]	نیت سے ہماری مراد تصدیق کی وہ ذہنی کیفیت ہے جو اس عمل پر آمادہ کرے تصدیق اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے ذریعہ اطاعت کرنے والے کو ثواب اور نافرمانی کرنے والے کو سزا کا جو وعدہ کیا ہے وہ اس حکم کی تعمیل اور اس معصیت سے احتراز کا سبب ہے۔

اس باب کے آخر میں شاہ صاحب نے اخلاق فاضلہ کے حصول، حقوق العباد کی ادائگی اور حسن معاشرت کے سلسلہ میں کچھ حدیثوں کا انتخاب فرما کر نقل کر دیا ہے، جن پر عمل کرنے سے انسان احسان وتزکیہ کے اعلیٰ درجہ پر پہونچ سکتا ہے، پھر ان مقامات واحوال کا ذکر کیا ہے جو احسان وتزکیہ کے نتیجہ میں حاصل ہوتے ہیں اور نور باطنی، قلب کی بیداری اور نفس کی صفائی، رضائے خداوندی اور ملأ اعلیٰ کی تائید ومسرت کا نتیجہ ہیں۔

جہاد

اس کتاب میں جہاد پر بھی پورا ایک باب ہے[2] اور اس کو شاہ صاحب نے ان فکر انگیز اور چونکا دینے والے الفاظ سے شروع کیا ہے، جو ادیان وملل کی پوری تاریخ، مقاصد خلق انسانی

---

[1] ایضاً جلد دوم ص۸۳-۸۴ [2] ایضاً ص۱۷۰-۱۷۸

اورخالق کائنات کے نظامِ مطلوب پر گہری نظر رکھنے والا عارف ہی لکھ سکتا ہے :۔

اعلم ان أتم الشرائع وأكمل	یاد رکھو کہ مکمل ترین شریعت اور
النواميس هو الشرع الذي	کامل ترین قانون وہ شریعت ہے
يؤمر فيه بالجهاد۔[1]	جس میں جہاد کا حکم دیا گیا ہو۔

اس کے بعد اس کی تشریح کی ہے اس کو عقلاً نقلاً ثابت کیا ہے پھر فضائل جہاد کے اصول واسباب بیان کئے ہیں[2]۔

غرض یہ کتاب اپنی جامعیت، عمق، دین وشریعت کی وسیع لیکن مربوط ترجمانی اور ان صدہا بیش قیمت نکات وتحقیقات کی بناء پر جو کتاب کے صفحات پر جابجا پھیلے ہوئے ہیں اسلامی کتاب خانہ میں متعدد حیثیتوں سے بالکل ایک انفرادی شان رکھتی ہے، اور اس کی تصدیق کرتی ہے کہ "کم ترک الأول للآخر" مولانا شبلیؒ نے اپنی مشہور کتاب علم الکلام میں صحیح لکھا ہے :۔

"ابن تیمیہؒ اور ابن رشد کے بعد بلکہ خود انہیں کے زمانہ میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا، اس کے لحاظ سے یہ امید نہیں رہی تھی کہ پھر کوئی صاحبِ دل ودماغ پیدا ہوگا، لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھلانا تھا، کہ اخیر زمانہ میں جبکہ اسلام کا نفس بازپسیں تھا، شاہ ولی اللہؒ جیسا شخص پیدا ہوا، جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی، ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

"شاہ صاحبؒ نے علم الکلام کے عنوان سے کوئی تصنیف نہیں کی اور اس بناء پر

---

[1] ایضاً ص ۱۷۱ [2] ایضاً

ان کو متکلمین کے زمرہ میں شمار کرنا بظاہر موزوں نہیں لیکن ان کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ جس میں انھوں نے شریعت کے حقائق اور اسرار بیان کئے ہیں؛ درحقیقت علم کلام کی روح رواں ہے[۱]"

فاضل عصر مولانا عبدالحق صاحب حقانی (صاحب تفسیر حقانی، و عقائدالاسلام) حجۃ اللہ البالغہ کے ترجمہ نعمۃ اللہ السابغہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:۔

"جس فن میں یہ کتاب ہے آپ سے پہلے کسی نے اس کو ایک جگہ جمع نہ کیا تھا، اس فن کا موضوع نظام تشریعی محمدی "من حیث المصلحۃ المفیدۃ" ہے" اور غایت اس کی یہ ہے کہ انسان کو یہ معلوم ہو جائے کہ خدا اور اس کے رسولؐ کے احکام میں نہ کچھ تنگی ہے، نہ وہ خلاف فطرت سلیمہ ہیں؛ تاکہ ان پر انسان کو پورا وثوق ہو جائے اور ان کو فطرت پر مبنی باتیں سمجھ کر دل ان کی طرف کھنچ آئے اور کسی متشکک کے بہکانے سے دل میں شبہ نہ پڑ جائے اور حد اس کی یہ ہے کہ وہ علم جس سے قوانین دینیہ اور احکام شرعیہ کی حکمت معلوم ہوتی ہے اور مبادی اس کے تمام علوم ہیں[۲]"

---

[۱] علم الکلام ص ۱۰۹-۱۱۱   [۲] مقدمہ نعمۃ اللہ السابغہ۔

باب ہشتم

نظامِ خلافت کی ضرورت وافادیت، خلفائے راشدین کی خلافت کا ثبوت اور انکے احسانات کتاب "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" کے آئینہ میں

کتاب ازالۃ الخفا کی اہمیت وانفرادیت

"ازالۃ الخفا" شاہ صاحبؒ کی (حجۃ اللہ البالغہ کے بعد) دوسری معرکۃ الآراء تصنیف ہے اور اپنی بہت سی خصوصیات کی بنا پر اپنے موضوع پر منفرد اور یگانہ کتاب ہے، پوری کتاب وجد آفریں اور ولولہ انگیز علمی اور ذوقی نکات سے لبریز ہے، خاص طور پر شاہ صاحبؒ کے قرآن مجید میں طویل تدبر، وہبی مناسبت، انکی دقیق وعمیق فہم آیات کے اشارات ومضمرات کی طرف انتقالِ ذہنی، اور دقتِ استنباط اور وفورِ ذکاوت کے ایسے نمونے ملتے ہیں کہ ایک انصاف پسند اور سلیم الطبع انسان خود بخود اس نتیجہ پر پہونچ جاتا ہے کہ یہ علم محض کتابی اور اکتسابی نہیں ہے، اس کتاب کا مصنف اپنے زمانہ کے مروجہ نصاب درس، کتب تفسیر، اصول فقہ وعلم کلام کا ساختہ پرداختہ اور ان کا خوشہ چین اور زلہ ربا نہیں ہے، اس علم کا تعلق موہبتِ خداوندی اور افاضۂ ربانی سے ہے، خود شاہ صاحبؒ کے قلم سے بے اختیار کتاب کے آغاز ہی میں یہ الفاظ نکل گئے ہیں:۔

لاجرم نور توفیق الٰہی در دل ایں   واقعہ یہ ہے کہ توفیق الٰہی کے نور نے

بندۂ ضعیف علمے را شرح وبسوط
گردانید تا آنکہ بعلم الیقین دانستہ
شد کہ اثبات خلافت ایں بزرگواراں
اصلیست از اصول دین تا وقتیکہ
ایں اصل را محکم نگیرند ہیچ مسئلہ
از مسائل شریعت محکم نہ شود[1]

اس بندۂ ضعیف کے دل میں (ایک
منتقل علم کو) اس شرح وبسط کے
ساتھ القا کیا کہ اس کو علم الیقین
کے ساتھ معلوم ہو گیا کہ ان حضرات
(خلفائے راشدین) کی خلافت کا
اثبات اصول دین میں سے ایک
اصل عظیم ہے، جب تک اس اصل کو
پوری مضبوطی کے ساتھ تسلیم نہیں
کیا جائیگا، شریعت کے مسائل میں سے
کسی مسئلہ کو استحکام حاصل نہیں ہوگا۔

اُن صاحبِ کمال علماء کی بھی جو بہت سے مسائل میں شاہ صاحبؒ سے اختلاف رکھتے تھے، اور جن کو علوم عقلیہ میں توغل، بلکہ درجۂ امامت حاصل تھا، جب اس کتاب پر نظر پڑی تو وہ مصنف کے تبحر علمی اور ژرف نگاہی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکے، مولانا محسن بن یحییٰ ترہتی صاحبؒ "الیانع الجنی" کہتے ہیں کہ میں نے اپنے استاد مولانا فضل حق خیر آبادی (م ۱۲۷۸ھ) کو دیکھا کہ جو وقت خالی ہوتا تھا اس میں کسی کتاب کے مطالعہ میں منہمک و مستغرق ہیں، ہم لوگ خلاف معمول ان کے اس استغراق کو دیکھ کر متعجب ہوئے اور تجسس پیدا ہوا کہ یہ کیا کتاب ہے؟ اور کس کی تصنیف ہے؟ انھوں نے خود ہی فرمایا کہ "اس کتاب کا مصنف ایسا بحر زخار ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں" معلوم ہوا کہ یہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تصنیف "ازالۃ الخفا" ہے، جس کا ایک نسخہ

---

[1] ازالۃ الخفا (مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور) ص۱

مولانا کے ہاتھ آ گیا ہے"۔[۱]

فخر المتاخرین ابو الحسنات مولانا عبد الحی فرنگی محلی (م ۱۳۰۴ھ) جن کا تبحرِ علمی نادرۂ روزگار جامعیت اور وسعتِ نظر مشہور و مسلّم ہے، اپنی مشہور کتاب "التعلیق المُمجّد علی مؤطا الامام محمد" میں ازالۃ الخفا کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں "کتاب عدیم النظیر فی بابہ"[۲] (کتاب اپنے موضوع پر بے نظیر اور عدیم المثال ہے۔)

"حجۃ اللہ" اور "ازالۃ الخفا" کا باہمی تعلق

حجۃ اللہ البالغہ کی تصنیف کے بعد جس میں اسلام کا جامع و مربوط نظام اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ زندگی اور معاشرہ و تمدن سے اس کا ربط و تعلق ثابت ہوتا ہے اور یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اسلام کے پیش کئے ہوئے عقائد و عبادات اور اجتماعی زندگی کے احکام پر عمل کئے بغیر کسی صحت مند معاشرہ، صالح تمدن اور معتدل و متوازن اجتماعیت کے وجود کی توقع نہیں کی جا سکتی، اس مقصد کی توضیح و تکمیل اور اس مرحلہ کو عالمانہ و محققانہ شان کے ساتھ (جس میں قریبی زمانہ میں آنے والے دور انقلاب کی عقلیت پسند طبیعتوں اور دماغوں کی تسکین و تشفی کا سامان تھا) اس کی ضرورت تھی کہ خود اسلام کے نظامِ اجتماعی کے مزاج و خصوصیات اور مقاصد و دائرۂ عمل پر نیز اس کے عالمگیر و دائمی، اور صریح و منصوص ادارہ "خلافت" پر اسی شرح و بسط، نقل و عقل کی مدد، تاریخ کی شہادت اور سب سے بڑھ کر کتاب و سنت کی روشنی میں قلم اٹھایا جائے نیز ان غلط فہمیوں اور گمراہیوں کا

---

[۱] "الیانع الجنی" ص۹۳ مطبوعہ علی رجال الطحاوی، و نزہۃ الخواطر ج ۶ ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی۔

[۲] التعلیق الممجد مطبع یوسفی ص۲۵

پردہ چاک کیا جائے، جو اس سلسلہ میں زمانۂ قدیم سے رونما ہوئی ہیں، اور ان کی بنیاد پر ایک بڑے فرقہ کا وجود عمل میں آیا ہے، جس نے خاص طور پر شاہ صاحب کے دور میں ایرانی عنصر کے غلبہ کی بناء پر ایک ایسا ذہنی انتشار پیدا کر دیا تھا، جس کا اثر عقائد و اعمال کے حدود سے آگے بڑھ کر نظام حکومت اور ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار اعلیٰ پر بھی پڑا تھا، اور اس نے اس ملک میں مسلمانوں کے مستقبل کو مشکوک و مشتبہ بنا دیا تھا۔

اس کی حیثیت (ان لوگوں کی نظر میں جو اس مذہب کی تاریخ اس کے بنیادی عقائد اور اس کے دین کے تصور و فہم سے واقف تھے اور جنھوں نے براہ راست اس کی مستند کتابوں اور اصلی مآخذ کا مطالعہ کیا تھا) محض ایک اجتہادی اختلاف یا دائرۂ شریعت کے اندر ایک ذیلی فرقہ کی نہیں تھی، بلکہ وہ اس فہم دین کے متوازی جس کی بنیاد کتاب و سنت، منصبِ نبوت کی عظمت اور ختم نبوت کے عقیدہ پر تھی ایک مستقل فکر اور دینی تصور تھا۔ اس کا کسی قدر اندازہ فرقہ اثنا عشریہ کے عقیدۂ امامت سے ہو سکتا ہے، جس کے نزدیک امامت نبوت کے ہم پلہ ہے بلکہ بعض حیثیتوں سے اس سے بھی فائق ہے۔[1]

---

[1] حال میں انقلاب ایران کے قائد روح اللہ خمینی صاحب جو "آیت اللہ العظمیٰ الامام الخمینی" کے نام سے مشہور ہیں کی کتاب "الحکومۃ الاسلامیۃ" مطبوعہ ایران کی اس میں ص۵۲ پر "الولایۃ التکوینیۃ" کے عنوان سے یہ لکھنے کے بعد کہ امام کو خلافت تکوینی حاصل ہوتی ہے اور اس عالم کے تمام ذرات ان کی حکومت و اقتدار کے تابع اور فرماں بردار ہوتے ہیں، حسب ذیل عبارت آئی ہے:—

وإن من ضروريات مذهبنا أن لأئمتنا مقاماً لا يبلغه ملك مقرب ولا نبي مرسل، وبموجب ما لدينا من الروايات والأحاديث فإن الرسول الأعظم (ص) والأئمة (ع) كانوا قبل هذا العالم أنواراً فجعلهم الله بعرشه محدقين وجعل لهم من المنزلة والزلفى ما لا يعلمه إلا الله۔
(الحكومة الإسلامية۔ کتابخانۂ بزرگ اسلامی۔ ایران)

ہمارے دین کے قطعی الثبوت مسائل میں سے یہ ہے کہ ہمارے اماموں کو وہ مقام حاصل ہے جس کو نہ کوئی مقرب فرشتہ پہونچ سکتا ہے نہ نبی جس کی بعثت ہوئی اور ہماری روایات اور احادیث کے بموجب رسول اعظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ائمہ (علیہم السلام) اس عالم سے پہلے انوار (روشنیاں) تھے اللہ نے ان کو اپنے عرش کا احاطہ کرنے والا بنا دیا اور ان کو ایسا مرتبہ اور قرب عطا فرمایا جس کا علم صرف اللہ کو ہے۔

شاہ صاحبؒ کتاب کی تالیف کی اولین غرض وغایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

می گوید فقیر حقیر ولی اللہ عفی عنہ کہ دریں
زمان بدعت تشیّع آشکار شدہ نفوس
عوام بشبہات ایشان متشرب گشت
واکثر اہل ایں اقلیم در اثبات خلافت
خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ
علیہم اجمعین شکوک بہم رسانیدند۔[1]

فقیر حقیر ولی اللہ عفی عنہ کہتا ہے کہ
اس زمانہ میں تشیّع کی بدعت کا
شیوع ہوا، عوام کی طبیعتیں ان کے
پیدا کئے ہوئے شبہات سے گھرے
طریقہ پر متاثر ہوئیں اس علاقہ کے
اکثر باشندوں کے دل میں خلفائے
راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم
اجمعین کے ثبوت خلافت کے
بارے میں طرح طرح کے شکوک
واعتراضات پیدا ہوگئے۔

شاہ صاحبؒ کی نظر اس تشکیکی فتنہ کی ظاہری سطح ہی پر نہیں تھی، اس کی تہہ میں جو گہری سازش کام کر رہی تھی، اور اس کے جو دور رس نتائج ظاہر ہونے والے تھے، (مثلاً اسلام کا اپنے اولین و بہترین دور میں ناکام ثابت ہونا او صحبت و تربیت نبوی کی بے اثری صحابۂ کرامؓ کے ذریعہ خیر القرون میں قرآن کی حفاظت، سنّت کی اشاعت اور جن امور پر اتفاق ہوا اس سب پر بے اعتمادی) ان کو بھی دیکھ رہی تھی، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

ہر کہ در شکستن ایں اصل سعی می کند
بحقیقت ہدم جمیع فنون دینیہ

جو شخص بھی خلافت راشدہ کی صحت
کے اصول کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے

---

[1] ازالۃ الخفا ص

می خواہد[۱]۔ اور دین کے اس اصل کا انکار کرتا ہے، وہ حقیقت میں تمام فنونِ دینیہ کو منہدم کردینا چاہتا ہے۔

آگے تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"خلفائے راشدین آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم اور آپ کی امت کے درمیان قرآن مجید کے اخذ و تلقی میں واسطہ ہیں[۲]"

اس کے بعد وہ اس دائرہ میں ان علوم اور شعبوں کو بھی شامل کرتے ہیں جن کی دولت خلفائے راشدین ہی کے ذریعہ امت کو حاصل ہوئی، مثلاً علم حدیث، علم فقہ اور اس سے بڑھ کر مجتہد فیہ مسائل میں کسی ایک خاص شکل پر اجماع کا انعقاد اور اختلاف امت کا خاتمہ نیز علم احسان (جس کا نام بعد کے زمانہ میں علم سلوک پڑ گیا) اس کے بعد مراتبِ علم حکمت؛ اخلاقِ فاضلہ اور اخلاقِ رذیلہ کی وضاحت اور ان کا فرق، تدبیر منزل اور سیاستِ مدن شاہ صاحب کے نزدیک یہ سب علوم و کمالات امت کو خلفائے راشدین ہی کی تعلیم اور طریق عمل سے حاصل ہوئے، اور امت اس بارے میں ان کی رہینِ منت ہے[۳]۔

اس لئے یہ عین مناسب تھا کہ حجۃ اللہ البالغہ کے بعد جو گویا اسلام کی علمی و نظری تفہیم و تشریح ہے یہ دکھایا جائے کہ واقعات کی دنیا میں نبوت کے بعد کے متصل دور میں کس طرح کامیابی کے ساتھ ان اصول و تعلیمات کو عملی شکل دی گئی، زندگی پر کس خوش اسلوبی کے ساتھ ان کا انطباق ہوا، معاشرۂ انسانی پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے، دو قدیم باجبروت اور صاحب اقتدار تمدن (جنھوں نے متمدن دنیا آپس میں تقسیم کر رکھی تھی اور جن کی

۱؎ ازالۃ الخفا ص ۱/۲ ۲؎ ایضاً ص ۲ ۳؎ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ص ۲

تاریخ صدیوں کی پرانی تھی) جن سلطنتوں (دولت ساسانیہ اور دولت روما) کے سایہ میں اوران کی رہنمائی اور سرپرستی میں پھل پھول رہے تھے' اور حیات انسانی پر اثر انداز ہو رہے تھے' وہ کس طرح نیست و نابود ہوئیں[1]۔

چند قدیم تصنیفات

اسلام کے نظام اجتماعی' سلطنت اور اس کے دائرۂ عمل پر (مرتبہ اور کیفیت سے قطع نظر تعداد و کمیت کے لحاظ سے بھی) ہمیں قدیم ذخیرۂ کتب میں بہت کم کتابیں ملتی ہیں' اس موضوع پر امام ابو یوسفؒ (۱۱۳ھ - ۱۸۲ھ) جو امام اعظم امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد رشید اور خلافت عباسیہ کے قاضی القضاۃ تھے' کی کتاب "الخراج" بنیادی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس کا دائرۂ بحث سلطنت اسلامیہ کے ذرائع آمدنی' مالیات اور نظامِ محاصل تک محدود ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی قابل ذکر کتاب قاضی القضاۃ علامہ ابو الحسن علی ابن محمد بن حبیب الماوردی (۳۶۴ھ - ۴۵۰ھ) کی تالیف "الأحکام السلطانیۃ والولایات الدینیۃ" ہے' یہ متوسط سائز کے ۲۵۹ صفحات میں آئی ہے' اس کا مرکزی موضوع امامت اور اس کا حکم شرعی' شرائط' کیفیتِ انعقاد' اس کے تفویض کئے ہوئے مناصب اور امام کے فرائض و واجبات' قضاۃ کے تقرر کے احکام' امامت' ولایت صدقات' اور جزیہ و خراج وغیرہ کے احکام ہیں' اور حدود نیز احتساب وغیرہ کا بیان ہے' خلافتِ راشدہ کی

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "ازالۃ الخفا" عنوان "برہم شدنِ دولت ساسانیہ" ص ۲/۵۴ ـ ص ۲/۵۹ و عنوان "برہم شدن دولت رومیہ" ص ۲/۵۹ ـ ص ۲/۶۳

صحت وثبوت اور خلفائے راشدین کے فضائل ومناقب اور کارناموں سے کوئی بحث نہیں۔

اس موضوع پر سب سے بڑی کتاب "الغیاثی" ہے، اس کا پورا نام "غیاث الامم فی التیاث الظلم" ہے، کتاب کے مصنف امام غزالیؒ کے نامور استاد اور اپنے زمانہ کے استاذ الاساتذہ امام الحرمین ابو المعالی عبد الملک الجوینیؒ (۴۱۹ھ - ۴۷۸ھ)[1] ہیں، یہ کتاب اصلاً دولت سلجوقیہ کے نامور وزیر باتدبیر نظام الملک طوسی (۴۰۸ھ - ۴۸۵ھ) (بانی مدرسہ نظامیہ بغداد و نیشاپور) کے مشورہ وملاحظہ کے لئے تصنیف کی گئی ہے، جو ضابطہ سے ملک الپ ارسلان اور ملک شاہ سلجوقی کے وزیر اور مدار المہام سلطنت تھے، لیکن حقیقتاً اس عظیم سلطنت بلکہ شہنشاہی کے کرتا دھرتا تھے،[2] کتاب درحقیقت امامت کے شرعی احکام، صفات اور فرائض پر ہے، قسم اول میں ائمہ، ولاۃ رعیت اور قضاۃ کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں، اس پر بھی بحث کی گئی ہے کہ اگر کسی زمانہ میں کوئی امام نہ ہو تو کیا کرنا چاہئے، نیز مفتیوں و والیوں کے اوصاف وفضائل بیان کئے گئے ہیں، ان کی غیر موجودگی میں امت کے فرائض کیا ہو جاتے ہیں، اگر منصب امامت پر کوئی نااہل بزور شمشیر مسلط ہو جائے تو مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے؟ اگر زمانہ مفتیوں سے خالی ہو تو امت کا کیا فرض ہے؟ خلع امام کے کیا اسباب ہیں؟ پھر تفصیل سے وہ فقہی احکام بیان کئے گئے ہیں جو مفتیوں کے نہ ہونے کی صورت میں امت کو جاننے چاہئیں، اور ان پر عمل کرنا چاہئے، یہاں پہونچکر

---

[1] یہ کتاب ڈاکٹر عبد العظیم الدیب کی تحقیق سے شیخ عبد اللہ ابن ابراہیم الانصاری کی توجہ اور اہتمام سے حکومت قطر کے "الشئون الدینیۃ" کے مصارف پر ۱۴۰۰ھ میں طبع ہوئی، کتاب کی ضخامت بڑی تختی پر ۶۱۱ صفحات ہیں۔ [2] ابن خلکان، طبقات الشافعیہ وغیرہ، نظام الملک کے حالات وکمالات کے لئے (اردو میں) ملاحظہ ہو "نظام الملک طوسی" از مولوی عبد الرزاق صاحب کانپوری مرحوم۔

کتاب فقہ (شافعی) کی کتاب بن جاتی ہے، کتاب میں خلفائے راشدین کی خلافت کی صحت و اہمیت سے بحث نہیں، وہ درحقیقت امامت کے شرعی احکام، صفات و فرائض پر ہے، کتاب میں جابجا ماوردی کی کتاب "الاحکام السلطانیہ" پر تعریض اور مولف پر اعتراضات بھی ہیں۔

تیسری قابل ذکر کتاب شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (۶۶۱ھ تا ۷۲۸ھ) کی کتاب "السیاسۃ الشرعیۃ فی اصلاح الراعی والرعیۃ" ہے، مصنف علام نے کتاب کے خطبہ میں صراحت سے کہہ دیا ہے کہ یہ مختصر رسالہ ہے جس میں سیاست الٰہیہ اور نیابت نبویہ کے وہ چند اصول و احکام بیان کئے جائیں گے جن سے راعی اور رعیت کوئی بھی مستغنی نہیں، کتاب درحقیقت آیت قرآنی :-

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا	خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت
الْأَمٰنٰتِ إِلٰى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ	والوں کی امانتیں ان کے حوالہ کر دیا
بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ	کرو، اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے
(الیٰ قولہ تعالیٰ) ذٰلِكَ خَيْرٌ	لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔
وَّأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۝	یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا
(سورۃ النساء ۵۸-۵۹)	مآل بھی اچھا ہے

کی تفسیر و تفصیل ہے۔

قسم اول میں باب اول کا عنوان "الولایات" ہے، باب دوم کا "الأموال" ہے اور قسم ثانی میں پہلے حدود اللہ اور حقوق اللہ سے بحث کی گئی ہے، پھر حقوق العباد سے، کتاب متوسط سائز کے ۱۶۸ صفحات پر آئی ہے،[1]

---

[1] ہمارے سامنے اس کا چوتھا ایڈیشن ہے جو ۱۹۶۹ء میں دار الکتاب العربی مصر کی طرف سے شائع ہوا۔

اس کتاب میں بھی خلافت راشدہ اور خلفائے راشدین کے سلسلہ کی اصولی، کلامی اور تاریخی بحثوں سے کوئی تعرّض نہیں کیا گیا، جس کے بارہ میں کتاب کے جلیل القدر مصنف سند اور امام کا درجہ رکھتے تھے اور اگر وہ اس کی طرف توجہ فرماتے تو وہ اسلام کے تحقیقی ذخیرۂ کتب اور مباحث میں گرانقدر اضافہ ہوتا، اس موضوع پر ان کے وسیع علم اور رواں قلم نے "منہاج السنۃ" کے صفحات پر اپنا اصلی جوہر دکھایا ہے، اور اس میں ان کے دریائے علم کی طغیانی اور رہوار قلم کی جولانی کا تماشا دیکھنے میں آتا ہے۔[1]

اسلام میں خلافت کی حیثیت و مقام

قرآن مجید اور حدیث نبویؐ میں دعوت اسلامی اور دین محمدیؐ کے قبول کرنے اور ان پر ایمان لانے والوں کا تصور ایک منظّم اور مربوط جماعت ہی کی شکل میں کیا گیا ہے، ان کے لئے "امت"، "ملّت"، "جماعت" کے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، وہ سب اسی حقیقت پر دلالت کرتے ہیں، اہل بصیرت جانتے ہیں کہ یہ الفاظ کتاب و سنت کی لغت و اصطلاح میں محض تعداد کی کثرت، اور انسانوں کے انبوہ کے جیسے سطحی مفہوم اور معنی کے لئے استعمال نہیں کئے گئے، جن کا ادیان و ملل کی تاریخ میں بھی، اور قوموں اور تہذیبوں کی تقدیر میں بھی کوئی وزن اور اثر نہیں ہے، بلکہ سارا قرآن مجید کہیں امم سابقہ کے واقعات کے سلسلہ میں اور کہیں قوت و ضعف اور غلبہ و ہزیمت کے اسباب کے تذکرے میں، تعداد کی کثرت کی بے اثری، انسانی انبوہ کی بے وزنی اور صالح ترین افراد کی موجودگی میں فساد کے غلبہ انسانوں کی مظلومیت اور دین حق کی مغلوبیت کے تذکرہ سے بھرا ہوا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "منہاج السنۃ" پر تبصرہ "تاریخ دعوت و عزیمت" حصۂ دوم صفحہ ۲۸۳-۳۱۲

میزان عدل اور میزان عقل دونوں میں منتشر افراد کی (جن کی تعداد خواہ کتنی ہی زائد ہو) کوئی بڑی اہمیت وافادیت نہیں۔

اسلام کے پیش نظر جو عظیم مقاصد ہیں' ان میں عبد و معبود کے تعلق کی اصلاح و تنظیم' پھر اس کی ترویج و توسیع، انسانی زندگی کو اس کے قالب میں ڈھالنے کی سعی، افراد جماعت کے باہمی تعلقات کی استواری اور خوشگواری بھی ہے' ایک ایسی شائستہ، خوش اسلوب پرسکون اور پرامن زندگی کے لئے فضا ہموار کرنا بھی ہے' جس میں خالق کے فرائض، مخلوق کے حقوق' دونوں کے ادا کرنے کا پورا موقعہ' اور ان کمالات وارتقائی منازل تک پہونچنے کا پورا امکان پایا جائے' جن کی صلاحیت انسان کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے' اس نے کوشش کی ہے کہ اس کی قوت عمل اور ذہانت' ان خطرات کا مقابلہ کرنے' ان نقصانات سے بچنے اور ان مفاسد کے دور کرنے میں ضائع نہ ہو' جو کبھی غیر منظم زندگی سے پیدا ہوتے ہیں' کبھی خود ساختہ قوانین سے کبھی مطلق العنانی اور جاہ واقتدار کی ہوس سے' اس کے لئے ایک منزل من اللہ قانون، آسمانی شریعت' اور خدا کی الوہیت و حاکمیت کے عقیدہ پر ایک نظام خلافت وامارت ضروری ہے' جہاں تک شریعت الہٰی کا تعلق ہے' اس کے منزل من اللہ' معصوم عن الخطاء، اغراض و مفادات' تعصبات اور جنبہ داریوں سے بلند و بالاتر ہونے کا عقیدہ ضروری ہے اور جہاں تک خلافت و امارت کا تعلق ہے' اس کا اس شریعت کے صحیح ترجمان و نمائندہ' اور انسانی طاقت وارادہ کی حد تک بے جا حمایت و عصبیت' مداہنت اور عدم مساوات سے دور رہنا ضروری ہے۔

ان مقاصد کی تکمیل اور ان نتائج کے ظہور کے لئے ابتداء ہی سے صاحب شریعت (صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم) نے ایسے احکام وہدایات صادر فرمائیں جن کی موجودگی میں مسلمان

ایک ایسی منظم اور مربوط جماعت کی شکل اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، جو ایک ایسے ممتاز فرد کے حکم و انتظام کی تابع ہے، جو بہت سی خصوصیات میں ان سے امتیاز رکھتا ہے، ان کے مصالح، مفادات اور ضروریات کا نگراں ہے، اور انھوں نے اس کو شریعت کے وسیع و لچکدار رہنما اصولوں کی روشنی میں انتخاب کیا ہے، اگر وہ امامت کبریٰ کے منصب پر فائز ہے تو اس کو خلیفۃ المسلمین، امیر المؤمنین، یا امام کہیں گے، اور اگر وہ اس کا نائب اس کا نامزد کیا ہوا ہے، یا شریعت کے احکام کے نفاذ، فصل خصومات، اور منظم دینی زندگی گذارنے کے لئے مسلمانوں نے اس کو (جزئی اور مقامی طور پر) انتخاب کیا ہے تو اس کو امیر کہیں گے۔

خلیفہ کا انتخاب ایسے دینی فرائض میں سے تھا کہ سب سے بڑے عاشق رسول اور جاں نثار رفیق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سب سے بڑے عشاق و جاں نثاروں کے گروہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے (مع اہل بیت عظام کے) اس مسئلہ کا تصفیہ، اور خلیفۃ المسلمین کے انتخاب کو جسد اطہر و انور کی تدفین پر مقدم رکھا، اور تقریباً یہی معمول ہر خلیفہ کے انتقال پر رہا، صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتخاب ۱۱ھ سے لے کر خلیفہ مستعصم باللہ عباسی کی شہادت ۶۵۶ھ تک عالم اسلام خلیفۂ اسلام سے کبھی محروم نہیں رہا، صرف خلیفہ مسترشد باللہ جو سلطان مسعود سلجوقی کے ہاتھوں ۱۰ رمضان ۵۲۹ھ میں گرفتار ہوا تھا، کی غیبت و اسیری کے قلیل وقفہ میں جو تین مہینے سات دن سے متجاوز نہیں تھا، عالم اسلام خلیفۂ اسلام کے بغیر رہا، لیکن یہ عالم اسلام کے لئے ایک ایسا انوکھا تجربہ اور المناک واقعہ تھا جس کی وجہ سے وہ سیاہ پوش اور سوگوار، اور بغداد زیر و زبر ہو گیا، ابن کثیرؒ کے الفاظ میں:۔

"بغداد کے باشندوں میں ظاہر و باطن ہر لحاظ سے ایک زلزلہ سا آگیا، عوام نے مسجد کے منبروں تک کو توڑ ڈالا، اور جماعتوں میں شریک ہونا بھی چھوڑ دیا، عورتیں

سر سے دوپٹہ ہٹا کر نوحہ خوانی کرتی ہوئی باہر نکل آئیں، اور خلیفہ کے قید اور اس کی پریشانیوں اور مصیبتوں کا ماتم کرنے لگیں، دوسرے علاقے بھی بغداد ہی کے نقش قدم پر چلے، اس کے بعد یہ فتنہ اتنا بڑھا کہ کم و بیش تمام علاقے اس سے متاثر ہو گئے ملک سنجر نے یہ اجرا دیکھ کر اپنے بھتیجہ کو معاملہ کی نزاکت اور اہمیت سے آگاہ اور خبردار کیا، اور اس کو حکم دیا کہ خلیفہ کو بحال کر دے، ملک مسعود نے اس حکم کی تعمیل کی[1]

خلیفہ مستعصم باللہ کی شہادت پر شیخ سعدیؒ نے جو مرکز خلافت سے بہت دور شیراز میں رہتے تھے، جو دل دوز و جگر سوز مرثیہ کہا ہے، اور جس کا مطلع ہے ؎

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوال امر مستعصم امیر المؤمنیں

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان خلافت اور خلیفہ کو کس نظر سے دیکھتے تھے، اور عالم اسلام کی ان سے محرومی پر کن جذبات کا اظہار کرتے تھے۔

خلافت کی جامع و مانع تعریف

شاہ صاحبؒ نے جن کی نظر کتاب و سنت، فقہ، عقائد اور علم کلام اور سیرت و تاریخ پر نہایت وسیع اور گہری تھی، اور وہ مقاصد شریعت کے رمز آشنا تھے، خلافت کی ایسی جامع و مانع تعریف کی ہے جس سے بہتر پیش کرنی مشکل ہے، اس تعریف کا ہر لفظ اپنے ساتھ معانی و مطالب اور مثالوں کا ایک دفتر رکھتا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

الخلافة هي الرياسة العامة	خلافت اس عمومی سربراہی اور

---

[1] ابن کثیر جلد ۱۲ ص ۲۰۵

فی المتصدی لإقامة الدین بإحیاء العلوم الدینیة وإقامة أرکان الإسلام والقیام بالجهاد ومایتعلق به من ترتیب الجیوش والفرض للمقاتلة واعطائهم من الفیئ والقیام بالقضاء وإقامة الحدود ورفع المظالم والأمر بالمعروف والنهی عن المنکر نیابةً عن النبی صلی الله علیه وآله وسلم۔[1]

ریاست عامہ کا نام ہے جو "اقامتِ دین" کے کام کی تکمیل کے لئے وجود میں آئے اس "اقامتِ دین" کے دائرۂ کار میں علوم دینیہ کا احیاء، ارکان اسلام کا قیام، جہاد اور اس کے متعلقات کا انتظام، مثلاً لشکروں کی ترتیب جنگ میں حصہ لینے والوں کے حصص و مال غنیمت میں ان کا حق، نظام قضا کا اجراء، حدود کا قائم کرنا، مظالم و شکایات کا ازالہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض کی ادائیگی شامل ہے، اور یہ سب آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت اور نمائندگی میں ہونا چاہیئے۔

پھر اقامت دین کی مزید تشریح و تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

"ہم جب معاملات کو استقرائی نظر سے دیکھتے ہیں، جزئیات سے کلیات اور کلیات سے ایک ہی کلیہ کی طرف جو سب پر حاوی ہو منتقل ہوتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ ان معاملات، جزئیات متشتتہ اور کلیات کثیرہ کی جنس اعلیٰ اور

---

[1] ازالۃ الخفا ص۲

(گویا کلیۃ الکلیات) وہ حقیقت ہے جس کا عنوان "اقامت دین" ہے جس کے ماتحت دوسری انواع و اجناس آتی ہیں جن میں سے ایک احیاء علوم دین ہے، جس میں قرآن و سنت کی تعلیم اور تذکیر و موعظت شامل ہے۔ اللہ تعالٰے کا ارشاد ہے:-

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ [1] (سورۃ الجمعۃ - ۲)	وہی تو ہے جس نے ان پڑھوں میں انھیں میں سے (محمدؐ کو) پیغمبر بنا کر بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے اور انھیں (خدا کی) کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔

خلفائے راشدین کی خلافت پر قرآن سے استدلال

کتاب کا سب سے وجد انگیز حصہ وہ ہے جس میں شاہ صاحبؒ نے قرآن مجید کی متعدد آیات سے خلفائے راشدین کی خلافت کے انعقاد اور ان کے خلیفۂ راشد ہونے اور ان کے ذریعہ سے منشائے الٰہی کی تکمیل، اور امر تکوینی کے تحقق پر استدلال کیا ہے اور آیات کے ایسے اشارات بلکہ تصریحات کی طرف توجہ دلائی ہے جن سے بدیہی طور پر (بلکہ بعض مقامات پر ریاضی کے نتائج کے رنگ میں) یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان حضرات کے سوا ان آیات کا کوئی اور مصداق اور مراد

---

[1] ازالۃ الخفا صـ ۳ جـ ۱

نہیں ہو سکتا، اور ان پیشین گوئیوں کا انطباق ان کی ذات کے سوا کسی پر، اور ان وعدوں کا تحقّق ان کے دورِ خلافت کے سوا کسی دور میں وقوع پذیر نہیں ہوا، اگر ان کی شخصیتوں اور ان کے عہد کو بیچ میں سے نکال لیا جائے تو یہ صفات بغیر کسی مصداق کے اور یہ وعدے تشنۂ تکمیل رہ جاتے ہیں۔

ان آیات میں جو شاہ صاحبؒ نے پیش کی ہیں، ہم بطور نمونہ کے صرف دو آیتیں انتخاب کرتے ہیں، ان میں سے ایک سورۂ نور کی آیت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ	جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ	نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا
فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ	وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنائے گا
مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ	جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا
الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ	تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے
مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۚ يَعْبُدُوْنَنِيْ	ان کے لئے پسند کیا ہے مستحکم و پائیدار
لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ۚ وَمَنْ كَفَرَ	کرے گا اور خوف کے بعد ان کو امن
بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ	بخشے گا وہ میری عبادت کریں گے،
الْفٰسِقُوْنَ ○	(اور) میرے ساتھ کسی اور کو شریک
(سورۂ النور۔ ۵۵)	نہ بنائیں گے اور جو اس کے بعد کفر
	کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہ وعدہ (استخلاف و تمکین فی الارض، اور خوف کے بعد امن کا) ان لوگوں کے ساتھ کیا گیا ہے، جو سورۂ نور کے نزول کے وقت موجود،

اسلام اور صحبت نبوی سے مشرف، اور دین کی نصرت و تائید میں شریک تھے، شاہ صاحبؒ صفائی سے لکھتے ہیں کہ اس وعدہ کا اطلاق حضرت معاویہ، بنو امیہ اور بنو عباس پر نہیں ہوتا جو اس وقت یا تو اسلام نہیں لائے تھے، یا مدینہ میں موجود نہیں تھے۔

پھر لکھتے ہیں کہ یہ بات نہ تو ممکن ہے نہ معقول کہ اس پوری جماعت مسلمین کو خلافت فی الارض سے سرفراز کیا جائے، اور وہ سب بیک وقت منصب خلافت پر فائز ہوں اس لئے اس سے کچھ خاص افراد ہی مراد لئے جا سکتے ہیں، فرماتے ہیں :-

"لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ یعنی لیستخلفن جمعًا منهم و" انقیاد لوازم اوست"
یعنی ان میں سے ایک جماعت کو خلیفہ بنایا جائیگا، اور انقیاد وطاعت اس کے لئے شرط ہے، پھر یہ کہ جب اس وعدہ کا تحقق ہوگا، تو دین علی اکمل الوجوہ ظہور میں آئیگا، اور اس کو پورا اقتدار و اختیار حاصل ہوگا، ایسا نہیں، جیسے اثنا عشری حضرات کہتے ہیں کہ خدا کو جو دین پسند ہے وہ ہمیشہ مستور و مختفی رہا ہے، اور اسی بناء پر ائمہ اہل بیت نے ہمیشہ تقیہ سے کام لیا، اور ان کو اپنے دین کے کھلم کھلا اعلان کی کبھی قدرت حاصل نہیں ہوئی "وَلَیُمَکِّنَنَّ لَهُمْ دِینَهُمُ الَّذِی ارْتَضَیٰ لَهُمْ" (ان کے لئے اللہ تعالےٰ اس دین کو قوت و غلبہ عطا فرمائیگا، جس کو اس نے ان کے لئے پسند کر لیا ہے) اس سے معلوم ہوا کہ وہ دین خدا کا پسندیدہ اور منتخب دین نہیں جس کا اس زمانۂ خلافت میں اعلان و اظہار نہ کیا جا سکے[1]

اسی طرح فرماتا ہے "وَلَیُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا" اس زمانۂ خلافت

---

[1] ازالۃ الخفا ص۲۰ ج۱

میں اللہ تعالےٰ خوف وہراس کی فضا کے بجائے امن واطمینان کی فضا پیدا کردے گا، اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ مستخلفین اور بقیہ مسلمان اس وعدہ کی تکمیل کے وقت امن واطمینان کے ساتھ ہوں گے، نہ ان کو مختلف الادیان کفار کا کوئی ڈر ہوگا، اور نہ کسی اور جماعت یا طاقت کا اندیشہ، برخلاف اس کے فرقۂ امامیہ کے لوگ کہتے ہیں کہ ائمۂ اہل بیت ہمیشہ ترساں وہراساں رہے، انھوں نے تقیہ سے کام لیا، ان کو اور ان کے ساتھیوں کو ہمیشہ مسلمانوں سے اذیت اور تکلیف پیش آئی اور وہ اہانت وذلت کا سامنا کرتے رہے، اور کبھی مؤیَّد ومنصور نہیں رہے۔[1] استخلاف اور تمکین فی الارض کے وعدہ کا ظہور انھیں مہاجرین اولین اور نزول آیت استخلاف کے وقت موجود رہنے والے حضرات کے ذریعہ ہوا، اور اگر یہ لوگ خلیفہ نہیں تھے، تو اس وعدہ کا ظہور ہی نہیں ہوا، اور نہ قیامت تک ہونے والا ہے۔ تعالی اللّٰہ عن ذٰلک علواً کبیراً۔[2]

دوسری آیت "قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ" الخ سورۂ فتح (آیت ۱۶) کی ہے، شاہ صاحبؒ نے اس آیت پر مفصل بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سنہ ۶ھ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ اس خواب کی بناء پر جو آپ نے دیکھا تھا، عمرہ کے قصد سے مکہ معظمہ کی طرف کوچ فرمایا، واقعہ کی اہمیت، مکہ معظمہ کے حالات اور قریش کی مخالفت کے خطرہ کی بناء پر صحابہ کرامؓ بڑی تعداد میں ہمرکاب ہوئے، لیکن اعراب (بادیہ کے ساکنین) خوف ونفاق کی بناء پر ساتھ نہیں ہوئے،

---

[1] ازالۃ الخفا ص ۲۲/۱ [2] ایضاً ص ۲۳/۱

حُدَیبیہ میں فتح عزیمت اور قریش کے ساتھ صلح کا وہ تاریخ ساز واقعہ پیش آیا جو حدیث اور سیرت کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ ملتا ہے، وہیں وہ بیعت رضوان ہوئی جس میں شریک ہونے والوں کو اللہ تعالےٰ نے اپنی خوشنودی کا خاص پروانہ عطا فرمایا، اور قریبی زمانہ کی فتح کا مژدہ سنایا[1]، پھر اسی سورہ فتح میں یہ بھی اعلان فرما دیا کہ اس فتح قریب (فتح خیبر) میں (جو محرم ۷ھ کا واقعہ ہے) ان اعراب کو ساتھ نہیں لیا جائیگا، جو حدیبیہ کے موقعہ پر موجود نہیں تھے، اور جنھوں نے اس عظیم و خطرناک مہم میں رفاقت سے پہلو تہی کی تھی، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:-

سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ	جب تم لوگ غنیمتیں لینے چلو گے تو
اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا	جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے وہ کہیں گے
نَتَّبِعْكُمْ ۚ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا	ہمیں بھی اجازت دیجئے کہ آپ کے
كَلٰمَ اللّٰهِ ۚ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ	ساتھ چلیں یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے
قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ	قول کو بدل دیں کہہ دو کہ تم ہرگز
بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ	ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے اسی طرح
اِلَّا قَلِيْلًا ○	خدا نے پہلے سے فرما دیا ہے پھر کہیں گے
(سورۃ الفتح - ۱۵)	(نہیں) تم تو ہم سے حسد کرتے ہو
	بات یہ ہے کہ یہ لوگ سمجھتے ہی نہیں
	مگر بہت کم

لیکن اس کے بعد ہی ان متخلفین سے فرمایا گیا کہ اس فتح قریب (فتح خیبر) میں

---

[1] سورۂ فتح - ۱۸

تو تمہیں شرکت اور اس کے مغانم سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے لیکن عنقریب تم کو ایسے لوگوں سے قتال کرنے کے لئے مدعو کیا جائیگا جن کی ایک صفت تو یہ ہے کہ وہ بڑی شجاعت اور طاقت کے مالک ہیں، دوسرے ان کی خصوصیت یہ ہوگی کہ ان سے یا تو قتال کیا جائیگا یا وہ اسلام لے آئیں گے، درمیان کی کوئی چیز (جزیہ) نہیں ہے، اور یہ دعوتِ قتال اللہ کو ایسی محبوب اور اس کا داعی ایسا معتبر اور واجب الاطاعت ہوگا کہ اگر تم اس کی دعوت قبول اور اس کے حکم کی بجا آوری کروگے تو اللہ تعالیٰ تم کو اجرِ حسن سے نوازے گا، اور اگر پہلے کی طرح روگردانی کروگے، تو عذابِ الیم میں مبتلا کرے گا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ	جو گنوار پیچھے رہ گئے تھے ان سے
سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِىْ بَاْسٍ	کہدو کہ تم ایک سخت جنگجو قوم کے
شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ	(ساتھ لڑائی کے) لئے بلائے جاؤگے
فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ	ان سے تم (یا تو) جنگ کرتے رہوگے
وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ	یا وہ اسلام لے آئیں گے اگر تم حکم
يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ○	مانوگے تو خدا تم کو اچھا بدلہ دے گا
(سورۃ الفتح ـ ۱۶)	اور اگر منہ پھیر لوگے جیسے پہلی دفعہ
	پھیرا تھا تو وہ تم کو بڑی تکلیف کی
	سزا دے گا۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ "سَتُدْعَوْنَ" (عنقریب تم بلائے جاؤگے) سے بطریق اقتضاء ثابت ہوتا ہے کہ زمانۂ مستقبل میں کوئی ایسا داعی (بلانے والا) ہوگا جو اعراب

(بادیہ کے رہنے والوں کو جو صلح حدیبیہ کے موقعہ پر لشکر اسلام کے ساتھ نہیں گئے تھے) کو ایسی قوم سے جنگ کرنے کے لئے دعوت دے گا جس کے لئے دو ہی شکلیں ہیں یا قتال یا اسلام (اور جس کا مصداق عرب کے مرتد قبائل ہی ہو سکتے ہیں جن سے جزیہ لینا جائز نہ تھا وہ یا تو جنگ میں مارے جاتے یا اسلام قبول کرتے) اور یہ شکل صرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں پیش آئی جنھوں نے مرتدین عرب سے قتال کیا، ان کا حکم شرعی یہی تھا، اس سے مراد نہ رومی ہو سکتے ہیں، نہ ایرانی جن کے لئے تین شکلیں تھیں قتال، اسلام اور جزیہ اس لئے اس سے بداہۃً حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت ثابت ہوتی ہے جنھوں نے مرتدین سے جنگ کرنے کے لئے حضرت خالدؓ کی ماتحتی میں فوج بھیجی اور اعراب کو اس کی دعوت دی پھر اس دعوت کے قبول کرنے پر اجر کا ملنا اور نہ قبول کرنے پر عذاب کا مستحق ہونا ایک خلیفۂ راشد ہی کا مقام و منصب ہے۔[1]

کتاب کے دوسرے قیمتی مضامین

خلفائے راشدین کی خلافت کے اثبات کے دلائل اور خلفائے اربعہ کے مآثر و مناقب!

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ازالۃ الخفا ص۳۵-۳۹ شاہ صاحب کے اس استدلال کی تائید علامہ شہاب الدین محمود الآلوسی (م ۱۲۷۰ھ) کی مشہور تفسیر روح المعانی سے بھی ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں:۔

"المراد بالمغانم مغانم خیبر کما علیہ عامۃ المفسرین[1]"

"ستدعون الی قوم اولی بأس شدید" و هم علی ما اخرج ابن المنذر والطبرانی عن الزهری بنو حنیفة مسیلمة و قومه اهل الیمامة وعن رافع بن خدیج انا کنا نقرأ هذه الآیة فیما مضی ولا نعلم من هم حتی دعا ابوبکر رضی الله عنه الی قتال بنی حنیفة فعلمنا انهم أرید وا بها[2]
وشاع الاستدلال بالآیة علی صحة امامة ابی بکر رضی الله عنه[3]

---

[1] روح المعانی ص۱۰۱ [2] ایضاً ص۱۰۲ [3] ایضاً ص۱۰۲

ان کے زمانہ کے کارناموں اور ان کے بہت سے قیمتی کلمات اور ارشادات کے علاوہ اس کتاب میں اور بھی بیش بہا فوائد تحقیقات نادرہ، اور وہ قیمتی مواد ہے، جو نہ عقائد وعلم کلام کی کتابوں میں عام طور پر ملتا ہے، نہ تاریخ اور سیر میں، ان میں سے ایک قرون ثلاثہ کی توضیح[1] خلافت وسلطنت کا فرق اور اس کی تفصیلات[2]، ملک عضوض (مطلق العنان فرمانروائی) کی تشریح اور اس بات کی تصریح ہے کہ بنی اُمیہ کی سلطنت اور مطلق العنان فرمانروائی خلافت نہ تھی، ان کے نزدیک اگرچہ خلافت راشدہ حضرت علی مرتضیٰ پر ختم ہو گئی، لیکن وہ حضرت معاویہ کے بارے میں (ان مناقب کی بناء پر جو ان کے بارہ میں وارد ہوئے ہیں) سوءظن اور طعن وتشنیع سے احتراز کی تلقین کرتے ہیں[3]، لیکن ان کے بعد کے خلفاء بنی مروان کے متعلق صاف لکھتے ہیں :—

چوں عبد الملک تسلط یافت فرقت	جب عبد الملک (بن مروان) نے اقتدار
از میان رفت واحکام خلافت جابرہ	حاصل کر لیا، تو انتشار ختم ہو گیا، اور خلافت
کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم	جابرہ کے احکام جن کی آنحضرت صلے اللہ
در چندیں احادیث تشریح آں فرمودہ	علیہ وآلہ وسلم نے متعدد احادیث میں
بودند، بر منصۂ ظہور آمد[4]	تشریح فرمائی تھی منظر عام پر آ گئے۔

اس کتاب کی ایک خصوصیت فاروق اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے مذہب ان کے فتاوی اور احکام پر وہ مفصل مواد ہے جس کو اس میں جمع کر دیا گیا ہے، اور جس سے ایک پوری

---

[1] ازالۃ الخفا ص ۱۲۱-۱۲۲ [2] ایضاً ص ۱۲۶ ج ۱ [3] ایضاً ص ۱۴۶ ج ۱

[4] ایضاً ص ۱۴۳ ج ۱ یزید کے متعلق "حجۃ اللہ البالغہ" میں صفائی سے لکھتے ہیں "دعاۃ الضلال یزید بالشام ومختار بالعراق" ترجمہ۔ ضلالت کے داعی دو تھے، یزید شام میں اور مختار عراق میں (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۲۱۳) اسی طرح مناقب کی بحث میں یزید کو منافق یا فاسق لکھا ہے۔ ص ۲۱۵

فقہ فاروقی سامنے آگئی ہے۔[1]

فقہ فاروقی کو یگانہ حیثیت سے پیش کرنے اور حضرت عمرؓ کے اجتہادات اور فتاویٰ کو جمع کرنے کا شاید یہ پہلا مبارک اقدام تھا جس کو شاہ صاحبؒ نے دوسری اولیات کے ساتھ انجام دیا، اس موضوع پر کوئی جامع منفرد کتاب اب تک تصنیف نہیں ہوئی، حال میں (۱۴۰۱ھ - ۱۹۸۱ء) ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی نے "موسوعۃ فقہ عمر بن الخطابؓ" (حضرت عمرؓ کی فقہ کا دائرۃ المعارف، انسائیکلوپیڈیا) کے نام سے ایک ضخیم مفصل کتاب مرتب کی جو مکتبۃ الفلاح کویت کی طرف سے شائع ہوئی، یہ کتاب بڑے سائز کے ۷۰۸ صفحات پر آئی ہے۔

خلفائے ثلاثہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی خلافت کے اثبات، اور ان کے فضائل ومناقب، مآثر اور خدمات کے ایسے تفصیلی تذکرہ کے ساتھ جس میں شاہ صاحبؒ کا ذوق وجوش صاف جھلکتا ہے، اور جو اس ضرورت کی تکمیل ہے، جو اس زمانہ کا تقاضا اور کتاب کی تصنیف کا اصل محرک ہے، انھوں نے امیر المومنین سیدنا علی مرتضیٰ کرّم اللہ وجہہ کے مآثر وفضائل بیان کرنے میں تأمل وتحفظ سے کام نہیں لیا ہے، ان کو بھی انھوں نے پوری عقیدت، ان کے حقوق کے اعتراف اور اہل بیت کرام کے ساتھ محبت کے جذبہ اور پورے توسّع کے ساتھ بیان کیا ہے،[2] مآثر سیدنا علیؓ بن ابی طالب کو حسبِ ذیل الفاظ سے شروع کرتے ہیں: "مآثر امیر المومنین وامام الاشجعین اسد اللہ الغالب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ" اسی طرح حضرات حسنینؓ بالخصوص سبط اکبر سیدنا حسن مجتبیٰ کا ذکر پوری عظمت ومحبت کے ساتھ کرتے ہیں، وفات نبویؐ کے بعد حوادث مہمّہ میں حضرت عثمانؓ کی شہادت کو

---

[1] ملاحظہ ہو ص ۸۵-۱۴۲/۲ [2] ایضاً ص ۲۵۱-۲۸۳/۲

فتنۂ اولیٰ شمار کیا ہے[1] اور فتنۂ ثانیہ جگر گوشۂ رسول حضرت امام حسینؓ کی شہادت کو لیا ہے، اور مشکوٰۃ شریف کی ایسی روایت (جو بیہقی سے ماخوذ ہے) نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امامؓ کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وہی نسبت ہے جو ایک مضغۂ گوشت کو جسم سے ہوتی ہے، اور آپ نے اس کی خبر دی ہے کہ امت ان کو شہید کرے گی[2]، اسی فتنہ میں واقعۂ ہائلہ حرّہ کو بھی شمار کیا ہے، جس میں یزید کے زمانہ میں اس کے لشکر کے ہاتھوں مدینہ طیبہ میں[3] قتل ونہب کا شرمناک واقعہ پیش آیا، اور مدینہ و اہل مدینہ کی سخت بے حرمتی ہوئی؛ شاہ صاحبؒ نے بنی امیہ کے بارے میں جا بجا کھلی تنقید سے کام لیا ہے[4]، اس طرح کتاب میں وہ توازن اور اعتدال پورے طور پر موجود ہے، جو اہل سنت والجماعت کا شعار و افتخار ہے۔

وفات نبویؐ کے بعد کے تغیرات وفتن کی نشاندہی

اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اسلام کی دینی تاریخ، اور ذہنی و مذہبی انقلاب و تغیر کا ایک مختصر ابھرا ہوا خاکہ بھی آگیا ہے، اسلام کی سیاسی وعلمی تاریخیں تو بے شمار ہیں، لیکن ایسی تاریخ کہیں نہیں ملتی جس میں اسلام کے سیاسی و تمدنی تاریخی تسلسل کے درمیان نئی ذہنی، علمی اور اخلاقی تبدیلیوں کے نشان (خواہ وہ ایسے ہلکے اور پھیکے رنگ کے ہوں جو صحیح اسلامی مزاج کی واقفیت کی خوردبین کے بغیر دیکھے نہ جا سکیں) نظر آئیں کتابوں میں تھوڑا سا منتشر مواد ملتا ہے، لیکن کسی نے اس کو اپنی بحث کا عنوان نہیں بنایا، شاہ صاحبؒ خیر القرون سے متصلاً اس کے بعد کے فتنے[5]، خیر القرون اور شر القرون کے احکام کا اختلاف[6]، اور تغیرات کلیہ کے ضمن میں ان معنوی اور فکری تغیرات کا تذکرہ کرتے ہیں، جو عہد رسالت اور خیر القرون کے بعد پیش آئے ان کے عنوانات شاہ صاحبؒ

لہ ملاحظہ ہو ص ۱۵۳/۱ ۲ہ ص ۱۵۳/۱ ۳ہ ص ۱۵۴/۱ ۴ہ ص ۱۵۳-۱۵۵/۱ ۵ہ ص ۱۲۲/۱ ۶ہ ص ۱۳۶/۱

کے یہاں حسب ذیل ہیں۔

ظہور کذب، تجوید قرآن کے سلسلہ میں تعمق و مبالغہ، قراءت اور تلاوت پر اکتفا اور تدبر فی القرآن اور تفقہ کی کمی، فقہی مسائل میں موشگافی اور مسائل کی فرضی شکلوں پر جو وقوع پذیر نہیں ہوئیں پہلے سے بحث و مباحثہ، متشابہات قرآن کی تاویل اور اس میں دور کی کوڑی لانا، عقائد والٰہیات میں نئے نئے سوالات کا پیدا کرنا۔ تقرب الی اللہ کی نیت سے نئے نئے اوراد و احزاب کی ایجاد، جو سنت ماثورہ پر اضافہ کرتے ہیں، مستحبات کی ایسی پابندی اور التزام جیسی واجبات کی ہونی چاہیئے، فتوے دینے کے بارے میں اجتماعی شورہ اور علمائے صالحین سے رجوع کے سلسلہ کا ختم ہو جانا، نئے نئے فرقوں قدریہ اور مرجیۂ وغیرہ کا پیدا ہونا، مسلمانوں کے باہمی اعتماد و امن کا اٹھ جانا، ایسے لوگوں کا حکومت پر متمکن ہو جانا جو یا تو سرے سے حکومت کا استحقاق نہیں رکھتے، یا درجہ دوم سوم کے لوگ ہیں، ارکان اسلام کے قیام میں سستی اور فتور کا واقع ہونا۔[1]

کتاب کی طباعت واشاعت

کتاب ازالۃ الخفا پہلی مرتبہ مولوی محمد احسن صدیقی کے اہتمام میں منشی جمال الدین خاں صاحب مدار المہام ریاست بھوپال کے حکم وہدایت پر ۱۲۸۶ھ بریلی میں مطبع صدیقی میں چھپی، اس وقت تین نسخے فراہم ہو سکے، جن سے تصحیح و مقابلہ کا کام کیا گیا، ایک منشی صاحب کا بھوپال کا نسخہ، دوسرا مولوی احمد حسن صاحب امروہی کا نسخہ، تیسرا مولوی نور الحسن صاحب کاندھلوی کا، قرینہ ہے کہ مصنف علام کتاب پر نظر ثانی نہیں فرما سکے۔

---

[1] صـ ۱۳۳ / ۱

کتاب کا دوسرا ایڈیشن سہیل اکیڈمی لاہور پاکستان سے ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء کو شائع ہوا، جو پہلے ایڈیشن کا آفسٹ ہے[1]، کتاب کا عربی ترجمہ المجلس العلمی ڈابھیل کے اہتمام میں تیار ہوا، لیکن اس کی کما حقہ ممالک عربیہ میں اشاعت نہیں ہو سکی، امام اہل سنت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقیؒ لکھنوی نے کتاب کا اردو ترجمہ کیا، جو کتاب کی فصل اول سے فصل پنجم (ص ۱۵۵) تک پر مشتمل ہے، اس کا نام کشف الغطاء عن السنۃ البیضاء رکھا، اس مطبوعہ حصہ کی ضخامت ۳۳۶ صفحات ہے، ۱۳۲۹ھ میں عمدۃ المطابع لکھنؤ سے شائع ہوا۔

---

[1] یہی ایڈیشن اس باب کی تحریر کے وقت پیش نظر رہا ہے اور اسی کے صفحات کا حوالہ دیا گیا ہے ۔

بابِ نہم

سیاسی انتشار اور حکومت مغلیہ کے دورِ احتضار میں شاہ صاحب کا مجاہدانہ وقائدانہ کردار

تین نوخیز جنگجو طاقتیں

کتاب کے باب دوم[1] میں گزر چکا ہے کہ بارہویں صدی (ہجری) کا ہندوستان سیاسی انتظامی اور اخلاقی حیثیت سے انحطاط و پستی، بدنظمی و طوائف الملوکی، اور انتشار و اضطراب کے اس نقطہ پر پہونچ گیا تھا جس کو کسی معاشرہ و نظام کا دم واپسیں یا حالتِ احتضار سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، مغلیہ سلطنت ایک حکمراں مسلمان خاندان کے طویل ترین اور قوی ترین اقتدار کی علامت (SYMBOL) بن کر رہ گئی تھی جس کے پیچھے نہ کوئی طاقت تھی، نہ سلیقہ، نہ حوصلہ۔

بظاہر اس وقت سلطنت مغلیہ ہی نہیں پورے ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنے والی تین نوخیز جنگجو طاقتیں تھیں علی الترتیب مرہٹہ، سکھ، جاٹ۔

مرہٹے

مرہٹے جن کی سرگرمیاں پہلے دکن میں محدود تھیں اور جن کی حیثیت ایک منظم قانونی

---

[1] ہندوستان (سیاسی حالت)۔

حکومت کے خلاف ایک احتجاجی گروہ (AGITATORS) اور چھاپہ مار (GUERRILLA) طاقت سے زیادہ نہ تھی، مرکزی حکومت کی روزافزوں کمزوری، طالع آزما سرداروں کی باہمی زور آزمائی، اور امرائے سلطنت کی کوتاہ نظری کی وجہ سے (جو اپنے حریف کو زک دینے یا زچ کرنے کی نیت سے مرہٹوں سے کام لیتے رہتے تھے) ایک ایسی ہندگیر طاقت بن گئے، جو دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے اور اس خلا کو پُر کرنے کا خواب دیکھنے لگے جو مغلوں کی فوجی طاقت کی کمزوری اور ان کی انتظامی نااہلی نے پیدا کر دیا تھا۔

سنہ ۱۱۷۰ھ / ۱۷۵۶ء میں[1] ملہار راؤ ہولکر اور رگھوناتھ راؤ نے شمالی ہند پر اپنا تسلط قائم کرنے کا فیصلہ کیا، اور جاٹوں کی مدد سے سنہ ۱۱۷۱ھ / ۱۷۵۷ء کو دہلی پر حملہ کر دیا، نجیب الدولہ کو مجبور ہو کر صلح کرنی پڑی اس کے بعد انھوں نے پنجاب کا رخ کیا جو اس اہم جنگی علاقہ کا دروازہ تھا جس سے فاتح ہندوستان میں داخل ہوتے رہے، اور جو ابھی تک کسی غیر اسلامی طاقت کے زیرنگیں نہیں رہا تھا، انھوں نے اپریل ۱۷۵۸ء میں لاہور پر قبضہ کر لیا، اور آدینہ بیگ کو اپنی طرف سے پنجاب کا حاکم مقرر کیا، آدینہ بیگ کے مرنے پر انھوں نے سباجی سندھیا کو پنجاب کا حاکم (گورنر) مقرر کیا۔

صفدر جنگ کے اشارہ اور مدد سے پہلے مرہٹے دوآبہ میں (جو ان علماء و مشائخ کا مرکز تھا جو خود دہلی کی زیب و زینت تھے) داخل ہوئے اب داتا جی سیندھیا نے سنہ [illegible] میں دکن سے آ کر سارے ہندوستان کے فتح کر لینے کا بیڑا اٹھایا، پہلے روہیلکھنڈ ۱۷۵۸ء اور اودھ کا رخ کیا، اور اس ارادہ سے جمنا کو عبور کیا سنہ ۱۱۷۲ھ / ۱۷۵۹ء میں جب دریا قابل عبور ہوئے اس سے گوبند رائے بندیلہ کو بیس ہزار لشکر کے ساتھ روہیلکھنڈ میں

---

[1] حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی وفات سے ۵-۶ سال پیشتر۔

اتار دیا، اس نے رام گنگا سے اتر کر امروہہ تک (جو دہلی سے زیادہ فاصلہ پر نہیں ہے) ملک کو لوٹ لیا۔

۲۴ جون ۱۷۶۰ء (۹ ذی الحجہ ۱۱۷۳ھ) کو مرہٹے پایہ تخت دہلی میں داخل ہوئے یعقوب علی خاں قلعہ دار نے قلعہ حوالہ کر دیا، بھاؤ نے قلعہ کی قلعہ داری شنکر راؤ کے سپرد کی اس نے دیوان خاص کی نقرئی و سیمین چھت کو اتار لیا اور ٹکسال میں بھیج دیا، قدم شریف اور حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ میں سونے چاندی کا جو سامان تھا لے لیا۔ ۱۰ نومبر ۱۷۶۰ء (۲۹ صفر ۱۱۷۴ھ) کو شاہ جہاں ثانی کو معزول کر کے مرزا جوان بخت خلف شاہ عالم عالی گہر کو تخت پر بٹھایا، چاہتا تھا کہ خود تیموری تخت پر جلوہ افروز ہو اور وہ ایسا کر سکتا تھا، مگر لشکر کے دانشمندوں نے اس کو اس ارادہ سے باز رکھا کہ اس سے پورے ملک میں شورش برپا ہو جائیگی، اور رعایا تخت بابری پر کسی مرہٹہ سردار کو بیٹھا دیکھ کر آسانی سے برداشت نہیں کر سکے گی، اس وقت مرہٹوں کی عملداری کو جو وسعت حاصل تھی، وہ نہ اس سے پہلے کبھی ہوئی تھی، نہ اس کے بعد ہوئی، اس کی شمالی سرحد اٹک اور ہمالیہ کے پہاڑ تھے، جنوب میں جزیرہ نمائے دکن کے پچھلے سرے یعنی سمندر تک پھیلی ہوئی تھی، جو علاقے ان حدود کے اندر آزاد تھے، وہ اس کے باج گزار تھے، ان کے پاس آزمودہ کار سپہ سالار ملازم تھے، دس ہزار سپاہ فرنگستان کی قواعد دان ان کے پاس موجود تھی، پانی پت کی لڑائی میں ان کے پاس پچپن ۵۵ ہزار سوار جرار اور پندرہ ۱۵ ہزار پیادے تھے، دو سو توپیں (علاوہ قلعہ شکن توپوں کے) ساتھ تھیں، راجپوتوں کی فوج بھی ساتھ ہو گئی تھی، اس طرح سب مل کر تین لاکھ لڑنے والے سپاہی ان کے جھنڈے کے نیچے اور زیر قیادت تھے۔

بایں ہمہ مرہٹوں کا مزاج شاہانہ اور ذمہ دارانہ نہ تھا، ہندوستان کے ایک مؤرخ کے بقول "وہ آدھے بادشاہ آدھے راہ زن تھے"[1] رعایا پروری، ہمدردی، خلائق اور انسانی جان ومال، عزت وآبرو کی حفاظت کی قدیمی وموروثی روایات (جو رعونت ونفسانیت کے موقعوں پر بھی خود مختار حاکموں اور بادشاہوں کی کسی حد تک حفاظت کرتی، اور عناں گیر ہوتی رہی ہیں) نیز شاندار تاریخی پس منظر (BACK GROUND) نہ ہونے اور اعلیٰ اور واضح تعمیری وسیاسی مقاصد کے مفقود ہونے کی وجہ سے پھر اس سب کے علاوہ ہندو مذہب وتہذیب کے احیاء کے جذبہ (HINDU REVIVALISM) نے ان میں جارحیت، فیصلوں میں عجلت اور عدم رواداری کی صفت پیدا کردی تھی، لوٹ کا مال، اور اس کی محبت ان کی قومی کمزوری تھی۔

مرہٹوں کی ہنگامہ آرائیوں سے ہندو مسلمان سبھی متاثر ہوتے تھے، دیہاتوں کو بے دردی سے لوٹنا، لوگوں کے ہاتھ ناک کان کاٹ لینا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی، حملہ آوروں کی نفسانی ہوس کا شکار بلا تفریق مذہب وملت عورتوں کا پورا طبقہ بنتا تھا اس میں بھی ہر طرح کے حدود سے تجاوز کرکے بہیمانہ ووحشیانہ عمل کا مظاہرہ کیا جاتا رہا، بنگال کے مشہور شاعر گنگا رام نے بنگال پر ان کے حملوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ان تاثرات کا اظہار کیا ہے[2]۔

پرتگالی مصنفوں نے بھی مرہٹوں کی اخلاق سوز حرکتوں پر اپنے استعجاب کا اظہار

---

[1] تاریخ ہندوستان از مولوی ذکاء اللہ دہلوی ص ۳۰۳ ج ۹

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو جادو ناتھ سرکار کی کتاب FALL OF THE MOGHAL EMPIRE, P. 87

کیا ہے۔[1] مرہٹوں کے اقتدار کا عوام پر بڑا اقتصادی اثر پڑا، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کے بقول "ان کی نیت یہ ہے کہ جہاں تک ان کی دسترس ہو، خلق خدا کے معاشی ذرائع مسدود کر کے اپنے قبضہ میں کر لیں" مرہٹے مغلیہ سلطنت کے ان دور افتادہ علاقوں سے چوتھ[2] وصول کرتے تھے، جو ان کے رحم و کرم پر تھے۔

مرہٹوں کی تاخت صرف فوجی حدود اور عوام کے استحصال ہی کے دائرہ میں محدود نہ تھی، وہ ہندو مذہب و تہذیب کی "احیائیت" (REVIVALISM) پر بھی مبنی تھی، اس تحریک کے قائد اول شیواجی کے متعلق ماونٹ سٹوارٹ الفنسٹن (گورنر بمبئی) اپنی تاریخ ہند میں لکھتا ہے:۔

> "اس کی طبیعت نے ہندوانہ تعصبوں سے تربیت پائی تھی .... اس طبیعت پر مجبول ہونے سے وہ مسلمانوں اور ان کے رسم و رواج سے سخت نفرت اور ہندوؤں اور ان کے طور طریقوں سے بڑی رغبت رکھتا تھا، اور یہ ترقی روز افزوں تھی، اس کا یہ مزاج تدبیر ملکی سے ایسا راس آیا تھا کہ اس نے بھگتوں کی صورت بنائی، اور اوتاروں کی کرامتوں، اور دیوتاؤں کی عنایتوں کا دعویٰ کیا۔"[3]

---

[1] PISSURLEN: PORTUGUESES, II, P. 49

[2] سب سے پہلے شیواجی نے چوتھ وصول کیا جو لگان کا چوتھائی تھا، چوتھ دوسری ریاستوں سے ان کی حفاظت یا حملہ نہ کرنے کے لئے وصول کرتے تھے، جبکہ اپنی مملکت میں کسانوں سے پیداوار کا تیس۳۰ فی صد لیا کرتے تھے، جو بعد میں بڑھ کر چالیس۴۰ فی صد ہو گیا تھا۔

[3] تاریخ ہند (اردو ترجمہ) ص۱۰۰ (علی گڑھ ۱۸۶۷ء)

پانی پت کے میدان میں آخری فیصلہ ہونے سے پہلے اور حالات کی نزاکت کا خیال کر کے انھوں نے نواب شجاع الدولہ کی معرفت (جو اس سے پہلے مرہٹوں کے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے) کوشش کی کہ شاہ ابدالی سے صلح ہو جائے، شجاع الدولہ نے ان مسلسل تجربوں اور تلخ حقیقتوں کی بناء پر ان کو جو جواب دیا، اس سے مرہٹوں کے قومی مزاج اور ان کی فتح مندی اور غلبہ کے اثرات و نتائج پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔

نواب شجاع الدولہ نے کہا:۔

"دکن کے برہمن ہندوستان پر مدت سے متسلط ہیں، ان کے سر پر غرور طمع و حرص و بدعہدی و بدقولی کے سبب سے یہ بلا شاہ درانی کی آئی ہے، ایسوں کے ساتھ کیا کوئی صلح کرے جو کسی کی آبرو اور آسائش کے روادار نہ ہوں، سب چیزیں اپنے اور اپنی قوم کے لئے جانتے ہوں، آخر سب ان کے ہاتھوں سے ایسے عاجز ہوئے کہ انھوں نے اپنے پاس ناموس اور حفظ آبرو اور رفاہ خلائق کے لئے شاہ ابدالی کو منتیں کر کے ولایت سے بلایا ہے اور اس کے صدمات کو مرہٹوں کی ایذا رسانی سے سہل سمجھا۔"[1]

بالآخر ۱۴ر جنوری ۱۷۶۱ء (۶ر جمادی الآخرہ ۱۱۷۴ھ) کو پانی پت کے میدان میں احمد شاہ ابدالی کی افغانی فوجوں، نواب نجیب الدولہ کے روہیلہ سپاہیوں اور نواب شجاع الدولہ کے لشکر کی متحدہ طاقت سے مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی، اور بقول ایک مورخ کے "مرہٹوں کی طاقت چشم زدن میں کافور کی طرح اڑ گئی"! احمد شاہ ابدالی کی آمد کے محرکات اور پس منظر اور اس فیصلہ کن جنگ کی مزید تفصیلات جب نے تاریخ کے

---

[1] تاریخ ہندوستان۔ ج ۹ ص ۳۰۵

دھارے کو موڑ دیا، شاہ صاحب کے قائدانہ کارنامہ کے سلسلہ میں آئندہ صفحات پر آئیگی۔

سکھ

سکھ پنجاب کا ایک مذہبی گروہ تھا جس کی بنیاد پندرہویں صدی عیسوی میں گرو بابا نانک (۱۴۶۹ء – ۱۵۳۹ء) کے ہاتھوں پڑی، وہ نفس کشی، اخلاقیات اور سچائی کی تعلیم دیتے تھے "سیر المتاخرین" کے بیان کے مطابق بابا نانک نے فارسی اور دینیات کی تعلیم ایک بزرگ سید حسن سے حاصل کی تھی، اور ان کی بابا نانک پر خصوصی نظر تھی[۱]۔ تیسرے گرو امر داس نے سکھوں کی مذہبی اور معاشرتی تنظیم کے سلسلہ میں سب سے پہلے قدم اٹھایا، اکبر بادشاہ ان کے مکان پر ان سے ملنے گیا، اور انھیں ایک بڑی جاگیر عطا کی، انھوں نے اخلاقیات کی تعلیم میں گرو نانک کی تعلیمات کی روح کو قائم رکھا، اور ہندوؤں کی اوہام پرستی خصوصاً رسم ستی کی کھلم کھلا مخالفت کی اور نکاح بیوگان کے احکام جاری کئے، اکبر نے ۱۵۷۷ء میں انھیں ایک وسیع قطعہ آراضی عنایت کیا، انھیں کے زمانہ میں امرتسر کے مذہبی مرکز کی بنیاد پڑی، اس طرح سکھوں کی قومی زندگی کے لئے ایک روحانی مرکز تیار ہو گیا۔

۱۵۸۱ء میں گرو ارجن اپنے باپ کے جانشین ہوئے، انھوں نے سکھوں کو

---

[۱] بعض روایات کے مطابق بابا گرو نانک متعدد مسلمان درویشوں اور فقیروں کی صحبت میں رہے، ان میں پیر جلال، میاں مٹھا، شاہ شرف الدین، پیر عبدالرحمٰن اور پاک پٹن کے فرید ثانی اور شاہ ابراہیم کے نام خاص طور پر لئے گئے ہیں، بعض روایات کے مطابق بابا نانک نے بغداد، حرمین شریفین کا سفر بھی کیا، شیخ فرید پاک پٹن سے ان کا خاص ارتباط تھا۔

ایک فرقہ کی حیثیت سے منظم کرنے کی مزید کوشش کی، اور گرنتھ کی تدوین عمل میں لائے، گرو ارجن نے اپنے آپ کو "سچا بادشاہ" کے نام سے ملقب کیا جو ان کے سیاسی اقتدار کی ہوس کا پتہ دیتا ہے، جہانگیر کے حکم سے گرو کو لاہور میں قید کر دیا گیا، اس لئے کہ انھوں نے اس کے باغی شہزادہ خسرو کی مالی امداد کی تھی، وہاں ان کو قتل کر دیا گیا[1]، ان کے جانشین ہرگووند نے علانیہ عملی مخالفت و مزاحمت کا طرز عمل اختیار کیا جس سے سکھوں کی فوجی زندگی کا آغاز ہوا، انھوں نے جلدی شاہانہ منصب اختیار کر لیا، وہ شہنشاہ جہانگیر کے خلاف دشمنی کے جذبات رکھتے تھے، اور اپنے باپ کی موت کا اس کو ذمہ دار سمجھتے تھے، انھوں نے ہرگووند پور کا ایک مضبوط قلعہ بنایا جہاں سے نکل کر وہ میدانی علاقوں پر تاخت کرتے تھے، جہانگیر نے انھیں گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا لیکن کچھ عرصہ کے بعد رہا کر دیا، اور ان کا بڑا اعزاز کیا، شاہجہاں کی تخت نشینی کے فوراً بعد انھوں نے کھلم کھلا سرکشی اختیار کر لی اور حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، اخیر میں وہ پہاڑیوں کی طرف نکل گئے اور ۱۶۴۵ء میں انتقال کیا۔

۱۶۶۴ء میں اورنگ زیب کے زمانہ میں ہرگووند کے بیٹے تیغ بہادر گرو منتخب ہوئے، انھوں نے مفروروں اور قانون شکنوں کو پناہ دی، ان کا اقتدار ملک کی ترقی میں حائل ہوا[2]، شاہی دستوں نے ان پر چڑھائی کی اور انھیں قید کر کے دہلی لے آئے

---

[1] گرو ارجن کو حقیقت میں چندولال نے ذاتی مخالفت کی بنا پر قتل کرایا تھا، جو جہانگیر کے یہاں رسوخ رکھتا تھا، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ ہندوستان" ج ۹ ص ۵۲

[2] ملاحظہ ہو J.D. CUNNINGHAUM, A HISTORY OF THE SIKHS GUARD, 1918, P.64

جہاں انھیں اورنگ زیب کے حکم سے ۱۶۷۵ء میں سزائے موت دی گئی[1]، ان کی موت کے بعد ان کے بیٹے گووند رائے کو گرو تسلیم کیا گیا، انھوں نے سکھوں کو جو ابتدا میں محض ایک "مذہبی گن گیان" والی جماعت تھی، ایک جنگجو قوم بنا دیا، انھوں نے سکھوں میں جمہوری مساوات کے جذبات کو ابھارا، اور انھیں ایک قوم کی صورت میں منظم کرنے کا کام کیا، اورنگ زیب کے انتقال تک وہ زندہ رہے، اورنگ زیب کے جانشین بہادر شاہ نے گرو کے ساتھ مفاہمت کی کوشش کی اور انھیں دکن کی فوجی کمان عطا کر دی، لیکن انھوں نے اکتوبر ۱۷۰۸ء میں ایک افغان ملازم کے زخم سے جانبر نہ ہوتے ہوئے انتقال کیا، انھوں نے کسی کو اپنا جانشین نامزد نہیں کیا، اور اپنے پیروؤں کو حکم دیا کہ گرنتھ کو وہ اپنا آئندہ گرو، اور خدا کو اپنا واحد محافظ تصور کریں۔

ہرگووند کا جانشین بندہ بیراگی ہوا جس کی اصل حیثیت سکھوں کے فوجی قائد کی تھی، (وہ اصلاً کشمیری راجپوت تھا جس نے سکھ مت اختیار کر لیا تھا) اس نے پنجاب میں وسیع پیمانہ پر رہزنی کی وارداتیں شروع کر دیں، اورنگ زیب کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ پر بہت سرعت سے زوال آنا شروع ہو گیا، اس کے بیٹوں اور پوتوں کے مابین تخت کے لئے متواتر لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے، جن کی وجہ سے سکھوں کو کھلم کھلا اپنی طاقت میں اضافہ کرنے کا موقعہ مل گیا، بندہ بیراگی مسلمانوں کو ہزاروں کی تعداد میں بے رحمی سے قتل کرتا اور قصبہ بقصبہ لوٹتا ہوا دہلی کے عین قرب وجوار میں جا پہونچا، مئی ۱۷۱۰ء میں اس نے سرہند پر دھاوا بول دیا، اور لوٹ مار اور قتل و غارت گری کے لئے کھلا چھوڑ دیا قصبہ کے

---

[1] گرو تیغ بہادر کے قتل کی بھی تنہا اورنگ زیب پر ذمہ داری نہیں "اس میں ان کے مخالفوں کا ہاتھ ہے"۔

(ہنگ سنگ سنڈیس ۲۵ر دسمبر ۱۹۵۱ء)

باشندوں پر (بلا تمیز عمر و صنف) ہیبت ناک مظالم توڑے گئے، بہادر شاہ نے پنجاب کا رخ کیا، شاہی فوجوں نے بندہ کو شکست دی، لیکن بندہ پہاڑیوں کی طرف نکل گیا، فرخ سیر کی تخت نشینی کے بعد سیاسی انتشار اور شاہی خاندان کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر بندہ بیراگی نے دوبارہ دہشت انگیزی سے کام لینا شروع کیا، بالآخر ۱۷۱۶ء میں اسے دہلی میں لا کر قتل کر دیا گیا، سکھوں کے نزدیک بھی وہ کوئی محترم و محبوب شخصیت نہیں تھا، اس نے سکھ مذہب کے عقائد و عبادات میں بھی کچھ تبدیلیاں کیں، اس کی قیادت میں سکھ ایک فوجی طاقت بن گئے، فرخ سیر کے عہد میں پنجاب کے مغل گورنر معین الملک نے (جو میر منّو کے نام سے زیادہ مشہور ہے) فرخ سیر کی تعزیری حکمت عملی کو جاری رکھا، مگر سلطنت مغلیہ کے زوال کی رفتار بہت تیز تھی، پنجاب کی حکومت احمد شاہ ابدالی کے پے در پے حملوں کی وجہ سے زیادہ کمزور ہو گئی تھی، سکھوں کو دوبارہ اٹھنے اور ابھرنے کا موقعہ ملا، وہ نہ صرف احمد شاہ درّانی کے فرزند شاہزادہ تیمور کو جو پنجاب کا حاکم تھا، اور جس نے امرتسر پر حملہ کر کے ہرمندر کو منہدم اور مذہبی تالاب کو ملبہ سے پُر کر دیا تھا، نکالنے میں کامیاب ہوئے، بلکہ لاہور پر عارضی طور پر قبضہ بھی کر لیا، اور ان کے فوجی سردار جسا سنگھ کلال نے اپنے نام کا سکہ بھی جاری کر دیا، لیکن رگھوبا کے زیر کمان مرہٹوں کی آمد (۱۷۵۵ء) پر وہ لاہور سے نکل گئے، احمد شاہ نے پانچویں بار پنجاب کا رخ کیا، پانی پت کی مشہور لڑائی کے بعد جس نے مرہٹہ طاقت کی کمر توڑ دی جونہی انھوں نے پنجاب چھوڑا، سکھ پھر نکل آئے، اور انھوں نے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ حاصل کر لی، احمد شاہ پھر واپس آیا، اور لدھیانہ میں (۱۷۶۲ء میں) اس نے سکھوں کو شکست فاش دی، لیکن اس کے جانے کے بعد ۱۷۶۳ء میں سکھوں نے سرہند کو تخت و تاراج کر کے ویران کر دیا، اور ایک بار پھر لاہور پر قبضہ کر کے خالصہ حکومت

کا اعلان کر دیا اس کے بعد سکھ متعدد ریاستوں اور گروہوں میں جس کو مسلین کہتے تھے، منقسم ہو گئے، ان پر کوئی حاکم اعلیٰ متعین نہیں تھا اور مذہب کے سوا ان کے درمیان کوئی چیز مشترک نہیں تھی، تیس سال کی اس غیر مستقل صورتِ حال کے بعد پنجاب میں رنجیت سنگھ کا ستارۂ اقبال بلند ہوا، جنھوں نے ان مخالف گروہوں کو ایک مضبوط سلطنت کی شکل میں متحد کر دیا۔

سکھ مذہب کا نصب العین ہندوؤں کے مذہبی عقائد کی تطہیر تھا، اس میں کچھ شبہ نہیں کہ بابا نانک اسلامی تعلیمات سے متاثر تھے، چنانچہ ان کا عقیدۂ توحید بنی نوع انسان کی مساوات، اور بت پرستی سے اجتناب وغیرہ اسلام کے اثر کا نتیجہ ہیں[1]۔

سکھوں کے مذہبی ادب کی زبان پر فارسی کے بڑے اثرات ہیں، خصوصاً ادی گرنتھ میں فارسی و اسلامی، دینی و صوفیانہ الفاظ کی بڑی آمیزش ہے[2]۔

اس کے پورے قرائن موجود تھے کہ یہ اصلاحی تحریک (اگر اپنے اصولوں پر سختی سے قائم رہتی اور ہندو مذہب و تہذیب میں تحلیل نہ ہو جاتی) ہندوستانی معاشرہ میں کوئی انقلابی خدمت انجام دیتی اور سکھ ہندوؤں سے الگ ایک مستقل و متمیز فرقہ ہوتا جس کی اساس توحید و مساوات پر ہوتی، اور اس طرح وہ مسلمانوں کے قریب تر مذہبی گروہ ہوتا، لیکن حکومتِ وقت کے ساتھ تصادم، اور سیاسی عمل و ردِ عمل کے بے ضمیر چکر نے جو مذہبی و اخلاقی نتائج سے بے پروا ہو کر وقت کے تقاضوں اور جماعتوں کے مفادات کی تکمیل کرتا ہے،

---

[1] ملاحظہ ہو جب بھی، نیز MACAULFFE ۲: ۳۴۷

[2] تاریخی مواد و معلومات کا بنیادی حصہ "دائرہ معارف اسلامیہ" ج ۱۱ کے مقالہ سکھ سے ماخوذ ہے، جو پروفیسر محمد اقبال کے قلم سے ہے۔

سکھوں کو مسلم حکومتوں ہی نہیں مسلم عوام سے دور و نفور اور ان سے برسرِ پیکار بنا دیا اور خصوصیت کے ساتھ بارہویں صدی ہجری اور اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط میں ان کو ہندوستان کی انتشار انگیز طاقتوں میں ایک اضافہ اور بڑے بڑے شہروں کے پر امن شہریوں کے لئے ایک دہشت انگیز اور زلزلہ خیز طاقت میں تبدیل کر دیا۔ ان کے دورِ حکومت میں اکثر اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دورِ اقتدار میں خاص طور پر مساجد و مقابر کی بے حرمتی ہوئی، عبادات میں خلل ڈالا گیا، اور وہ صورتِ حال پیدا ہوئی جس کی ترجمانی علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کی ہے ؎

خالصہ شمشیر و قرآن را ببرد

اندراں کشور مسلمانی بمرد

اس صورتِ حال کے خلاف تیرہویں صدی کے تقریباً وسط، اور انیسویں صدی کے ثلث اول میں حضرت سید احمد شہیدؒ (۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۰ء) اور مولانا اسماعیل شہیدؒ (۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۰ء) نے جو شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی دانش گاہ کے تعلیم یافتہ اور ان کے فرزند اکبر شاہ عبد العزیزؒ کے تربیت یافتہ تھے، رنجیت سنگھ کی فوجی حکومت کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا، اور اس سے اپنے اس وسیع و عمیق منصوبہ اور مہم کا آغاز کیا، جو ہندوستان کو غیر ملکی اقتدار سے آزاد کرانے، حکومتِ شرعی کے قیام اور مسلم معاشرہ کی اصلاح و تطہیر اور احیائے دین کے لئے شروع کی تھی۔[۲]

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہیدؒ" جلد اول سترھواں باب عنوان "پنجاب میں مسلمانوں کی حالت" ص۲۱۳-۲۱۹۔

[۲] ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہیدؒ" ۲۰۱

جاٹ

جاٹ مرہٹوں کی طرح نہ کوئی منظم فرقہ تھے، نہ سکھوں کی طرح کوئی مذہبی گروہ، لیکن مغل سلطنت کی کمزوری، سیاسی انتشار، اور عام آبادی کے عدم تحفظ کے احساس نے ان میں ایک طرح کی سلبی و جارحانہ تنظیم پیدا کردی تھی اور وہ ایک تخریبی اور انتشار انگیز طاقت بن گئے تھے، جس کا مقصد قیام سلطنت اور کوئی سیاسی انقلاب نہ تھا، محض بگڑے ہوئے حالات سے عارضی فائدہ اٹھانا، استحصال اور اقتصادی مقاصد کی تکمیل تھی۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی اپنی کتاب "شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سیاسی مکتوبات" میں لکھتے ہیں:-

"جمنا کے جنوبی علاقہ میں آگرہ سے دہلی تک جاٹ آباد تھے، ان کی شرقی سرحد چنبل تھی، اس علاقہ میں ان کی ہنگامہ آرائی کا یہ عالم تھا کہ مرکزی حکومت کا ناک میں دم آگیا تھا، بقول سرکار: دہلی اور آگرہ کی سڑک پر ایسا کانٹا برداشت نہیں کیا جاسکتا تھا (FALL, VOL I.P 369) دہلی سے آگرہ نقل و حرکت میں بڑی احتیاط برتنی پڑتی تھی، دکن کو اجمیر ہوتی ہوئی جو فوجیں جاتی تھیں، وہ اسی علاقہ سے گذرتی تھیں۔

بہادر شاہ کے زمانہ میں اس سڑک کی مخدوش حالت کا اندازہ "دستورالانشاء" کے مطالعہ سے ہوتا ہے (ملاحظہ ہو دستورالانشاء از یار محمد ص ۱۱۳) ۱۷۱۱ء میں جب ڈچ نمائندے اس علاقہ سے گذرے تو انھوں نے بھی ان ہنگاموں کو دیکھا۔ (LATER MUGHALS, I, P. 321)

جان سرمن (JOHN SURMAN) جون ۱۷۱۵ء میں یہاں سے گذرا تھا اس نے جاٹوں کی امن سوز حرکتوں کا ذکر اپنی ڈائری میں کیا ہے:-

(ORME COLLECTIONS, P. 1694)

شاہ جہاں کے عہد میں جاٹوں نے ایک مرتبہ زبردست شورش برپا کی تھی، ۱۰۴۷ھ/۱۶۳۷ء میں متھرا کا فوجدار مرشد قلی خاں ان سے لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔

سرجدوناتھ سرکار تاریخ اورنگ زیب جلد پنجم ص ۲۹۶ پر لکھتے ہیں:-

اورنگ زیب کی شمالی ہندوستان سے غیر حاضری کا فائدہ دو نئے جاٹ لیڈروں راجہ رام اور رام چہرہ نے اٹھایا ...... راجہ رام کی قانون شکن حرکتوں کو آگرہ کا گورنر خانی خاں بھی نہ روک سکا، جاٹوں نے راستے بند کر دیئے، اور بہت سے علاقوں کو لوٹا، اور اکبر کے مقبرہ کو لوٹنے کے لئے سکندرہ کا رخ کیا لیکن میر ابوالفضل نے جو وہاں کا فوجدار تھا، بہادری سے مقابلہ کیا، اور باغی کو آگے نہ بڑھنے دیا، راجہ رام نے مشہور تورانی افسر اصغر خاں کا سامان لوٹا، ...... اصغر خاں جاٹوں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔[۱]

ہرچرن داس مصنف چہار گلزار شجاعی کا بیان ہے کہ جب جاٹوں نے پرانی دہلی کو لوٹنا شروع کیا تو دہلی کے باشندے گھبراہٹ اور پریشانی میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے، وہ دربدر، گلی بہ گلی مارے مارے پھرتے تھے، بالکل اس طرح جیسے کوئی ٹوٹا ہوا جہاز ظالم موجوں کے رحم و کرم پر ہو، پاگلوں کی طرح ہر شخص پریشان حال اور گھبرایا ہوا نظر آتا تھا۔" (قلمی نسخہ ص ۱۴۳)[۲]

---

[۱] شاہ ولی اللہ صاحب کے سیاسی مکتوبات، از پروفیسر خلیق احمد نظامی ص ۱۷۵   [۲] ایضاً ص ۱۷۷

مولوی ذکاء اللہ صاحب ۱۷۶۵ء کے واقعات میں لکھتے ہیں:-

"آگرہ کے قلعہ میں جاٹوں کا تسلط تھا، دہلی سے تیس میل پر جاٹوں کا عمل دخل تھا، راجہ سورج مل بڑا ہوشیار صف آرائی میں ماہر اور ملک ستانی میں کارداں تھا اس نے آگرہ سے مرہٹہ سردار کو نکال دیا، اور میوات پر قبضہ کر لیا، چار قلعے نہایت مستحکم بنائے، اس نے دلی کی سلطنت سے ایسی درخواستیں کرنی شروع کیں، جن سے سلطنت کا نا [illegible] ہے، نجیب الدولہ نے اپنی حسن تدبیر اور بلوچوں کی مدد سے جاٹوں پر فتح حاصل کی، راجہ سورج مل نجیب الدولہ کے مقابلہ میں دہلی کے قریب مارا گیا، اس کے بعد جاٹوں کی ریاست میں بہت سے جھگڑے برپا ہوئے، سورج مل کے دو بیٹے مارے گئے تیسرا ابتیار رنجیت سنگھ راجہ ہوا، اس کے عہد میں جاٹوں کی ریاست کا بڑا عروج ہوا جس ملک پر وہ فرماں روائی کرتے تھے اس کے شمال مغرب میں الور اور جنوب مغرب میں آگرہ تھا، اس کی آمدنی دو کروڑ روپے کی تھی، ساٹھ ہزار فوج ان کے پاس تھی"[1]

دہلی کی حالت

مرہٹوں، سکھوں، اور جاٹوں کے حملوں سے جو گویا روزانہ کا معمول بن گیا تھا، اور حفاظت و دفاع کی ہر قسم کی طاقت اور اہلیت کے فقدان سے دہلی ایک ایسا پر ثمر اور غیر محفوظ درخت بن گیا تھا، جس پر ہر طرف سے غول بیابانی حملہ کرتا اور اس کو برگ و بار سے محروم کر دیتا، دہلی کے باشندے جو ساری سلطنت میں نہ صرف عزت و احترام کی

---

[1] مختصراً از "تاریخ ہندوستان" از مولوی ذکاء اللہ صاحب دہلوی۔ جلد نہم ص ۳۱۶-۳۱۰

نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، بلکہ علم، زبان، تہذیب، شرافت اور عادات واطوار میں بھی معیار سمجھے جاتے تھے، حملہ آوروں کے لئے "خوان یغما" بن گئے تھے، اس عہد کے علماء ومشائخ کے (جن کا شعار انقطاع الی اللہ اور رضا بالقضاء ہے) خطوط سے بھی جو انھوں نے اپنے معتقدین واحباب کو لکھے ہیں، اس بدامنی، بے اطمینانی اور بے یقینی کا اندازہ ہوتا ہے، یہاں پر صرف حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے نامور معاصر، اور سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے گلِ سرسبد حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں (۱۱۱۱ھ - ۱۱۹۵ھ) کے خطوط کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں، ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:-

از تشویشات ہر روزہ دہلی تنگ آمدہ ام[1]۔	دہلی کے روزمرہ کے ہنگاموں اور بے اطمینانی سے تنگ آگیا ہوں۔

ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں:-

از ہر طرف فتنہ قصد دہلی می کند[2]۔	ہر طرف سے فتنہ دہلی کا رخ کرتا ہے۔

ایک اور مکتوب میں دارالسلطنت کی بدامنی اور اہلِ شہر کی پریشان حالی کا تذکرہ فرماتے ہوئے کہتے ہیں:-

احوال مردم شہر از بیماری عام و ناایمنی تا کجا نویسد، خدا ازیں بلدہ مورد غضب الٰہی برآرد کہ نسقے در امور سلطنت نماندہ خدا خیر کند[3]۔	عام بیماری اور بدامنی سے اہلِ شہر کی پریشانی کا حال کہاں تک لکھا جائے، خدا اس شہر سے جو غضب الٰہی کا مورد ہو رہا ہے باہر نکالے کہ امور سلطنت میں کوئی نظم باقی نہیں رہا

---

[1] کلمات طیبات، مکتوب ۳۰ [2] ایضاً ۵۴ [3] ایضاً ۸۶

خدا اپنا فضل فرمائے۔

حملۂ نادری

شاہ صاحب ۱۱۴۵ھ میں حجاز سے دلّی پہونچے تھے، پانچ سال ہی گزرے تھے کہ ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۸ء میں نادر شاہ کا دلی پر وہ حملہ ہوا جس نے سلطنت مغلیہ کی رہی سہی چولیں ہلا دیں اور دلّی کی خاک اڑادی۔ اس حملہ نے دلّی کے غیرت مند شہریوں اور شریف خاندانوں کے دل و دماغ پر وہ اثر ڈالا کہ وہ زندگی سے بیزار و شرمسار اور اپنے ہاتھوں اپنی موت کا سامان کرنے کے لئے تیار تھے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے ملفوظات میں ہے کہ آپ نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس قتل عام اور عزت و ناموس کی بربادی کے موقعہ پر پرانی دلّی کے شرفاء، پرانے راجپوتوں کے دستور کے مطابق "جوہر[1]" کا قطعی طور پر ارادہ کر چکے تھے، اس موقعہ پر والد ماجد (شاہ ولی اللہ صاحبؒ) مسلمانوں کو واقعۂ کربلا، اور سیدنا حسینؓ کے مصائب یاد دلا کر اس ارادہ سے باز رکھا کہ انھوں نے ان لرزہ خیز اور ناقابل تصور مصائب کے باوجود صبر و رضا کی راہ اختیار کی اور خاکم بدہن، خویش کشی اور خودکشی کا ارادہ نہیں کیا۔

ناساعد و زلزلہ انگیز حالات میں تدریس و تصنیف کی یکسوئی

مرہٹہ گردی، جاٹ گردی، سکھ گردی اور نادر گردی کے ہوش رُبا مصائب[2] و زلزلوں

---

[1] جب راجپوت شرفاء ہر طرف سے گھر جاتے تھے اور باعزت زندگی کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا تھا تو اپنے اہل و عیال کو تہہ تیغ کر کے جلتی ہوئی آگ میں پھاند جاتے تھے۔

کے درمیان جو دلی کو زیر و زبر کر کے رکھ دیتے تھے، اور جن میں بعض اوقات نقل مکانی بھی کرنا پڑا، "القول الجلی" سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۳۳ھ کے درانی فتنہ میں شاہ صاحب خدام کی استدعا پر وطن مالوف سے مع اہل خانہ و متعلقین منتقل ہو کر قصبہ بڈھانہ میں تشریف لائے، جب رمضان کا مہینہ آیا، تو معمول قدیم کے مطابق ایک چلّہ کا اعتکاف بھی فرمایا[1]، شاہ صاحبؒ درس، تصنیف، دعوت الی اللہ، تزکیۂ نفوس و تربیتِ طالبین کا کام اس جمعیت خاطر اور اس اہتمام و انصرام کے ساتھ کرتے رہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ دلی ہی نہیں سارے ہندوستان میں معتدل و پُرسکون حالات ہیں، اور وہ ایک گوشۂ عافیت میں بیٹھے ہوئے علمی تحقیق، فکری رہنمائی اور اخلاقی تربیت اور احیائے ملت کے کام میں ہمہ تن مصروف ہیں، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بڑی خوبی اور بلاغت کے ساتھ اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں :-

> "ایسے کم مصنف گزرے ہیں جن کی تصانیف میں ان کے زمانہ کی روح نہ ہو یا اس میں زمان و مکان کی جھلک نہ ہو، اور کم از کم یہ کہ اپنے زمانہ کی علمی ناقدر شناسی اور اضطراب احوال کا ذکر نہ ہو، مگر شاہ صاحب کی تصانیف کا یہ حال ہے کہ وہ زمان و مکان کی قید سے بالکل پاک اور گلۂ و شکایت اور حرف و حکایت سے سراپا بے نیاز ہیں یہ معلوم ہی نہیں ہوتا، کہ یہ کتابیں اس زمانہ میں لکھی گئی ہیں، جب امن و اطمینان اس ملک سے حرف غلط کی طرح مٹ گیا تھا، سارا ملک طوائف الملوکی، خانہ جنگی، سیاسی بدامنی اور ہر طرح کے شور و شر میں مبتلا تھا، دلی کی سیاسی مرکزیت مٹ چکی تھی، ہر شمشیر زن اپنی بادشاہی کا خواب دیکھ رہا تھا، سکھ ایک طرف، مرہٹے دوسری طرف، جاٹ تیسری طرف، اور روہیلے چوتھی طرف، ملک میں ہر طرف اودھم مچا رہے تھے،

---

[1] القول الجلی (قلمی)

اور نادر شاہ اور احمد شاہ جیسے پرجوش سپہ سالار خیبر کے دروازہ کے پاس کھڑے جب چاہتے تھے آندھی کی طرح آجاتے اور سیلاب کی طرح نکل جاتے تھے اس عہد میں دلی خدا جانے کتنی دفعہ لٹی اور کتنی دفعہ بنی، مگر اثر رہے دلی کے تاجدارِ علم کا امن و اطمینان کہ یہ سب کچھ آنکھوں کے سامنے ہوتا رہا، مگر نہ دل کو اضطراب، نہ خیال میں انتشار، نہ قلم میں اضطرار، نہ زبان پر زمانہ کا گلہ، نہ قلم سے بے اطمینانی کا اظہار، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلندی کے جس آسمان یا صبر و رضا کے جس لامکان میں تھے، وہاں تک زمین کی آندھیاں نہیں پہونچتیں، اور زمان و مکان کی گردشیں وہاں اپنا کام نہیں کرتیں اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ سچے اہل علم کی شان کتنی بلند اور اصحاب تسلیم و رضا کا منصب کتنا اونچا ہے۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ہاں اللہ کی یاد ہی سے دل اطمینان پاتے ہیں۔ (الرعد-۲۸)

صحیح علم کی صحیح خدمت بھی ذکر اللہ کی دوسری شکل ہے، اس لئے اگر وہ بھی قلب میں اطمینان، اور روح میں سکون پیدا کرے تو عجب نہیں، شاہ صاحب کی تصنیفات کے ہزاروں صفحے پڑھ جائیے آپ کو یہ معلوم بھی نہ ہوگا کہ یہ بارہویں صدی ہجری کے پرآشوب زمانہ کی پیداوار ہے جب ہر چیز بے اطمینانی اور بدامنی کی نذر تھی، صرف یہ معلوم ہوگا، کہ علم و فضل کا ایک دریا ہے جو کسی شور و غل کے بغیر سکون و آرام کے ساتھ بہہ رہا ہے، جو زمان و مکان کے خس و خاشاک کی گندگی سے پاک و صاف ہے۔[1]

---

[1] شاہ ولی اللہ نمبر، الفرقان، ص ۳۴۸-۳۴۹

سیاسی انتشار اور حکومت مغلیہ کے دور احتضار میں مجاہدانہ وقائدانہ کردار

صرف یہی نہیں کہ شاہ صاحب مصائب و حوادث کے اس گرد و غبار، بلکہ ان کی موسلادھار بارش کے درمیان زیر آسمان بیٹھے ہوئے تصنیف و تحقیق اور درس و تعلیم میں اس طرح منہمک تھے کہ نہ ہوا کے تیز جھونکے سے زیر تسوید کتاب کا کوئی ورق الٹتا تھا، نہ بارش کا کوئی قطرہ اس کے کسی نقش کو مٹاتا تھا، بلکہ وہ ان حالات کو تبدیل کرنے، اس ملک میں مسلمانوں کے اقتدار کو دوبارہ واپس لانے، اور ایک فرض شناس، حقیقت پسند، احکام شریعت پر عمل کرنے والی، عام شہریوں کی عزت و ناموس کی محافظ، انتشار انگیز طاقتوں کو ختم کرنے والی، مستحکم و خوش حال سلطنت کے قیام کے لئے بھی ساعی اور سرگرم تھے، اور اس سلسلہ میں بھی وہ ایسا قائدانہ کردار ادا کر رہے تھے، جو بڑے سے بڑا سیاسی مبصر ادا کر سکتا تھا، جس کو تصنیف و تالیف، اور درس و تحقیق سے ادنیٰ مناسبت اور ذرہ برابر فرصت نہ ہو۔

مجددین اور داعیانِ اسلام، اور محققین و مصنفین میں اگر کسی کی زندگی میں یہ مماثلت نظر آتی ہے تو شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی زندگی میں، جنھوں نے ۷۰۰ھ میں شام کے مسلمانوں کو خون آشام تاتاریوں کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی اور ان کے اکھڑتے ہوئے قدم جمائے، پھر جب سلطان مصر محمد بن قلاوون نے شام آ کر تاتاریوں سے جنگ کرنے کا ارادہ ملتوی کیا اور اہل شام میں سخت انتشار اور اضطراب پیدا ہوا، تو وہ خود مصر گئے اور سلطان کو ملک شام کی حفاظت اور تاتاریوں سے مقابلہ پر آمادہ کیا، اور سلطان کے ساتھ جہاد میں شرکت کی، اور تاتاریوں کو ایسی شکست فاش ہوئی جس کی مثال ان کی گزشتہ تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔[1]

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت" جلد ۲ ص ۴۶–۵۴

شاہ صاحب نے بھی اپنے علمی مشاغل اور احیاء و تجدید کی مساعی کے ساتھ ایسے سیاسی تدبر، اور ایسی ذہانت اور بلند نگاہی سے کام لیا کہ اگر مغلوں میں کچھ بھی صلاحیت یا امرائے سلطنت میں ہمت اور سیاسی شعور ہوتا تو ہندوستان نہ صرف تنگ نظر اور انتشار پسند ملکی حوصلہ آزماؤں سے محفوظ ہو جاتا، بلکہ انگریزوں کے اس تسلط سے بھی محفوظ ہو جاتا جس نے انیسویں صدی کے وسط میں ہندوستان کو کمزور اور میدان کو خالی پاکر اپنے قدم جمالئے۔ اور اس کو برطانوی سلطنت میں نہ صرف شامل کیا، بلکہ اس سے وہ قوت اور وسائل حاصل کئے، جس نے دنیا کی پوری سیاست پر اثر ڈالا، اور مسلم اور عرب ممالک پر اپنا اقتدار جمایا۔

شاہ صاحب کی اس جمعیتِ خاطر، ہمت و استقامت، بلند نگاہی و اولوالعزمی اور اس کے مقابلے میں ملک کی زلزلہ انگیز فضا کو دیکھتے ہوئے (جس میں نہ کسی سنجیدہ اور عمیق و مسلسل مشغولیت کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، نہ کسی انقلابِ حال اور عروج بعد زوال کی امید) اقبالؔ کا یہ شعر حقیقت حال کی سچی تصویر معلوم ہوتا ہے ؎

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

شاہ صاحبؒ کا احساس و اضطراب

شاہ صاحب جنھوں نے ابتدائے سن شعور میں اورنگ زیب عالمگیر کے دبدبۂ حکومت و اقبال سلطنت کے آثار دیکھے تھے، اور اس سے پہلے کے (جب سلطنت مغلیہ کا ستارۂ اقبال بلند اور جاہ و جلال قائم تھا) قصے دہلی کے بزرگوں اور اہل خاندان سے سُنے تھے، اور جن کے قلم سے خلافتِ راشدہ کے کارنامے اور تاریخ اسلام کے عہد زریں کے تابناک نقوش،

اسلامی حکومت کے فرائض وذمہ داریوں اور اس کے ساتھ خدا کی مدد اور نصرت کی تفصیل ازالۃ الخفا کے صفحات پر ثبت ہوئی تھی، ان کی آنکھوں نے مغلیہ سلطنت کے عہد زوال اور فرخ سیر اور محمد شاہ کے زمانہ کی بدنظمی، طوائف الملوکی، ریاستوں کی بغاوت، تخریب مذہب وملت، اہل ملک کی جان ومال، عزت وآبرو کا عدم تحفظ [illegible] شعائرِ اسلام کی بے حرمتی اور مسلمانوں کی (جو چھ سو سال سے اس ملک پر حکومت کر رہے تھے) مجبوری اور بے بسی کا نظارہ دیکھا تو ان کا حساس و دردمند دل خون کے آنسو رویا، اور خون کے یہ قطرے ان کے گوہر بار قلم سے ان خطوط کے صفحات پر جو انھوں نے اپنے زمانہ کے بعض اہلِ دُول اور معتمدین کو لکھے ہیں ٹپک پڑے، یہاں پر اس کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں، ایک معاصر بادشاہ کے نام[1] سورج مل جاٹ کے دور دورہ اور اسلام کی غربت کا حال بیان کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

ازان باز شوکت سورج مل افزونی	اس کے بعد سے سورج مل کی شوکت
یافت وازدوکروہ دہلی گرفتہ	ترقی پاگئی دہلی سے دو کوس کے فاصلے
تا قصبۂ اکبر آباد طولاً واز حدود	سے لے کر آگرہ کے آخر تک طول میں
میوات تا فیروز آباد و شکوہ آباد	اور میوات کے حدود سے فیروز آباد
عرضاً متصرف شد واذان وصلاۃ	اور شکوہ آباد تک عرض میں سورج مل
مفقود، کسے نہ کہ برپا دارد۔[2]	قابض ہو گیا کسی کی طاقت نہیں کہ
	وہاں اذان ونماز جاری کر سکے۔

---

[1] جیسا کہ آگے آئیگا اس بات کے پورے قرائن موجود ہیں کہ یہ خط احمد شاہ ابدالی کے نام لکھا گیا ہے۔

[2] مکتوب بہ بعض سلاطین (شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سیاسی مکتوبات — پروفیسر خلیق احمد نظامی ص۱۵)

اسی مکتوب میں ایک آباد و مردم خیز شہر بیانہ کی ویرانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

شہر بیانہ را کہ شہر قدیم اسلام بود	شہر بیانہ جو کہ اسلام کا قدیم شہر
وعلماء و مشائخ از مدت ہفت صد	تھا اور جہاں پر علماء و مشائخ
سال درآں جا اقامت داشتند	سات سَو سال سے اقامت پذیر
قہراً وجبراً متصرف گشتہ ہمہ	تھے اس شہر پر قہراً و جبراً قبضہ
مسلمانان را بخواری اخراج نمودند[1]	کر کے مسلمانوں کو ذلت و خواری
	کے ساتھ وہاں سے نکال دیا۔

ملازمین شاہی جن کی تعداد لاکھ سے اوپر تھی کی خستہ حالی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

چوں خزانہ پادشاہ نماند نقدی	جب خزانہ بادشاہ نہیں رہا،
ہم موقوف شد آخر حال ہمہ از	نقدی بھی موقوف ہوگئی، آخرکار
ہم پاشیدند و کاسۂ گدائی در	سب ملازمین تتر بتر ہوگئے، اور
دست گرفتہ اند و از سلطنت	کاسۂ گدائی اپنے ہاتھ میں لے لیا'
بجز نامے باقی نماند[2]۔	سلطنت کا بجز نام کے اور کچھ
	باقی نہ رہا۔

مسلمانوں کے مختلف طبقوں کا حال لکھتے ہوئے ان کے قلم سے یہ موثر جملہ نکل گیا ہے:۔

بالجملہ ایں جماعت مسلمین قابل ترحم	غرض کہ جماعت مسلمین قابل رحم
اند[3]۔	ہے۔

نواب نجیب الدولہ کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

۱؎ ایضاً ص۹ ۲؎ ایضاً ص۱۱ ۳؎ ایضاً ص۱۱

مسلمانانِ ہندوستان چہ دہلی وچہ غیر آں چندیں صدمات دیدہ اند و چند بار نہیب وغارت آزردہ کارد باستخواں رسیدہ است جائے رحم است [1].	مسلمانانِ ہندوستان نے خواہ وہ دہلی کے ہوں خواہ اس کے علاوہ کسی اور جگہ کے کئی صدمات دیکھے ہیں اور چند بار لوٹ مار کے شکار ہوئے ہیں چاقو ہڈی تک پہونچ گیا ہے" رحم کا مقام ہے۔

شاہ صاحب حقائق و واقعات اور مؤثر اور طاقتور اسباب پر نظر کر کے یقینی نتائج اور مستقبل قریب کی اس طرح پیشین گوئی کرتے ہیں جس میں قیاس و ذہانت کا دخل نہیں محض حالات کا غیر جانبدارانہ اور حقیقت پسندانہ جائزہ ہے:۔

اگر غلبۂ کفر معاذ اللہ بہمیں مرتبہ ماند مسلماناں اسلام فراموش کنند وانداکے از زماں نہ گذرد کہ قومے شوند کہ نہ اسلام را دانند نہ کفر را [2]۔	اگر غلبۂ کفر معاذ اللہ اسی انداز پر رہا تو مسلمان اسلام کو فراموش کر دیں گے اور تھوڑا ہی زمانہ گذرے گا کہ یہ مسلم قوم ایسی قوم بن جائیگی کہ اسلام اور غیر اسلام میں تمیز نہ کر سکے گی۔

مغل بادشاہوں اور ارکان سلطنت کو نصیحت و مشورہ

شاہ صاحبؒ نے خاندان مغلیہ کے سلاطین کے عروج وزوال اور ان کے اسباب کا

---

[1] مکتوب ہفتم بطرف نجیب الدولہ ص۲۲-۲۳ [2] ایضاً ص۱۲

بنور مطالعہ فرمایا تھا (جیسا کہ حجۃ اللہ البالغہ کے اس مضمون سے ظاہر ہوتا ہے جو باب ہفتم میں گزر چکا ہے) سلطنت مغلیہ کے علاوہ انھوں نے دوسری اسلامی سلطنتوں کی تاریخ بھی دقّتِ نظر سے پڑھی تھی، اور اس سے انھوں نے وہ حکیمانہ نتائج اخذ کئے تھے، جو قرآن مجید کا ایسا ہی حامل اور عالم اخذ کرسکتا ہے، جو خدا کے قانونِ مجازاۃ اور سنت اللہ سے واقف ہے، ان سے یہ حقیقت مخفی نہ تھی کہ اس خاندان کا مزاج طویل موروثی سلطنت، اسبابِ عیش وعشرت کی فراوانی، اور خود غرض مصاحبین، اور مشیران سلطنت کی کوتاہ نظری سے فاسد ہوگیا ہے، اور بیماریاں اس کے جسم میں جڑ پکڑ گئی ہیں، وہ عرب فلسفی مورخ علامہ ابن خلدونؒ کے اس حکیمانہ مقولہ سے بھی بے خبر نہ تھے کہ "إن الهرم إذا نزل بالدولة لا يرتفع"[1] (جب کوئی سلطنت بوڑھاپے کے مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہے تو اس کا از سرِ نو جوان ہونا (عام طور پر) ممکن نہیں ہوتا۔)

لیکن صحیح فکرمندی، سچی طلب اور دل سے لگی ہوئی بات انسان کو ایسی جگہ بھی قسمت آزمائی پر آمادہ کرتی ہے، جہاں کامیابی کی امید موہوم بھی ہو، جس مسافر پر تشنگی کا غلبہ ہوتا ہے، اور جان لبوں پر آجاتی ہے، ہزار عقل ودانائی اور تجربوں کے باوجود بھی اس کے قدم پانی کی امید میں چشمۂ سراب کی طرف بے اختیارانہ اٹھ جاتے ہیں کہ عقل کی خود فریبی بھی پیاس کی علامت ہے، عرفیؔ نے کیا خوب کہا ہے ؎

زنقصِ تشنہ لبی داں بہ عقل خویش مناز
دلت فریب گراز جلوۂ سراب نخورد

(سچی پیاس کی کمی کو اس کا سبب سمجھ، اپنی عقل پر ناز نہ کر اگر تیرے دل نے (جان بوجھ کر بھی)

---

[1] ملاحظہ ہو مقدمۃ ابن خلدونؒ فصل إن الهرم اذا نزل بالدولة لا يرتفع ص۲۰۰

سراب کی ظاہری چمک دمک سے دھوکا نہیں کھایا۔)

لیکن انسان پھر ایک ایسے خاندان کا معاملہ جس نے صدیوں جاہ و جلال سے حکومت کی تھی، ایک بے جان اور جامد سراب سے بہر حال مختلف ہے، اور اس سے یہ توقع کرنی بے جا نہیں کہ اس میں پھر کوئی باحمیت اور صاحب عزیمت مرد میدان پیدا ہو سکتا ہے، جو حالات کا رُخ بدل دے اور جاں بلب سلطنت میں زندگی کی نئی روح پھونک دے شاہ صاحب اپنے عہد کے قرآن مجید کے بڑے رمز شناس اور غواص تھے ان کے سامنے قرآن کی یہ آیت تھی :۔

تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ	تو ہی رات کو دن میں داخل کرتا اور
فِي اللَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ	تو ہی دن کو رات میں داخل کرتا ہے
وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ	اور تو ہی بے جان سے جاندار پیدا
مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝	کرتا ہے، اور تو ہی جاندار سے بے جان
(آل عمران - ۲۷)	پیدا کرتا ہے اور تو ہی جس کو چاہتا ہے
	بے شمار رزق بخشتا ہے۔

اسی بنا پر شاہ صاحب نے قلعۂ معلیٰ کے حالات کو اچھی طرح جانتے ہوئے بھی اپنے زمانہ کے ایک مغل بادشاہ[۱] کو خط لکھا ہے، جس میں اس کو اصلاح حال، تقویت سلطنت اور خدا کی رحمت و نصرت کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے ایسے حکیمانہ اور دانشمندانہ مشورے دیئے گئے ہیں جو اعلیٰ درجہ کی حکمت دین، تاریخ و سیاست اور نظم مملکت کے عمیق و وسیع مطالعہ پر مبنی ہے، شروع ہی میں لکھا ہے کہ :۔

امیدواری از فضل حضرت باری   اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے

لہ افسوس ہے کہ اس مغل بادشاہ کا نام (جس کے نام یہ اہم خط لکھا گیا ہے) معلوم نہیں ہو سکا۔

آنست کہ اگر بموجب ایں کلمات
عمل کنند تقویت امور سلطنت
وبقائے دولت ورفع منزلت
بظہور می رسد فردے
درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم[1]

امید ہے کہ اگر ان کلمات کے بموجب
عمل کریں گے تو امور سلطنت کی
تقویت، حکومت کی بقاء اور
عزت کی بلندی ظہور پذیر ہو گی۔
شاعر کہتا ہے۔
کہ مجھکو آئینہ کے پیچھے طوطی کے مانند
رکھا ہے، جو کچھ استاد ازل نے کہا ہے
وہی کہتا ہوں۔

اس خط میں جو بادشاہ وقت، اس کے وزیر اور امراءِ سلطنت کو لکھا گیا ہے، چند نہایت دانشمندانہ، سیاسی و انتظامی مشوروں کے بعد جن کے بغیر سلطنت کا قیام، رعیت کا رفاہِ عام اور لوگوں کا اعتماد بحال نہیں ہو سکتا، آخر میں لکھا ہے کہ قاضی اور محتسب ایسے لوگوں کو بنایا جائے جن کو رشوت ستانی کی تہمت نہ لگی ہو، اور وہ مذہب اہل سنت والجماعت کے ہوں، نیز یہ کہ ائمۂ مساجد کو اچھے طریقہ پر تنخواہ دی جائے، نماز باجماعت کی حاضری کی تاکید کی جائے، اور اس کا پورے اہتمام کے ساتھ اعلان کیا جائے کہ ماہ رمضان کی بے حرمتی نہ ہونے پائے، آخر میں یہ کہ بادشاہ اسلام اور امرائے عظام ناجائز عیش وعشرت میں مشغول نہ ہوں، گذشتہ گناہوں سے سچے دل سے توبہ کریں اور آئندہ گناہوں سے بچتے رہیں، اگر ان کلمات پر عمل کیا جائیگا تو مجھے امید ہے کہ بقائے سلطنت، تائیدِ غیبی اور نصرت الٰہی میسر ہوگی "وما توفیقی إلا باللہ علیہ توکلت وإلیہ أنیب"[2]

---

[1] شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سیاسی مکتوبات، مکتوب اول بجانب بادشاہ و وزیر و امراء۔

[2] ملاحظہ ہو سیاسی مکتوبات ص۵۰۔۱

اس طرح شاہ صاحبؒ نے اپنا وہ فرض ادا کر دیا جو ایک جید عالم دین شارحِ قرآن وحدیث اور وقت کے مصلح اور مجدّد کو ادا کرنا چاہئے تھا، جو اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے آگاہ اور ان خطرات سے باخبر ہے جو صرف حکمراں خاندان ہی کے سر پر نہیں پورے اہل ملک کی گردنوں پر ننگی تلوار کی طرح لٹک رہے تھے، شاہ صاحبؒ نے اپنے اسلاف کے اتباع اور ربانیین امت کے دستور کے مطابق سرکار دربار سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رکھا تھا، اور اپنے بوریائے فقر پر متمکّن رہے تھے، لیکن حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور ان کے جانشین حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی طرح ان کا دل حکومتِ وقت اور اس کی صحیح رہنمائی کے لئے دعا میں مشغول تھا، اور ان لوگوں کو جو اس مرکز علمی وروحانی سے تعلق رکھتے تھے، وہ زبان وقلم سے صحیح مشورہ دینے میں کسی بخل اور احتیاط سے کام نہیں لیتے تھے، ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ بادشاہ خود اچانک شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور دعا کی درخواست کی، اپنے محبوب ومعتمد مرید مسترشد اور برادر نسبتی شاہ محمد عاشق پھلتیؒ کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:-

"جمعرات کے دن بادشاہ حضرت نظام الدین اولیاء اور دیگر مشائخ کے مزارات کی زیارت کرنے کے لئے سوار ہو کر گیا تھا[1]، مجھے پہلے سے اطلاع دیئے بغیر کابلی دروازہ سے سادہ تخت پر سوار ہو کر غریب خانہ پر وارد ہوا، فقیر کو کوئی اطلاع ہی نہ تھی مسجد میں بوریوں پر آ کر بیٹھ گیا، اس قدر توقیر سلطان کرنا لازم ہوئی کہ فقیر جس مصلے پر بیٹھا ہے اور نماز ادا کرتا ہے اس کو اس طریقہ سے بچھا دیا گیا کہ اس کی ایک جانب بیٹھ گیا اور دوسری جانب بادشاہ، بادشاہ نے اول مصافحہ کیا بڑی تعظیم کے ساتھ بعد ازاں کہا، میں مدت سے آپ کی ملاقات کا مشتاق تھا، لیکن آج اس جوان کی رہنمائی میں

---

[1] افسوس ہے کہ مکتوب میں اس بادشاہ کا نام درج نہیں اور نہ کسی اور ذریعہ سے اس کی وضاحت ہو سکی۔

یہاں پہونچا ہوں' اشارہ وزیر کی طرف کیا پھر کہا کہ غلبۂ کفر اور رعیت کا تفرق و انتشار اس درجہ پر پہونچ گیا ہے کہ سب کو معلوم ہے، چنانچہ مجھے تو سونا، اور کھانا پینا دوبھر اور تلخ ہوگیا ہے' اس بارہ میں آپ کی دعا مطلوب ہے' میں نے کہا کہ پہلے بھی میں دعا کرتا تھا اور اب تو انشاء اللہ اور زیادہ دعا میں مشغول رہوں گا۔

اسی دوران میں وزیر نے مجھ سے کہا کہ حضرت بادشاہ پانچوں وقت کی نماز کا بڑا اہتمام فرماتے ہیں' میں نے کہا الحمدللہ، یہ وہ بات ہے کہ ایک مدت کے بعد سننے میں آرہی ہے' ورنہ ماضی قریب کے بادشاہوں میں سے کسی میں یہ نماز کی پابندی سننے میں نہیں آئی تھی"[1]

آخر میں شاہ صاحبؒ نے بادشاہ کو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وہ وصیت سنائی جو انھوں نے حضرت عمر فاروقؓ کو خلیفہ بناتے وقت فرمائی تھی:۔

"خلیفہ کو بھی عجیب عجیب مشکلات درپیش ہوتی ہیں' اعدائے دین کی طرف سے بھی اور موافقین کی طرف سے بھی' ان تمام مشکلات کا بس ایک ہی علاج ہے کہ مرضیاتِ حق کو اپنا نصب العین بنا کر حق تعالیٰ سے ہی مدد طلب کی جائے' اور اس کے غیر سے قطع نظر کر لی جائے"[2]

شیخ محمد عاشق کے نام ایک اور خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"بادشاہ[3] اور اس کی والدہ آئے تھے' پہلے مسجد میں زنانہ کا انتظام کیا گیا، اس صورت سے بادشاہ کے آنے کی غرض یہ تھی کہ بے تکلف ہو کر کچھ دیر ٹھہرے'

---

[1] سیاسی مکتوبات ص۱۳۵-۱۳۶ [2] ایضاً ص۱۳۶-۱۳۷ [3] یہاں بادشاہ سے احمد شاہ مراد ہے جو محمد شاہ کا فرزند و جانشین تھا ۱۱۶۱ھ میں تخت نشین ہوا۔

تقریباً تین ... سے زیادہ تر باتیں مخلوق خدا کی ... سے متعلق تھیں[1]"

... حکمراں خاندان کا زوال طویل موروثی سلطنت کے اثرات اور ... تیں اور سازشیں اس درجہ کو پہونچ گئی تھیں کہ کوئی بڑے سے بڑا صاحب عزم اورنگ نشین بھی تنہا اس زوال کو عروج سے، کمزوری کو نئی طاقت اور توانائی سے بدل کر پورے ملک کے حالات میں انقلاب نہیں لا ... تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ جب کسی سلطنت کا زوال اپنے آخری حدود تک پہونچ جاتا ہے اور مخالفتوں اور سازشوں کی سرنگیں سلطنت کو بارود کی طرح اڑانے کے لئے تیار ہوتی ہیں، تو بڑے سے بڑا قوی الارادہ جفاکش اور صاحبِ صلاح ... بادشاہ بھی سلطنت ... جسم میں زندگی کی نئی روح پھونکنے میں ناکام رہتا ہے، متعدد بار ایسا پیش آیا کہ حکمراں خاندان کا آخری آدمی جس کے زمانہ میں سلطنت کا انقراض پیش آیا، اپنے بہت سے پیشروؤں سے بہتر تھا، اور اس نے سلطنت کو سقوط سے بچانے کی جانبازانہ کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا، بنی مروان کے خاندان اور بنی امیہ کی سلطنت کے آخر میں مروان ابن محمد معروف بمروان الحمار (م ۱۳۲ھ) اور خلفائے عباسیہ کے خاندان کا آخری فرمانروا مستعصم باللہ (م ۶۵۶ھ) اور کسی حد تک تیموری خاندان کا آخری فرمانروا ابوظفر بہادر شاہ (م ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء) اس کی چند مثالیں ہیں۔

اس لئے ضرورت تھی کہ شاہ صاحبؒ کا جیسا بالغ نظر مصلح، وسیع النظر مؤرخ اور فراست ایمانی کا حامل برائے نام مغل فرمانرواؤں اور ان کے امرائے دربار سے رابطہ قائم کرنے ان کے اندر... حمیتِ ملی وغیرتِ دینی بیدار کرنے، بگڑے ہوئے حالات اور

---

[1] سیاسی مکتوبات ص۱۱

انتشار انگیز طاقتوں سے پنجہ آزمائی پر آمادہ اور تیار کرنے پر اکتفا نہ کرے، شاہ صاحب[۱] نے درباری امراء کے محدود حلقہ سے باہر نکل کر ان امرائے سلطنت آزمودہ کار قائدین افواج اور عالی حوصلہ سرداروں سے خط و کتابت کی جن کے خاکستر میں ان کو دینی حمیت اور قومی عزت کی کوئی دبی ہوئی چنگاری نظر آئی، ان میں حسب ذیل امرائے سلطنت اور قائدین[۲] تھے، وزیر مملکت آصفجاہ[۳]، نواب فیروز جنگ نظام الملک احمد شاہی[۳]، عماد الملک وزیر، ناج محمد خاں بلوچ، نواب مجد الدولہ بہادر[۳]، نواب عبید اللہ خاں کشمیری، میاں نیاز گل خاں، سید احمد روہیلہ۔

لیکن شاہ صاحب کی نگاہ انتخاب و اختصاص (جس کے ساتھ فراست ایمانی اور الہام ربانی شامل معلوم ہوتا ہے) اس عہد کی دو عظیم شخصیتوں پر پڑی، جن میں سے ایک ہندوستان کے اندر کی تھی اور ایک باہر کی، ہماری مراد امیر الامراء نواب نجیب الدولہ اور احمد شاہ ابدالی والیٔ افغانستان سے ہے۔

نواب نجیب الدولہ

نواب نجیب الدولہ[۴] میں وہ تمام صفات و خصائص پائے جاتے تھے، جو عہد قدیم میں بانیان سلطنت کی خصوصیت ہیں، اور جنھوں نے شخصی سلطنتوں اور خاندانوں کے عروج و اقتدار کے عہد میں (جب ذاتی جوہر اور وفاداروں کی جمعیت کا فراہم ہو جانا

۱-۲ مجموعۂ مکتوبات حضرت شاہ عبد الرحیم و حضرت شاہ ولی اللہ (قلمی) محفوظہ عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری حیدرآباد مخطوطات صفحہ ۲۱ ۳ ان کے نام چار خط ہیں ملاحظہ ہوں "حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے سیاسی مکتوبات" صفحہ ۶۰-۶۹ ۴ تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو "نجیب التواریخ" از نصیر الدین (قلمی نسخہ حبیب گنج) مختصر حالات کے لئے "شاہ ولی اللہ صاحب کے سیاسی مکتوبات" صفحہ ۲۲۱-۲۲۴

فتح اور قیام سلطنت کے لئے کافی ہوتا تھا) اہم کردار ادا کیا ہے اور ان کے ہاتھوں کسی فتح و تسخیر کے کسی کارنامہ کا ظہور ہوا ہے ان کے اندر اپنے ولی نعمت کے ساتھ وفاداری کا جوہر اپنے رفیقوں اور ماتحتوں کے ساتھ شرافت و احسان کی خو، سپہ گری کا جوہر و شجاعت اور قائدانہ صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی لیکن تاریخی تجربہ یہ ہے کہ یہ صفات و کمالات جنگی طاقتوں کو شکست دینے اور ملک فتح کرنے میں تو کامیاب ہو جاتی ہیں لیکن ایسے ماحول میں جس میں غداری اور کورنگی کو "فن شریف" کا درجہ دیا جائے، بے اصولی و بے کرداری کو اعلیٰ درجہ کی سیاست سمجھا جائے اور موقع سے فائدہ اٹھانے کو دانشمندی اور دور اندیشی تصور کیا جائے اکثر مفید بننے کے بجائے کامیابی میں حارج اور مشکلات پیدا ہونے کا باعث بنتی ہیں، بدقسمتی سے نواب نجیب الدولہ اور آصف جاہ نظام الملک کو ایسا ہی فاسد ماحول ملا تھا، مؤرخین اس کے اعلیٰ کردار اور سپاہیانہ و قائدانہ صلاحیت کی تعریف میں یک زبان ہیں سر جادو ناتھ سرکار لکھتا ہے :-

"ایک مؤرخ کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اس کی کس خوبی کی سب سے زیادہ تعریف کرے میدان جنگ میں اس کی حیرت انگیز قیادت کی، یا مشکلات میں اس کی تیز نگاہ یا صحیح رائے کی یا اس کی اس فطری صلاحیت کی جو اس کو انتشار و ابتری میں ایسی راہ دکھاتی تھی جس سے نتیجہ اس کے موافق نکل آتا تھا۔"[1]

مولوی ذکاء اللہ دہلوی تاریخ ہندوستان میں لکھتے ہیں :-

"نجیب الدولہ ایسا عاقل ہوشیار و دانشمند تھا کہ کمتر ہوتے ہیں، امانت داری

---

[1] SARKAR: FALL OF THE MUGHAL EMPIRE, VOL. II P. 416

(ماخوذ از سیاسی مکتوبات صفحہ ۲۳۲)

ایمانداری تو اس وقت میں اس پر ختم تھی وہ اپنے پرانے آقاؤں نواب دوندے خاں روہیلہ اور نواب شجاع الدولہ کی فرمانبرداری کئے جاتا تھا، ملہر راؤ ہلکر سے بھی اس کا ساز باز چلا جاتا تھا یا دھوکا یہ مرہٹہ پانی پت کی لڑائی سے اپنے ہم وطنوں کو چھوڑ کر بھاگ گیا تھا، غرض یہ جوانمرد اس ٹوٹی پھوٹی سلطنت کو نباہ رہا تھا۔[1]

شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں :۔

نزد نجیب الدولہ نہ صد عالم بود ادنیٰ پنج روپیہ اعلیٰ پنج صد روپیہ[2]

نجیب الدولہ کے یہاں نو سَو عالم تھے جن میں سے سب سے نیچے درجہ والے کو پانچ روپیہ اور اعلیٰ کو پانچ سَو روپیہ ملتے تھے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی کے بقول ۱۷۶۱ء سے ۱۷۷۰ء تک وہ دہلی کی سب سے بڑی شخصیت تھی تمام سیاست اس کے گرد گھومتی تھی اور وہ سارا انتظام حکومت اپنے کاندھوں پر سنبھالے ہوئے تھا۔[3]

شاہ صاحبؒ نے جن کو اللہ تعالےٰ نے مردم شناسی و حقیقت پسندی کا وہ ملکہ عطا فرمایا تھا جو ان لوگوں کو عطا ہوا کرتا ہے جو تاریخ اصلاح و تجدید اور کارِ آدم گری و مردم سازی میں کوئی بڑا کام کرتے ہیں، قحط الرجال کے اس عہد میں جو حوصلہ مندوں اور طالع آزماؤں سے بھرا ہوا تھا اپنے کام کی تکمیل و مدد لینے میں نجیب الدولہ کا انتخاب کیا اور ان کی دوربین و باریک بین نگاہ نے اس جوہر قابل اور اس کے اندر دینی حمیت کو دیکھ لیا،

---

[1] تاریخ ہندوستان جلد نہم ص ۳۱۵ [2] ملفوظات ص ۸۴ [3] سیاسی مکتوبات ص ۲۳۲

شاہ صاحب نے ان سے مراسلت شروع کی اور ان چنگاریوں کو فروزاں کرنے کی کوشش کی جو ان کی خاکستر میں دبی ہوئی تھیں، وہ ان کے نام اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

خدائے عزوجل آں امیر المجاہدین را بنصر ظاہر و تائید باہر مشرف کناد، و این عمل را بعز قبول رسانیدہ ثمرات عظیم و برکات جسیم برآں مرتب گرداناد۔	خدائے عزوجل امیر المجاہدین کو نصرت ظاہر اور تائید واضح کے ساتھ مشرف کرے اور اس عمل کو قبولیت کے درجہ میں پہونچا کر بڑی بڑی برکتیں اور رحمتیں اس پر مرتب کرے۔
از فقیر ولی اللہ عفی عنہ بعد سلام محبت شام واضح آنکہ دعائے نصر مسلمین کردہ می شود و از سروش غیبی نغمات قبول شنیدہ می شود امید انست کہ خدائے تعالیٰ بردستِ ایشاں احیاء طریقۂ جہاد فرمودہ برکات آں عاجلاً و آجلاً نصیب کند۔	فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد سلام محبت شام واضح ہو کہ نصرت مسلمین کے لئے یہاں دعا کی جارہی ہے اور سروش غیبی سے آثار قبول محسوس ہوتے ہیں امید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ہاتھ پر دینی جہد جہاد کو زندہ کر کے اس کے برکات اس دنیا اور آخرت میں عطا فرمائے گا۔
إنہ قریبٌ مجیبٌ[1]	إنہ قریب مجیب۔

ایک دوسرے خط میں ان کو "امیر الغزاۃ اور رئیس المجاہدین" کے لقب سے یاد فرماتے ہیں[2]

ایک اور مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

---

[1] سیاسی مکتوبات صـ۱۹ [2] ایضاً صـ۲۰

"معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں تائید ملت اسلامیہ اور امدادات مرحومہ کا کام
آپ ہی کے ذریعہ انجام پائے گا جو اس کار خیر کا سرچشمہ اور ذریعہ ہے آپ کسی طرح
کے وساوس و خیالات کو دل میں جگہ نہ دیں انشاء اللہ تمام کام دوستوں کی مرضی
اور خواہش کے مطابق انجام پائیں گے"[1]

شاہ صاحب نواب نجیب الدولہ کے نام خطوط میں دعا و تہنیت پر اکتفا نہیں کرتے ان کو بڑے مفید بنیادی مشورے بھی دیتے ہیں اور ان غلطیوں اور واقعات کے اعادہ سے محتاط و محترز رہنے کی تلقین بھی فرماتے ہیں جو اس سے پہلے حملہ آوروں اور مسلمان افواج سے ظہور پذیر ہوئے اور جو خدا کی نصرت و تائید سے مانع بن جاتے ہیں ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

"جب افواج شاہی کا گذر دہلی میں ہو تو اس وقت اس بات کا پورا انتظام و اہتمام
ہونا چاہئے کہ شہر سابق کی طرح ظلم سے پائمال نہ ہو جائے دہلی والے کئی مرتبہ لوٹ مار،
ہتک عزت اور بے آبروئی کا تماشہ دیکھ چکے ہیں اسی وجہ سے مطلب برآری اور مقاصد میں
تاخیر پیش آرہی ہے آخر میں مظلوموں کی آہ بھی اثر رکھتی ہے اگر اس بار آپ چاہتے ہیں کہ وہ کام
جو تشنۂ تکمیل تھے وہ مکمل ہو جائیں تو اس بات کی پوری تاکید و پابندی ہونی چاہئے کہ کوئی
فوجی دہلی کے مسلمانوں اور غیر مسلموں سے جو ذمی کی حیثیت رکھتے ہیں تعرض نہ کرے"[2]

شاہ صاحب متعدد خطوط میں ہندوستان کی ان تین انتشار پسند اور جنگجو طاقتوں کے خطرہ اور ملک کو ان کے گزند سے محفوظ کر دینے کی ضرورت کی طرف بار بار متوجہ فرماتے ہیں (جن کا ذکر اس باب کے آغاز میں موجود ہے) کہ اس کے بغیر ملک میں نظم و نسق، امن و امان، شعائر دینی و معابد کی حفاظت اور معتدل معمول کے مطابق (NORMAL) زندگی گزاری نہیں جا سکتی،

---

[1] سیاسی مکتوبات ص۳۵ [2] ایضاً ص۱۰۲

ان کی وجہ سے سارا ملک مستقل طور پر حالت جنگ اور عسکری نظام کی صورت میں زندگی گذار رہا ہے[1]

شاہ صاحبؒ کو نواب نجیب الدولہ سے ایسا تعلق خاطر معلوم ہوتا ہے اور وہ ان سے ایسی توقعات رکھتے ہیں کہ بار بار اس کی تاکید فرماتے ہیں کہ جب وہ اس مقصد کے لیے عنان عزیمت اٹھائیں تو شاہ صاحب کو اس کی ضرور اطلاع کریں تاکہ وہ دعا میں مشغول ہو جائیں۔ نیز ان کو بار بار فتح و کامیابی کی امید دلاتے ہیں اور اس کی پیشین گوئی فرماتے ہیں، لکھتے ہیں کہ:-

"فقیر کو اس بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے[2]"

شاہ صاحبؒ نے نواب نجیب الدولہ ہی کو احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان بلانے کے لئے خاص ذریعہ بنایا ان کے نام براہ راست خط لکھنے کے علاوہ جو آئندہ صفحات میں آ رہا ہے ان سے بھی خطوط لکھوائے اور ان کو بار بار تاکید کی، نواب نجیب الدولہ نے شاہ صاحبؒ کی وفات کے آٹھ سال بعد رجب ۱۱۸۳ھ (۳۱ اکتوبر ۱۷۷۰ء) کو انتقال کیا پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ:-

"اس کی عدل گستری و بالغ نظری کا یہ واقعہ ہمیشہ تاریخ میں یادگار رہے گا کہ وہ جس وقت بستر مرگ پر آخری سانس لے رہا تھا تو اس نے اپنے فوجوں کو (جو اس کے ساتھ ہاپڑ کے مقام پر تھیں اور گڈھ کا میلہ ہو رہا تھا) حکم دیا کہ گنگا کے میلہ میں آنے جانے والے ہندو یاتریوں کے جان و مال کی پوری حفاظت کی جائے[3]"

---

[1] ملاحظہ ہو مکتوب ششم و ہفتم سیاسی مکتوبات ص ۲۰-۲۱ [2] ملاحظہ ہو مکتوب ہشتم و نہم سیاسی مکتوبات ص ۲۵-۲۶ [3] مکتوب ہشتم ص ۲۷ و مکتوب نہم ص ۲۶

[4] سیاسی مکتوبات ص ۲۳۳ بحوالہ سرکار ج ۲ ص ۲۱۵

احمد شاہ ابدالی

شاہ صاحبؒ نے اپنی بالغ نظری، ہندوستان کی صورت حال کے حقیقت پسندانہ مطالعہ، ارکان سلطنت اور امراء و دربار کی بے کرداری اور حکمراں خاندان کی روز افزوں نااہلی سے دو حقیقتیں ایسی سمجھ لی تھیں جو روز روشن کی طرح صاف تھیں، ایک تو یہ کہ ملک کی پہلی ضرورت اس بے نظمی اور طوائف الملوکی کو دور کرنا ہے جس سے نہ اہل ملک کی جان و مال عزت و آبرو محفوظ ہے نہ کسی تعمیری کام اور بہتر نظم و نسق کی گنجائش ہے جیسا کہ گذشتہ صفحات میں گذر چکا ہے، اس افراتفری، بے یقینی اور سراسیمگی کی دائمی فضا کی ذمہ داری ان تین انتشار پسند اور جنگجو گروہوں پر تھی، جو نہ تو کسی ایسے ملک میں حکومت کا تجربہ رکھتے تھے جس میں مختلف مذاہب، قومیں و تہذیبیں صدیوں سے پائی جاتی تھیں، اور جس کے انتظام کی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے اعلیٰ درجہ کا احساسِ ذمہ داری، قوت ضبط و تحمل، وسیع النظری اور فراخ دلی ضروری تھی، نہ ان کے پاس ملک کو اعتدال و سکون عطا کرنے، اہل ملک کا اعتبار بحال کرنے اور نظم و نسق کو بہتر بنانے کے لئے کوئی منصوبہ تھا نہ کوئی تخیل، اس لئے پہلا کام یہ تھا کہ ان تینوں طاقتوں بالخصوص مرہٹوں کے غلبہ کے خطرہ سے ملک کو محفوظ کر دیا جائے جس سے ہندوستان کے اس مرکزی حصہ کو جو حکومتوں کا مستقر رہا ہے، یعنی لاہور سے دہلی اور صوبجات متحدہ تک کے علاقہ کو کسی وقت اطمینان نہیں تھا کہ کس وقت میدان جنگ میں تبدیل اور گلزار و پر رونق شہر ایک آزاد شکارگاہ میں مبتدل ہو جائیں گے جہاں شکاریوں کو پُرامن شہریوں کو چڑیوں اور جانوروں کی طرح مارنے کی اجازت ہوگی اور ان کا پشتوں اور نسلوں کا اندوختہ دیکھتے دیکھتے تاراج ہو جائیگا، اس سے دوسرے درجہ پر وہ خطرہ تھا جو سکھوں اور جاٹوں کی شکل میں تہذیب و تمدن

اور دولت و ثروت کے ان مرکزوں کو بلائے ناگہانی کی طرح پیش آتا رہتا تھا۔

دوسری حقیقت یہ تھی کہ اس خطرہ کو دور کرنے کے لئے کسی ایسے تجربہ کار عسکری قائد اور منظم سپاہ کی ضرورت ہے جو نئی جنگی طاقت سے معمور تو ہو لیکن مخمور نہ ہو اس کے اندر سپہ گری کے جوہر اور شجاعت و بہادری کے ماسوا۔ ایمانی غیرت و دینی حمیت بھی ہو نیز وہ ان ذیلی و ضمنی اختلافات رقابتوں اور پرانے کینوں اور دشمنیوں سے محفوظ ہو جو دہلی کے ایوان سلطنت اور ملک کے اہل سیاست کو گھن کی طرح کھا رہی تھیں اور جن کی موجودگی میں کسی ایسے بلند تر مقصد کی تکمیل کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی جس میں بجائے کسی نسلی عنصر، مذہبی گروہ یا ذاتی فتح مندی کے حصول کے ملت کا فائدہ، اسلام کی تقویت اور ملک کی حفاظت مقصود و پیش نظر ہو شاہ صاحب کی نظر میں ایک ذریعہ اور واسطہ کی حیثیت سے تو امیر الامراء نواب نجیب الدولہ کی (جیسا کہ اوپر گذرا) ضرورت و افادیت تھی لیکن وہ حالات کی سنگینی کے پیش نظر تنہا کافی نہیں تھے اور انکے ذریعہ ان طاقتوں کا زور نہیں توڑا جا سکتا تھا جنھوں نے اپنی فوجی طاقت اتنی بڑھا لی تھی کہ ملک کی کوئی واحد فوجی طاقت ان کو شکست نہیں دے سکتی تھی اس کے لئے ایک تازہ دم بیرونی فوجی قائد کی ضرورت تھی جو اس ملک کے لئے مطلقاً اجنبی اور نووارد نہ ہو، وہ اس ملک کے نشیب و فراز، باشندگان ملک کی راہ و رسم اور یہاں کے حریف اور نبرد آزما گروہوں کے مزاج اور کمزوریوں سے بھی واقف ہو اور جو اس کا حوصلہ اور ظرف بھی رکھتا ہو کہ اس ملک کو ان فوری خطروں سے محفوظ کر کے عنان حکومت یہیں کے قدیم حکمراں خاندان کے کسی اہل اور با صلاحیت فرد، وفادار و صاحب کردار امیر یا وزیر کے حوالہ کر کے واپس چلا جائے کہ یہی حقیقت پسندی، ملی مفاد اور حب الوطنی کا تقاضا ہے۔

اس نازک اور دشوار کام کے لئے (جس میں ہر نازک و دشوار کام کی طرح حضرت

ومنفعت کے پہلو ہوا کرتے ہیں) شاہ صاحب کی نظر انتخاب احمد شاہ دُرّانی (۱۱۳۵ھ/۱۷۲۲ء تا ۱۱۸۶ھ/۱۷۷۲ء) والیٔ قندھار پر پڑی، جو ہندوستان کے لئے اجنبی اور نووارد نہیں تھا، وہ ملتان میں پیدا ہوا[1]، یہاں اب تک ایک سڑک ابدالی روڈ کہلاتی ہے، اس نے مختلف حالات و مقاصد کے تحت ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء تک ہندوستان پر نو حملے کئے، شاہ صاحب اور نواب نجیب الدولہ کی دعوت اور پانی پت کے معرکہ سے پہلے وہ چھ مرتبہ ہندوستان آچکا تھا، وہ ملک کے نشیب و فراز، طریقۂ جنگ، فوجی طاقتوں کے تناسب اور امراء و ارکین سلطنت کے رجحانات سے واقف تھا، وہ اٹھارویں صدی عیسوی اور بارہویں صدی ہجری کے وسط کے ان ممتاز ترین فوجی قائدین میں تھا جو عرصۂ دراز کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور مستقل حکومتوں کی بنیاد رکھتے ہیں، اس نے بڑی خوبی و کامیابی کے ساتھ منتشر افغانوں کی شیرازہ بندی کی، منصفانہ قوانین جاری کئے، محکمۂ احتساب قائم کیا، وہ سپہ گری، مکارم اخلاق اور شرافت نفس کی صفات کا جامع تھا، علم و ادب کا ذوق رکھتا تھا، وقار و رعب کے ساتھ اپنی قوم میں محبوب و مانوس بھی تھا، دیندار، پابند مذہب اور علماء اور صلحاء کی مجالست کا خواہش مند، سادات و مشائخ کا ادب کرنے والا، اپنے مذہبی معلومات میں اضافہ اور علمی تبادلۂ خیال کا شائق، رحم دل و فیاض، مساوات اور مذہبی رواداری پر عامل تھا، اس نے بعض ایسی سنتوں کا احیا کیا جن کا افغانی ماحول میں نام لینا بھی مشکل تھا، مثلاً بیوگان کا نکاح ثانی، وہ خود بھی تعلیم یافتہ اور اہل قلم تھا، اپنی روحانی ترقی کا متمنی رہتا تھا[2]، فریزر نے لکھا ہے کہ:-

---

[1] مقالہ (C. COLLIN DAVIES) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام

[2] احمد شاہ ابدالی کے حالات میں ملاحظہ ہو ڈاکٹر گنڈا سنگھ کی کتاب AHMAD SHAH DURRANI – FATHER OF MODERN AFGHANISTAN, ASIA PUBLISHING HOUSE, 1949

"مشرقی ممالک کی بہت سی خرابیوں سے احمد شاہ مبرا تھا، شراب نوشی، افیون وغیرہ سے اجتناب کلی کرتا تھا، لالچ اور منافقانہ حرکتوں سے پاک تھا، مذہب کا سخت پابند تھا، اس کی سادہ لیکن باوقار عادتیں اس کو ہر دلعزیز بنا دیتی تھیں اس تک پہونچنا آسان تھا، وہ انصاف کا خاص خیال رکھتا تھا، کبھی کسی نے اس کے فیصلہ کی شکایت نہیں کی"[1]

احمد شاہ درانی شاہ صاحبؒ کے زمانہ میں چھ مرتبہ ہندوستان آکر اور مقامی اور وقتی ضرورتوں کو پورا کر کے واپس جا چکا تھا، ان حملوں میں اپنی فوجی طاقت کے مظاہرہ اور وقتی ضروریات کی تکمیل کے علاوہ اس نے کوئی اور مفید کام انجام نہیں دیا تھا، اس کی فوج نے ان اسلامی تعلیمات و آداب کی پابندی بھی نہیں کی تھی جن کی ایک پابند شریعت مسلمان سے توقع کی جاتی ہے، اس کے بعض حملوں سے شاہ صاحبؒ اور ان کے متعلقین کو بھی پریشانی و مصائب برداشت کرنے پڑے تھے، لیکن ان کمزوریوں اور تلخ تجربات کے باوجود وہی ایک ستارۂ امید تھا جو اس تاریک افق پر نظر آتا تھا، مولانا محمد عاشق صاحب پھلتی کا بیان ہے کہ اس سب کے بعد بھی شاہ صاحبؒ یہی فرماتے تھے "وے را دریں دیار غلبہ شدنی است" (اس کا اس علاقہ پر غلبہ ہوگا) ایک مرتبہ بہادر خاں بلوچ کے سوال کے جواب میں فرمایا "دریں ملک غلبہ کلّی وے خواہد شد" (اس ملک پر اس کا پورا غلبہ ہوگا) ایک مرتبہ اس کی موت کی افواہ گرم ہوئی شیخ محمد عاشق کے دریافت کرنے پر فرمایا:-

ایں معلوم شدہ نیست کہ احمد شاہ	جو معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ احمد شاہ
درانی باز دریں ملک می آید و ایں	درانی اس ملک میں پھر آئیگا اور

---

[1] ماخوذ از سیاسی مکتوبات ص ۲۲۵-۲۲۶ HISTORY OF THE AFGHANS

کفار را بر اندازد و ویرا باوجود این	ان کفار کو زیر و زبر کرے گا باوجود
اوزار ظلم برائے ہمیں کار گذاشتہ	مظالم کے جو وہ کر رہا ہے اس کو
اند[1]	اسی لئے اب تک اللہ نے باقی رکھا
	ہے وہ یہی کام ہے۔

شاہ صاحبؒ کو امید تھی کہ اللہ تعالیٰ شاہ ابدالی کے حالات کی اصلاح فرمائیگا اور اس سے وہ کام لے گا جو بظاہر اسباب، کسی دوسرے امیر یا قائد کے بس کا نہیں ہے۔ حکیم ابوالوفاء کشمیری سے ایک مرتبہ فرمایا کہ ابدالی کو حصول مقصد میں جو دشواریاں پیش آرہی ہیں وہ اس وبال ظلم کی بنا پر ہیں جو اس نے (اپنے پہلے حملوں میں) ہندوستان کے شہروں پر کئے ہیں بعد کو اس کے حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔[2]

شاہ صاحبؒ احمد شاہ ابدالی سے ملک کو اس غیر یقینی صورت حال اور افراتفری سے محفوظ کر دینے اور سلطنت کو شاہی خاندان کے کسی نسبتاً لائق تر آدمی کے حوالہ کر دینے کا کام لینا چاہتے تھے، شاہ صاحبؒ نے اس کی آمد سے پہلے پیشین گوئی کی تھی اور فرمایا تھا کہ ابدالی یہاں ٹھہرے گا نہیں بلکہ اولاد ملوک میں سے کسی کے حوالہ کر کے چلا جائیگا۔[3]

بالآخر شاہ صاحبؒ نے احمد شاہ ابدالی کو نجیب الدولہ سے خطوط لکھوائے پھر براہ راست ایک پُرزور و پُراثر خط لکھا جو شاہ صاحب کی سیاسی بصیرت، دینی حمیت، اخلاقی جرأت اور زور انشاء کا آئینہ دار ہے[4]، اس خط میں ہندوستان کی موجودہ صورت حال، اس کا قدیم طرز حکومت اس کے مختلف صوبوں کا نظم و نسق، ملک کی مختلف نسلی و مذہبی گروہوں

---

[1] ماخوذ از سیاسی مکتوبات ص ۲۶-۲۷ [2] ایضاً ص ۳۰ [3] ایضاً

[4] پورا خط ملاحظہ ہو مکتوب دوم بعض سلاطین کے عنوان سے شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات ص ۱۰۶-۱۱۷

کی تعداد و طاقت کا تناسب ان کے بارے میں مسلمان بادشاہوں کی سیاسی غلطیوں اور کوتاہ نظری، ان کا تدریجی طور پر طاقت پکڑ لینا اور اقتدار حاصل کرنا اس سلسلہ میں مرہٹہ اور جاٹ کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اور ان کے اقتدار، بار بار کے حملوں سے غربتِ اسلام اور مسلمانوں کی مظلومیت کا دلدوز نقشہ کھینچا گیا ہے، اور اس باحمیت مسلمان قائد کو جو اس وقت ہندوستان سے لے کر ایران تک سب سے بڑی منظم فوجی طاقت کا مالک تھا، اس صورت حال کا مقابلہ کرنے اور سلطنت مغلیہ کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے اور ملک کی ذمہ داری سنبھالنے کا موقع دینے پر آمادہ کیا گیا ہے، اور صفائی کے ساتھ لکھا گیا ہے:۔

دریں زمانہ پادشاہ صاحب اقتدار و شوکت باشد و قادر بشکست لشکر کفار و دور اندیش جنگ آزمائی غیر آں ملازمان آنحضرت موجود نیست۔[1]	اس زمانہ میں ایسا بادشاہ جو صاحب اقتدار اور شوکت ہو اور لشکر مخالفین کو شکست دے سکتا ہو دور اندیش و جنگ آزما ہو سوائے آنجناب کے کوئی اور موجود نہیں ہے۔

آگے لکھتے ہیں:۔

ما بندگان الٰہی رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم شفیع می آریم، و بنام خدائے عز و جل سوال می نمائیم کہ ہمت باہمت را، بجانب جہاد کفار۔	ہم بندگان الٰہی حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو شفیع بناتے ہیں اور خدائے عز و جل کے نام پر التماس کرتے ہیں کہ ہمت مبارک کو

---

[1] سیاسی مکتوبات صـ۱۲۱

این نواحی مصروف فرمائید تا در پیش
خدائے عزوجل ثواب جمیل در نامہ
اعمال آنحضرت ثبت شود و در دیوان
مجاہدین فی (سبیل) اللہ نام نامی
نوشتہ شود، و در دنیا غنائم بے حساب
بدست غازیانِ اسلام افتد و
مسلمانان از دست کفار نجات یابند۔[1]

اس جانب متوجہ فرما کر مخالفین سے
مقابلہ کریں تاکہ خدائے تعالیٰ کے
یہاں بڑا ثواب جناب کے نامۂ اعمال
میں لکھا جائے اور مجاہدین فی سبیل اللہ
کی فہرست میں نام درج ہو جائے
دنیا میں بے حساب غنیمتیں ملیں اور
مسلمان دست کفار سے خلاصی
پا جائیں۔

اسی خط میں انھیں سیاسی بصیرت اور حالات سے گہری واقفیت کی بنا پر ہندوستان کی ان نوخیز طاقتوں کے بارے میں جن کی کسی مقابل منظم طاقت کے نہ ہونے کی وجہ سے شجاعت و طاقت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور ان کو ناقابل شکست سمجھا جاتا تھا، صحیح اندازہ پیش کیا ہے جو ایک تجربہ کار قائد اور سیاسی بصیرت ہی پیش کر سکتا ہے، مرہٹوں کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

"قوم مرہٹہ کا شکست دینا آسان کام ہے بشرطیکہ غازیان اسلام کمر ہمت باندھ لیں حقیقت یہ ہے قوم مرہٹہ خود قلیل ہے لیکن ایک گروہ کثیر ان کے ساتھ ملا ہوا ہے ایک گروہ میں سے ایک صف کو بھی اگر درہم برہم کر دیا جائے تو یہ قوم منتشر ہو جائیگی اور اصل قوم اسی شکست سے ضعیف ہو جائیگی، چونکہ یہ قوم قوی نہیں ہے اس لئے ان کا تمام تر سلیقہ ایسی کثیر فوج جمع کرنا ہے جو چیونٹیوں اور ٹڈیوں سے زیادہ ہو، دلاوری اور سامان حرب کی بہتات ان کے یہاں نہیں ہے۔"[2]

۱؎ سیاسی مکتوبات ص۱۲ ۲؎ ایضاً ص۸۶

شاہ صاحب کی ہدایت کے مطابق نجیب الدولہ نے احمد شاہ ابدالی کو جو خطوط لکھے پھر شاہ صاحب نے جو طویل و مؤثر خط براہ راست لکھا (جس کا کچھ اقتباس اوپر گذرا) وہ بے اثر نہیں رہا، احمد شاہ ابدالی نے ۱۱۷۳ھ (۱۷۵۹ء) میں مرہٹوں کا زور توڑنے اور نجیب الدولہ اور شجاع الدولہ کی مدد کرنے کے لئے (جنھوں نے اس موقع پر سیاسی شعور اور اسلامی اتحاد کا ثبوت دیا تھا) ہندوستان کا قصد کیا ایک سال ذیلی جنگوں اور جھڑپوں میں گذر گیا بالآخر ۱۱۷۴ھ (۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء) کو پانی پت کے میدان میں مرہٹوں اور افغانوں اور ہندوستانی اسلامی متحدہ محاذ کے درمیان وہ فیصلہ کن جنگ ہوئی جس نے ہندوستان کی تاریخ کا رخ بدل دیا، اور مرہٹوں کو ہندوستان کے نئے ابھرتے ہوئے سیاسی نقشہ سے باہر نکال دیا، اس جنگ کا مختصر حال اور نتیجہ مولوی ذکاء اللہ صاحب مؤلف "تاریخ ہندوستان" کے الفاظ میں لکھا جاتا ہے[1]:۔

"لڑائی میں بڑا گھمسان ہو گیا مگر اب بھی مرہٹوں کا پلہ بھاری تھا، احمد شاہ نے اپنے بھگوڑے سپاہیوں کو گھیر کر قتل کرنے کا حکم سنایا اور یہ کہدیا جو بھاگے گا مارا جائے گا، بعد اس کے اس نے اپنی صف کو آگے بڑھنے کا حکم دیا، ایک سپاہ کو اپنے بائیں طرف دشمن کے بازو پر حملہ کا حکم دیا، اس تدبیر کا تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھا، قلب سپاہ میں بھاؤ بسواس راؤ گھوڑوں پر سوار لشکر کو لڑا رہے تھے، خنجر اور کھانڈے بازی ہو رہی تھی کہ یکایک خدا معلوم کیا ہوا کہ مرہٹوں کے لشکر کا قدم میدان جنگ سے اکھڑ گیا، قدم کا اٹھنا تھا کہ میدان جنگ کا ان کے مُردوں سے بھر جانا تھا، لشکر اسلامیہ نے ان کا تعاقب بڑے جوش و خروش سے ہر جانب میں پندرہ۱۵، پندرہ۱۵، بیس۲۰ بیس۲۰ میل تک کیا،

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ ہندوستان جلد نہم ص ۳۰۵-۳۰۹

اور مرہٹوں کو مار کر ڈھیر لگا دیا، جو مرہٹے ان دشمنوں کے ہاتھ سے بچ گئے، ان کو گنواروں نے مار ڈالا۔ بسواس راؤ اور بھاؤ مارے گئے، جن کو جی سیندھیا کو کسی درانی نے چھپا رکھا تھا، وہ بھی تلاش کرنے سے پکڑا گیا اور مارا گیا۔ ابراہیم خاں گاردی بھی قید ہوا، ایک ہفتہ کی مدت نے اس کے زخموں پر بھی مرہم رکھا شمشیر بہادر بھی بھاگتے ہوئے مارے گئے، مالوہ میں ملہار راؤ جان بچا کر نکل گیا، آپاجی سیندھیا بھی لنگڑا ہو کر وہاں جا پہونچا۔ ان دو سرداروں کے سوا کوئی اور نامور سردار نہیں بچا، مرہٹوں کو ایسی شکست کبھی نہیں ہوئی تھی نہ ایسی مصیبت پڑی تھی، اس سے ساری قوم کا دل پژمردہ و افسردہ ہو گیا، اس صدمہ سے بالاجی بھی تھوڑے دنوں کے بعد مر گیا جب سے شکست کی خبر سنی تھی ایک مندر میں بیٹھ کر سنسکرت پڑھانا اختیار کر لیا تھا۔[1]

بقول ایک مؤرخ کے مرہٹوں کی طاقت چشم زدن میں کافور کی طرح اڑ گئی، سرجدو ناتھ سرکار نے لکھا ہے کہ مہاراشٹر میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں صف ماتم نہ بچھ گئی ہو لیڈروں کی پوری نسل ایک ہی معرکہ میں غائب ہو گئی۔[2]

شاہ صاحب کے نقشہ کے مطابق احمد شاہ ابدالی نے وقت کا یہ ضروری کام انجام دے کر قندھار کی طرف عنان عزیمت موڑی، مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:۔

بعد اس فتح کے احمد شاہ پانی پت سے نواح دہلی میں آیا اور چند روز متوقف رہا۔ ہندوستان کا بادشاہ شاہزادہ عالی گوہر یعنی شاہ عالم کو مقرر کیا، اور بادشاہ سے شجاع الدولہ کے وزیر اور نجیب الدولہ کے امیر الامراء ہونے کی سفارش کی شاہ عالم اس وقت

---

[1] تاریخ ہندوستان جلد نہم ص ۳۹ [2] شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات ص ۴۵

دہلی میں نہ تھا اس لئے اس کے بیٹے جواں بخت کو بادشاہ کا نائب دہلی میں مقرر کیا اور نجیب الدولہ کو دہلی کا منتظم مقرر کیا اور شجاع الدولہ کو خلعت دے کر اودھ اور الہ آباد کے صوبوں پر بھیج دیا اور خود قندھار کو چلا گیا۔[1]

پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ:۔

"جنگ پانی پت کے بعد احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم کو دہلی بلانے کی بے حد کوشش کی اور اپنا آدمی بھیجا جب نہ آیا تو احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم کی والدہ نواب زینت محل سے خط لکھوایا احمد شاہ نے شاہ عالم کو بلانے کی کوشش اس لئے کی تھی کہ وہ انگریزوں کے اثر سے نکل آئے اور دہلی آکر احمد شاہ کی موجودگی میں اپنی طاقت کا استحکام کرے۔"[2]

خلیق صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں کسی کی تحریک میں اتنی وسعت اور ہمہ گیری نہ تھی کہ وہ ہندوستان کی مرکزیت و وحدت کو برقرار رکھ سکنے کی تدبیر سوچتی۔ شاہ صاحب اپنے مجوزہ نظام میں اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب کے زمانہ کی مرکزیت اور سلطنت ہند کے اقتدار اعلیٰ کو بحال دیکھنا چاہتے تھے لیکن اس طرح سے کہ مطلق العنان بادشاہوں کے بجائے انصاف کی حکومت ہو۔"[3]

اگر سلطنت میں تھوڑی سی بھی جان ہوتی تو وہ جنگ پانی پت کے نتائج سے فائدہ اٹھا کر اپنے اقتدار کو ہندوستان میں پھر کچھ صدیوں کے لئے قائم کر سکتی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت اس وقت بے روح جسم کی مانند تھی جنگ پانی پت کا اصلی فائدہ فاتحین جنگ پلاسی نے اٹھایا۔[4]

---

[1] تاریخ ہندوستان ج۹ ص۳۰۹-۳۱۰ [2] سیاسی مکتوبات ص۲۵-۲۶ [3] ایضاً ص۲۷ [4] ایضاً ص۲۵

شاہ عالم نے اپنی پست ہمتی اور کوتاہ نظری سے یہ زریں موقع کھو دیا اور ساری کوششوں اور خود اپنی والدہ زینت محل کے مشفقانہ خط کے باوجود پورے دس برس کے بعد ۱۷۷۱ء کے آخر میں ۲۵ دسمبر ۱۷۷۱ء کو قلعہ میں داخل ہوا اس کے بعد اس کے اور اس کے جانشینوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا وہ تاریخ میں تفصیل کے ساتھ درج ہے اس کا نقطۂ عروج (CLIMAX) ۱۸۵۷ء کا انقلاب سلطنت بلکہ انتزاع سلطنت ہے (اگرچہ سلطنت برائے نام تھی) جو انگریزوں کے ہاتھ پیش آیا، جنھوں نے اپنی دانشمندی اور سیاسی ذہانت سے ہندوستان پر تسلط کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

شاہ صاحب کے بعد ان کے صحیح جانشین اور علم و بصیرت اور غیرت و حمیت دینی کے وارث ان کے فرزند ارجمند سراج الہند حضرت شاہ عبد العزیزؒ نے اپنے والد نامدار کے شروع کئے ہوئے کام کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ اس کی توسیع و تکمیل کی کوشش کی اور سیاسی حالات کی تبدیلی کے ساتھ اپنی توجہ اس وقت کے سیاسی میدان کے اصل حریف اور حقیقی طاقت (انگریزی اقتدار) کی طرف موڑ دی جس نے اب "خطرہ" سے بڑھ کر (جس کے دیکھنے کے لئے سیاسی بصیرت درکار ہوتی ہے) "واقعہ" کی شکل اختیار کر لی تھی جس کے دیکھنے کے لئے بصارت بھی کافی ہوتی ہے[1]۔

شاہ عبد العزیزؒ کے بعد انھیں کے دانش گاہ کے دو تربیت یافتہ صاحب عزیمت داعی و مصلح حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ نے حضرت شاہ صاحبؒ کے سیاسی نقشہ میں (جو انھوں نے نظری طور پر "حجۃ اللہ البالغہ" اور "ازالۃ الخفاء" کے صفحات اور تفہیمات میں پیش کیا تھا) رنگ بھرنے کی کوشش کی اور اس کو خلافت علی منہاج النبوۃ کی اساس پر قائم کرنے کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دی، انھوں نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی

---

[1] اس اجمال کی تفصیل باب یازدہم میں حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے سلسلہ میں آئیگی۔

تعلیمات اور ان کی دی ہوئی روشنی سے کتنا فائدہ اٹھایا ان کے عزائم کتنے بلند ان کی نگاہ کتنی دور بین ان کا قلب کتنا وسیع اور فراخ تھا، وہ پنجاب کے مسلمانوں کو سکھوں کی فوجی حکومت کے استیصال و استحصال کی اسی طرح کی فوری مصیبت سے بچانے کے بعد (جس طرح شاہ ولی اللہ صاحب نے مرہٹوں اور جاٹوں کے روزمرہ کے قتل و غارت گری سے اپنے وقت کے ماحول و معاشرہ کو بچانے کی کوشش کی تھی) اور انگریزوں کو جن کو وہ "بیگانگان بعید الوطن و تاجران متاع فروش" کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں، نکالنے کے بعد ہندوستان کو وہ کس طرح آزاد کرانا اور اسلام کے عدل و مساوات کے اصول پر اس کا نظم و نسق قائم کرنا چاہتے تھے، اس کا اندازہ ان کے مکاتیب سے ہوگا جو انھوں نے سلاطین وقت، امراء نامدار، صاحب حمیت مسلمانوں اور ہوشمند والیان ریاست کو لکھے ہیں[1]۔

اس طرح اس سلسلے کے اہل دعوت و عزیمت کو یہ کہنے کا حق ہے کہ ؎

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہید" جلد اول کا دسواں باب "جہاد اور اس کے مقاصد و اسباب" ص ۳۸۵-۳۹۴

بابِ دہم

امت کے مختلف طبقات کا احتساب

اور

ان کو دعوتِ اصلاح و انقلاب

شاہ صاحب کا امتیاز

عام طور پر جن علمائے کبار کا ذوق علمی، تصنیفی اور تحقیقی ہوتا ہے، اور ان کو ذکاوت، باریک بینی اور دقیقہ رسی سے حصۂ وافر عطا ہوتا ہے، وہ عام طور پر مطالعۂ کتب، علمی مباحث پر تحقیق و تدقیق یا تدریس و تصنیف کے شغل میں ہمہ تن منہمک و مستغرق رہتے ہیں، اور معاشرہ کے مختلف طبقات اور عامۃ المسلمین کی کمزوریوں اور بیماریوں سے یا تو بے خبر ہوتے ہیں، یا ان کے لئے اس عوامی سطح تک اترنا اور اس علمی نظری بلندی سے (جس میں دنیا کی ہر لذت و حلاوت سے بڑھ کر لذت و حلاوت ہوتی ہے) "نزول" دشوار ہوتا ہے۔

علمائے سلف میں اس بارے میں دو شخصیتوں کا واضح طریقہ پر استثنا کیا جا سکتا ہے، ایک حجۃ الاسلام امام غزالیؒ (متوفی ۵۰۵ھ) کا، جنھوں نے اپنی شہرۂ آفاق و زندۂ جاوید کتاب احیاء علوم الدین میں اپنے زمانہ کے مسلم معاشرہ اور ملت اسلامیہ کے مختلف طبقات کی بیماریوں اور کمزوریوں کی اس طرح نشاندہی کی ہے کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ

اپنے زمانہ کی عوامی زندگی اور معاشرہ کے مختلف طبقات سے علماء کے حلقہائے درس اور مشائخ کی مجالس ذکر وفکر سے لے کر خلفاء وسلاطین کے درباروں، امراء کے ایوانوں اور رؤسا کے عشرت خانوں تک، اوران محل سراؤں سے لے کر اہل حرفہ وتاجروں کی دوکانوں اور بازاروں کے پرشور ہنگامہ خیز ماحول تک سے واقف ہیں، اور جانتے ہیں کہ نفس وشیطان نے کس کس طرح سے علماء ورؤسا کے مختلف طبقوں اور عوام وخواص کے مختلف حلقوں کو فریب دے رکھا ہے، دینی مفاہیم وحقائق کس طرح تبدیل ہوگئے ہیں، اور وہ مقصد اصلی (سعادتِ اخروی اور رضائے الٰہی) سے کس طرح غافل ہیں[1]۔

یہی حال (اجمال وتفصیل اور طرز واسلوب کے فرق کے ساتھ) علامہ ابن جوزی (متوفی ۵۹۷ھ) کا اپنی مشہور تصنیف تلبیس ابلیس میں ہے، اس کتاب میں انھوں نے اپنے زمانہ کی پوری مسلمان سوسائٹی کا جائزہ لیا ہے، اور مسلمانوں کے ہر طبقہ اور جماعت کو سنت وشریعت کے معیار سے جانچا ہے، اور اس کی کمزوریوں بے اعتدالیوں اور غلطیوں کی نشاندہی کی ہے، اور اس بارے میں کسی طبقہ کی رعایت نہیں کی، علماء ومحدثین فقہاء وواعظین، ادباء وشعراء، سلاطین وحکام، عباد وزہاد، صوفیائے اہل دین اور عوام سب کا بے لاگ احتساب کیا، اوران کے مغالطوں کا پردہ چاک کیا ہے[2]۔

لیکن (جہاں تک تلبیس ابلیس کا تعلق ہے) یہ تنقید واحتساب زیادہ تر "سلبی" اور منفی انداز کا ہے، اس کے ساتھ اصلاح حال کی مفصل وپرزور "مثبت" دعوت نہیں ہے، یا اگر ہے تو مقدار وتاثیر میں اس کے درجہ کی نہیں ہے، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے

---

[1] تفصیل اور نشانوں کے لئے ملاحظہ ہو احیاء علوم الدین ج ۲۔۳ یا تاریخ دعوت وعزیمت ج ۱ ص ۱۴۶ تا ۱۶۶

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تلبیس ابلیس از ص ۱۱۹ تا ۳۹۴ یا تاریخ دعوت وعزیمت ج ۱ ص ۲۲۴ تا ۲۳۹

موضوع کے دائرہ میں اس سے زیادہ گنجائش نہیں تھی۔

مختلف طبقاتِ امت سے خصوصی خطاب

ان دو شہرۂ آفاق علماء و داعیانِ دین و معلّمینِ اخلاق کے بعد (جو اپنے اصلاحی و تربیتی مقام کے ساتھ عظیم المرتبت عالم و مصنف بھی تھے) ہمیں (اپنے محدود مطالعہ میں) اس سلسلہ میں شاہ ولی اللہ صاحب کا کارنامہ سب سے زیادہ روشن اور تابناک نظر آتا ہے، انھوں نے سلاطینِ اسلام، امراء و ارکانِ دولت، فوجی سپاہیوں، اہلِ صنعت و حرفت، مشائخ کی اولاد (پیرزادوں) غلط کار علماء، متقشّف اور خردہ گیر واعظوں اور تارک الدنیا و عزلت گزیں زاہدوں کو علیحدہ علیحدہ خطاب کیا ہے، ان کی دکھتی ہوئی رگوں پر انگلی رکھی ہے، اور ان کی اصلی بیماریوں اور خود فریبیوں کی نشاندہی کی ہے، ان سب کے علاوہ امتِ اسلامیہ سے عمومی اور جامع خطاب فرمایا ہے، اور ان کے امراض کی تشخیص کی ہے، اور ان کا علاج بتایا ہے، ان خصوصی خطابات میں شاہ صاحب کے دل کا درد، اسلامی حمیت کا جوش، دعوت کا جذبہ اور زورِ قلم اس نقطۂ عروج پر ہے، جس کی مثال سابق الذکر مصلحین و ناقدین اور ان کی مذکورہ بالا کتابوں میں ملنی مشکل ہے، شاہ صاحب کی مشہور کتاب "التفہیمات الالٰہیہ"[1] (جلد ۱-۲) سے یہاں پر مختلف اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں، جن میں آپ نے اپنے زمانہ کے مختلف ممتاز اور صاحبِ اثر طبقوں کے سربراہوں سے خطاب کیا ہے[2]، ان خصوصی خطابات سے شاہ صاحب کی ژرف نگاہی،

---

[1] یہ کتاب المجلس العلمی ڈابھیل سورت کی طرف سے ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۳۶ء میں مدینہ پریس بجنور سے دو جلدوں میں شائع ہوئی۔

[2] شاہ صاحب کی اصل عبارت عربی میں ہے، اس کا ترجمہ خود پیش کرنے کے بجائے ہم نے فاضل گرامی (باقی ص ۳۲۶ پر)

حکمت دعوت، اخلاقی جرأت اور واقفیتِ عامّہ وخاصّہ کا ایسا اظہار ہوتا ہے، جس کو دیکھ کر تاریخ کا ایک ایسا طالب علم جو اس عہد و معاشرہ کی زبوں حالی، اہل علم واہل قلم کی مصلحت اندیشی اور داعیوں و مصلحوں کی اصلاح حال سے مایوسی کی کیفیت سے واقف ہے انگشت بدنداں رہ جاتا ہے، اور بے اختیار کہہ اٹھتا ہے۔ ع

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی؟

سلاطین اسلام سے خطاب

"اے بادشاہو! ملأ اعلیٰ کی مرضی اس زمانہ میں اس امر پر مستقر ہو چکی ہے کہ تم تلواریں کھینچ لو اور اس وقت تک نیام میں داخل نہ کرو جب تک کہ شرک سے بالکلیہ جدا نہ ہو جائے، اور اہل کفر وفسق کے سرکش لیڈر کمزوروں کے گروہ میں جا کر شامل نہ ہو جائیں، اور یہ کہ ان کے قابو میں پھر کوئی ایسی بات نہ رہ جائے جس کی بدولت وہ آئندہ سر اٹھا سکیں "وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ" (یعنی ان سے جنگ کرتے رہو تا آنکہ فتنہ فرو ہو جائے، اور "دین" صرف اللہ کے لئے مخصوص ہو جائے) پھر جب کفر واسلام کے درمیان ایسا کھلا نمایاں امتیاز پیدا ہو جائے تب تمہیں چاہئے کہ ہر تین دن

(باقی ص۳۲۵ کا) مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کے اس مضمون کے اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا کی ہے جو الفرقان کے شاہ ولی اللہ نمبر کے لئے "آغوشِ موج کا ایک درِّ تابندہ" کے عنوان سے لکھا تھا، اس مضمون میں تفہیمات کے ان ٹکڑوں کو اردو میں ترجمہ کر کے پیش کیا ہے، اور ان پر مختلف عنوانات لگا دیئے ہیں اس طرح شاہ صاحبؒ کے مبارک تذکرے کے ساتھ ایک مخلص و متبحر عالم کی یاد بھی تازہ اور زندہ رہے گی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

یا چار۴ دن کے سفر کی منزلوں پر اپنا ایک ایک حاکم مقرر کرو، ایسا حاکم جو عدل و انصاف کا مجسمہ ہو، قوی ہو، جو ظالم سے مظلوم کا حق وصول کر سکتا ہو، اور خدا کے حدود کو قائم کر سکتا ہو، اور اس میں سرگرم ہو کر پھر لوگوں میں بغاوت و سرکشی کے جذبات پیدا نہ ہوں، نہ وہ جنگ پر آمادہ ہوں، اور نہ دین سے مرتد ہونے کی کسی میں جرأت باقی رہے، نہ کسی گناہ کبیرہ کے ارتکاب کی کسی کو مجال ہو، اسلام کا کھلے بندوں اعلان ہو، اور اس کے شعائر کا علانیہ اظہار کیا جائے، ہر شخص اپنے متعلقہ فرائض کو صحیح طور پر ادا کرے، چاہئے کہ ہر شہر کا حاکم اپنے پاس اتنی قوت رکھے جس کے ذریعہ سے اپنی متعلقہ آبادی کی اصلاح کر سکتا ہو۔

مگر اسی کے ساتھ اس کو اتنی قوت فراہم کرنے کا موقع نہ دیا جائے جس کے بل بوتے پر وہ خود ان سے نفع گیر ہونے کی تدبیریں سوچنے لگے، اور حکومت کے مقابلہ پر آمادہ ہو جائے۔

چاہئے کہ اپنے متعلقہ مقبوضات کے بڑے علاقہ اور اقلیم پر ایسے امیر مقرر کئے جائیں جو جنگی مہمات کا بھی اختیار رکھتے ہوں، ایسے امیر کے ساتھ بارہ ہزار کی جمعیت رکھی جائے، مگر جمعیت ایسے آدمیوں سے بھرتی ہو، جن کے دل میں جہاد کا ولولہ ہو، اور خدا کی راہ میں کسی کی ملامت سے خوفزدہ نہ ہوں، ہر سرکش اور متمرد سے جنگ اور مقابلہ کی ان میں صلاحیت ہو ——— اے بادشاہو! جب تم یہ کرلوگے تو اس کے بعد ملأ اعلیٰ کی رضامندی یہ چاہے گی کہ تم لوگوں کی منزلی اور عائلی زندگی کی طرف توجہ کرو، ان کے باہمی معاملات کو سلجھاؤ، اور ایسا کردو کہ پھر کوئی معاملہ ایسا نہ ہونے پائے، جو شرعی قوانین کے مطابق نہ ہو، اسی کے بعد

لوگ امن وامان کی صحیح مسرت سے فائز المرام ہو سکتے ہیں۔[1]

امراء وارکان دولت سے خطاب

اے امیرو! دیکھو کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے، دنیا کی فانی لذتوں میں تم ڈوبے جاتے ہو اور جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہوئی ہے ان کو تم نے چھوڑ دیا ہے تاکہ ان میں بعض بعض کو کھاتے اور نگلتے رہیں، کیا تم علانیہ شرابیں نہیں پیتے؟ اور پھر اپنے اس فعل کو تم برا بھی نہیں سمجھتے، تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ بہت سے لوگوں نے اونچے اونچے محل اس لئے کھڑے کئے ہیں کہ ان میں زناکاری کی جائے اور شرابیں ڈھالی جائیں، جُوا کھیلا جائے لیکن تم اس میں دخل نہیں دیتے اور اس حال کو نہیں بدلتے، کیا حال ہے ان بڑے بڑے شہروں کا جن میں چھ سو سال سے کسی پر حد شرعی نہیں جاری ہوئی، جب کوئی کمزور مل جاتا ہے تو اسے پکڑ لیتے ہو اور جب قوی ہوتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو، تمہاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو اور نرم گداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے رہو، اچھے کپڑوں اور اونچے مکانات کے سوا تمہاری توجہ اور کسی طرف منعطف نہیں ہوتی، کیا تم نے اپنے سر کبھی اللہ کے سامنے جھکائے؟ خدا کا نام تمہارے پاس صرف اس لئے رہ گیا ہے کہ اپنے تذکروں اور قصے کہانیوں میں اس نام کو استعمال کرو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے لفظ سے تمہاری مراد زمانہ کا انقلاب ہے کیونکہ تم اکثر بولتے ہو خدا قادر ہے کہ ایسا کر دے یعنی زمانہ کے انقلاب کی یہ تعبیر ہے۔

---

[1] تفہیمات الٰہیہ جلد اول از ص ۲۱۵ تا ۲۱۶

فوجی سپاہیوں کو خطاب

"اے فوجیو! اور عسکریو! تمہیں خدا نے جہاد کے لئے پیدا فرمایا تھا مقصد یہ تھا کہ اللہ کی بات اونچی ہوگی، اور خدا کا کلمہ بلند ہوگا، اور شرک اور اس کی جڑوں کو تم دنیا سے نکال پھینکو گے، لیکن جس کام کے لئے تم پیدا کئے گئے تھے، اسے تم چھوڑ بیٹھے اب جو تم گھوڑے پالتے ہو، ہتھیار جمع کرتے ہو اس کا مقصد صرف یہ رہ گیا ہے کہ محض اس سے اپنی دولت میں اضافہ کرو، اس سلسلہ میں جہاد کی نیت سے تم بالکل خالی الذہن رہتے ہو — تم شرابیں پیتے ہو، بھانگ کے پیالے چڑھاتے ہو، ڈاڑھیاں منڈواتے ہو اور مونچھیں بڑھاتے ہو، عام لوگوں پر زیادتیاں اور ظلم کرتے ہو، حالانکہ جو کچھ ان کا لے کر کھاتے ہو اس کی قیمت ان تک نہیں پہونچتی — خدا کی قسم تم عنقریب اللہ کی طرف واپس جاؤ گے، پھر تمہیں وہ بتائے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے، تمہارے ساتھ خدا کی یہ مرضی ہے کہ اچھے پارسا صالحین غازیوں کا لباس اور ان کی وضع اختیار کرو، چاہیے کہ اپنی ڈاڑھیاں بڑھاؤ، مونچھیں کٹواؤ، پنج وقتہ نماز ادا کیا کرو اور عام لوگوں کے مال سے بچتے رہو، جنگ اور مقابلہ کے میدان میں ڈٹے رہو، تمہیں چاہیے کہ سفر اور جنگ وغیرہ کے موقع پر نماز میں جو آسانیاں اور رخصتیں رکھی گئی ہیں، انھیں سیکھ لو، مثلاً قصر کرنا، جمع کرنا، سنتوں کے ترک کرنے کی اجازت ہے، اس سے واقف ہونا، تیمم کی اجازت سے مطلع ہونا، پھر اس کے بعد نماز کو خوب زور سے پکڑ لو، اور اپنی نیتوں کو درست کر لو، اللہ تعالےٰ تمہارے جاہ و منصب میں برکت دے گا، اور دشمنوں پر تمہیں فتح عطا فرمائے گا"[1]

[1] تفہیمات ج ۱ صـ ۲۱۶

اہل صنعت وحرفت سے خطاب

"ارباب پیشہ! دیکھو! امانت کا جذبہ تم سے مفقود ہو گیا ہے تم اپنے رب کی عبادت سے بالکل خالی الذہن ہو چکے ہو، اور تم اپنے فرضی بنائے ہوئے معبودوں پر قربانیاں چڑھاتے ہو، تم مدار[1] اور سالار[2] کا حج کرتے ہو تم میں بعض لوگوں نے فال بازی اور ٹوٹکا اور گنڈے وغیرہ کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے؛ یہی ان کی دولت ہے اور یہی ان کا ہنر ہے یہ لوگ خاص قسم کا لباس اور دستار اختیار کرتے ہیں؛ خاص طرح سے کھاتے کھاتے ہیں ان میں جن کی آمدنی کم ہوتی ہے، وہ اپنی عورتوں اور اپنے بچوں کے حقوق کی پروا نہیں کرتے، تم میں بعض صرف شراب خواری کو پیشہ بنائے ہوئے ہیں؛ اور تم ہی میں کچھ لوگ عورتوں کو کرایہ پر چلا کر پیٹ پلتے ہیں؛ یہ کیسا بدبخت آدمی ہے، اپنی دنیا اور آخرت دونوں کو برباد کر رہا ہے، حالانکہ حق تعالےٰ نے تمہارے لئے مختلف قسم کے پیشے اور کمانے کھانے کے دروازے کھول رکھے ہیں؛ جو تمہاری اور تمہارے متعلقین کی ضرورتوں کے لئے کافی ہو سکتے ہیں؛ بشرطیکہ تم اعتدال کی راہ اپنے خرچ میں اختیار کرو، اور محض اتنی روزی پر قناعت کرنے کے لئے آمادہ ہو جاؤ جو تمہیں بآسانی اخروی زندگی کے نتائج تک پہونچا دے، لیکن تم نے خدا کی ناشکری کی، اور غلط راہ حصول رزق کی اختیار کی، کیا تم جہنم کے عذاب سے نہیں ڈرتے جو بڑا ابرا ٹھکانا ہے۔

---

[1] شاہ بدیع الدین مدار مکنپوری مراد ہیں جو شاہ مدار کے نام سے مشہور ہیں۔ [2] سید سالار مسعود غازی دفین بہرائچ جن کے جھنڈے نکالے جاتے ہیں؛ اور لوگ دور دور سے آکر اُن کے عرس میں شریک ہوتے ہیں۔

دیکھو! اپنی صبح و شام کو تم خدا کی یاد میں بسر کیا کرو، اور دن کے بڑے حصہ کو

اپنے پیشہ میں صرف کرو اور رات کو اپنی عورتوں کے ساتھ گذارو اپنے خرچ کو اپنی

آمدنی سے ہمیشہ کم رکھا کرو، پھر جو بچ جایا کرے اس سے مسافروں کی، مسکینوں کی

مدد کیا کرو، اور کچھ اپنے اتفاقی مصائب اور ضرورتوں کے لئے پسماندہ بھی کیا کرو۔

تم نے اگر اس راہ کو اختیار نہ کیا تو تم غلط راہ پر چل رہے ہو، اور تمہاری تدبیر

درست نہیں ہے۔[1]

پھر اسی طرح مشائخ کی اولاد، اس زمانہ کے طلبۂ علم اور واعظوں زاہدوں کو بھی آپ نے خصوصیت کے ساتھ پکارا ہے، مثلاً مشائخ کی اولاد کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

مشائخ کی اولاد یعنی پیرزادوں سے خطاب

"اے وہ لوگو! جو اپنے آبا و اجداد کے رسوم کو بغیر کسی حق کے پکڑے ہوئے ہو یعنی

گذشتہ بزرگان دین کی اولاد میں ہو، میرا آپ سے سوال ہے کہ آپ کو کیا ہو گیا

ہے کہ ٹکڑیوں ٹکڑیوں، ٹولیوں ٹولیوں میں آپ بٹ گئے ہیں، ہر ایک اپنا اپنا

راگ اپنی اپنی منڈلی میں الاپ رہا ہے اور جس طریقہ کو اللہ نے اپنے رسول

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے نازل فرمایا تھا، اور محض اپنے

لطف و کرم سے جس راہ کی طرف راہنمائی فرمائی تھی اسے چھوڑ کر ہر ایک تم میں

ایک مستقل پیشوا بنا ہوا ہے، اور لوگوں کو اسی کی طرف بلا رہا ہے اپنی جگہ

اپنے کو راہ یافتہ اور راہ نما ٹھہرائے ہوئے ہے، حالانکہ دراصل وہ خود گم کردۂ راہ

---

[1] ایضاً صـ۲۱۷

اور دوسروں کو بھٹکانے والا ہے، ہم ایسے لوگوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے جو محض لوگوں کو اس لئے مرید کرتے ہیں تاکہ ان سے ٹکے وصول کریں، ایک علم شریف کو سیکھ کر دنیا بٹورتے ہیں، کیونکہ جب تک اہل دین کی شکل و شباہت اور طرز و انداز وہ نہ اختیار کریں گے، دنیا حاصل نہیں ہو سکتی۔

اور نہ میں ان لوگوں سے راضی ہوں جو سوائے اللہ و رسول کے خود اپنی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں، اور اپنی مرضی کی پابندی کا لوگوں کو حکم دیتے ہیں، یہ لوگ بٹ مار اور راہ گیر ہیں، ان کا شمار دجالوں کذابوں فتانوں اور ان لوگوں میں ہے جو خود فتنہ اور آزمائش کے شکار ہیں۔

خبردار! خبردار! ہرگز اس کی پیروی نہ کرنا، جو اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت کی طرف دعوت نہ دیتا ہو، اور اپنی طرف بلاتا ہو، اور چاہیئے کہ زبانی جمع خرچ صوفیائے کرام کے اشاروں کے متعلق عام مجلسوں میں نہ کیا جائے کیونکہ مقصد تو (تصوف) سے صرف یہ ہے کہ آدمی کو احسان کا مقام حاصل ہو جائے، لوگو، دیکھو! کیا تمہارے لئے اللہ تبارک و تعالےٰ کے اس ارشاد میں کوئی عبرت نہیں ہے۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا	یہ میری راہ ہے سیدھی تو اس پر چل پڑو
فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ	اور مختلف راہوں کے پیچھے نہ پڑو، وہ
بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ۔ (الانعام-۱۵۳)	تمہیں اللہ کی راہ سے بچھڑا دیں گے۔[۱]

پھر اس زمانہ کے طلبۂ علم کو خطاب کر کے فرماتے ہیں:۔

---

[۱] ایضاً صـ ۲۱۴

غلط کار علماء سے خطاب

"اے بدعقلو! جنھوں نے اپنا نام "علماء" رکھ چھوڑا ہے، تم یونانیوں کے علوم میں ڈوبے ہوئے ہو، اور صرف ونحو ومعانی میں غرق ہو، اور سمجھتے ہو کہ یہی علم ہے، یاد رکھو! علم یا تو قرآن کی کسی آیتِ محکم کا نام ہے، یا سنتِ ثابتہ قائمہ کا۔ چاہیے کہ قرآن سیکھو، پہلے اس کے غریب لغات کو حل کرو، پھر سببِ نزول کا پتہ چلاؤ، اور اس کے مشکلات کو حل کرو، اسی طرح جو حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صحیح ثابت ہو چکی ہے، اسے محفوظ کرو، یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نماز کس طرح پڑھتے تھے، وضو کرنے کا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا کیا طریقہ تھا، اپنی ضرورت کے لیے کس طرح جاتے تھے، اور حج کیونکر ادا فرماتے تھے، جہاد کا آپ کا کیا قاعدہ تھا، گفتگو کا کیا انداز تھا، اپنی زبان کی حفاظت کس طرح فرماتے تھے، حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے، چاہیے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی پوری روش کی پیروی کرو، اور آپ کی سنت پر عمل کرو، مگر اس میں بھی اس کا خیال رہے کہ جو سنت ہے، اسے سنت ہی سمجھو، نہ کہ اسے فرض کا درجہ عطا کرو، اسی طرح چاہیے کہ جو تم پر فرائض ہیں، انھیں سیکھو، مثلاً وضو کے ارکان کیا ہیں، نماز کے ارکان کیا ہیں، زکاۃ کا نصاب کیا ہے، قدر واجب کیا ہے، میت کے حصوں کی مقدار کیا ہے، پھر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی عام سیرت کا مطالعہ کرو، جس سے آخرت کی رغبت پیدا ہو، صحابہ اور تابعین کے حالات پڑھو، اور یہ چیزیں فرائض سے فاضل اور زیادہ ہیں، لیکن ان دنوں تم جن چیزوں میں الجھے ہوئے ہو اور

جس میں سر کھپایا ہے ہو اس کو آخرت کے علم سے کیا واسطہ یہ دنیا کے علوم ہیں۔[۱]

پھر ان ہی طلباء کو فرماتے ہیں:۔

"جن علوم کی حیثیت صرف ذرائع اور آلات کی ہے (مثلاً صرف و نحو وغیرہ) تو ان کی حیثیت آلہ اور ذریعہ ہی کی رہنے دو، نہ کر خود انہی کو مستقل علم بنا بیٹھو، علم کا پڑھنا تو اس لئے واجب ہے کہ اس کو سیکھ کر مسلمانوں کی بستیوں میں اسلامی شعائر کو رواج دو، لیکن تم نے دینی شعار اور اس کے احکام کو تو پھیلایا نہیں اور لوگوں کو زائد از ضرورت باتوں کا مشورہ دے رہے ہو۔

تم نے اپنے حالات سے عام مسلمانوں کو یہ باور کرا دیا ہے کہ علماء کی بڑی کثرت ہو چکی ہے، حالانکہ ابھی کتنے بڑے بڑے علاقے ہیں جو علماء سے خالی ہیں، اور جہاں علماء پائے بھی جاتے ہیں، وہاں بھی دینی شعار کو غلبہ حاصل نہیں ہے۔"[۲]

پھر آپ نے ان لوگوں کو بھی مخاطب کیا ہے، جنہوں نے اپنے وسوسوں کا نام دین رکھ چھوڑا ہے، اور جو ان کے وسواسی معیار پر پورا نہیں اترتا، گویا دین سے وہ خارج ہے، اس گروہ میں زیادہ تر زہاد، عباد اور وعاظ ہی اس زمانہ میں مبتلا تھے، اس لئے عنوان کا آغاز انہیں سے کیا گیا ہے، فرماتے ہیں:۔

دین میں تنگی پیدا کرنے والے واعظوں اور کنج نشیں زاہدوں سے خطاب

"دین میں خشکی اور سختی کی راہ اختیار کرنے والوں سے میں پوچھتا ہوں، اور

---

[۱] ایضاً ص ۲۱۴ [۲] ایضاً ص ۲۱۵

واعظوں اور عابدوں اور ان کنج نشینوں سے سوال ہے جو خانقاہوں میں بیٹھے ہیں کہ بہ جبر اپنے اوپر دین کو عائد کرنے والو! تمہارا کیا حال ہے ہر بری بھلی بات، ہر رطب ویابس پر تمہارا ایمان ہے، لوگوں کو تم جعلی اور گڑھی ہوئی حدیثوں کا وعظ سناتے ہو، اللہ کی مخلوق پر تم نے زندگی تنگ کر چھوڑی ہے، حالانکہ تم تو (اے امتِ محمدیہ) اس لئے پیدا ہوئے تھے کہ لوگوں کو آسانیاں بہم پہونچاؤ گے نہ کہ ان کو دشواریوں میں مبتلا کر دوگے، تم ایسے لوگوں کی باتیں دلیل میں پیش کرتے ہو، جو بیچارے مغلوب الحال تھے، اور عشق و محبت الٰہی میں عقل و حواس کھو بیٹھے تھے، حالانکہ اہل عشق کی باتیں وہیں کی وہیں لپیٹ کر رکھدی جاتی ہیں، نہ کہ ان کا چرچا کیا جاتا ہے تم نے وسواس کو اپنے لئے گوارا کر لیا ہے، اور اس کا نام احتیاط رکھ چھوڑا ہے، حالانکہ تمہیں صرف یہ چاہیئے تھا کہ اعتقاداً وعملاً احسان کے مقام کے لئے جن امور کی ضرورت ہے بس اس کو سیکھ لیتے، لیکن جو بیچارے اپنے اپنے خاص حال میں مغلوب تھے خواہ ان کی باتوں کو احسانی خالص امور میں گڈمڈ کرنے کی حاجت نہ تھی، اور نہ اربابِ کشف کی چیزوں کو ان میں مخلوط کرنے کی ضرورت تھی، چاہیئے کہ مقام احسان کی طرف لوگوں کو بلاؤ، پہلے اسے خود سیکھ لو، پھر دوسروں کو دعوت دو، کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ سب سے بڑی رحمت اور سب سے بڑا کرم اللہ کا وہ ہے جسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پہونچایا ہے، وہی صرف ہدایت ہے، جو آپ کی ہدایت ہے پھر تم کیا بتا سکتے ہو؟ کہ تم جن افعال کو کرتے ہو وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ کیا کرتے تھے؟[1]

---

[1] ایضاً ص ۲۱۵

آخر میں ایک عام خطاب عام مسلمانوں کے نام ہے جس میں کسی خاص طبقہ کی تخصیص نہیں ہے' فرماتے ہیں:۔

عام امتِ مسلمہ سے جامع خطاب امراض کی تشخیص اور علاج کی تجویز

"میں مسلمانوں کی عام جماعت کی طرف اب مخاطب ہوں اور کہتا ہوں' اے آدم کے بچو! دیکھو تمہارے اخلاق سو چکے ہیں، تم پر بیجا حرص و آز کا ہوکا سوار ہو گیا ہے، تم پر شیطان نے قابو پا لیا ہے، عورتیں مردوں کے سر چڑھ گئیں ہیں اور مرد عورتوں کے حقوق برباد کر رہے ہیں، حرام کو تم نے اپنے لئے خوشگوار بنا لیا ہے' اور حلال تمہارے لئے بدمزہ ہو چکا ہے پھر قسم ہے اللہ کی' اللہ نے ہرگز کسی کو اس کے بس سے زیادہ تکلیف نہیں دی ہے' چاہئے کہ تم اپنی شہوانی خواہشوں کو نکاح کے ذریعہ پوری کرو، خواہ تمہیں ایک سے زیادہ نکاح ہی کیوں نہ کرنا پڑے' اور اپنے مصارف وضع قطع میں تکلف سے کام نہ لیا کرو اسی قدر خرچ کرو جس کی تم میں سکت ہو، یاد رکھو! ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا، اور اپنے اوپر خواہ مخواہ تنگی سے کام نہ لو، اگر تم ایسا کرو گے تو تمہارے نفوس بالآخر فسق کے حدود تک پہونچ جائیں گے' اللہ تعالٰے اس کو پسند فرماتا ہے کہ اس کے بندے اس کی آسانیوں سے نفع اٹھائیں، جیسا کہ یہ بھی اسی کو پسند ہے کہ جو چاہیں وہ اعلیٰ مدارج پر احکام کی پابندی بھی کر سکتے ہیں، اپنے شکم کی خواہشوں کی تکمیل چاہئے کہ کھانوں سے کرو اور اتنا کمانے کی کوشش کرو جس سے تمہاری ضرورتیں پوری ہوں، دوسروں کے سینوں کے بوجھ بننے کی کوشش نہ کرو کہ ان سے مانگ مانگ کر کھایا کرو،

تم ان سے مانگو اور وہ نہ دیں، اسی طرح بیچارے بادشاہوں اور حکام کے اوپر بھی بوجھ نہ بن جاؤ، تمہارے لئے یہی پسندیدہ ہے کہ تم خود کما کر کھایا کرو، اگر تم ایسا کروگے تو خدا تمہیں معاش کی بھی راہ سُجھائے گا، جو تمہارے لئے کافی ہوگی۔

اے آدم کے بچو! جسے خدا نے ایک جائے سکونت دے رکھی ہو، جس میں وہ آرام کرے، اتنا پانی جس سے وہ سیراب ہو، اتنا کھانا جس سے بسر ہو جائے، اتنا کپڑا جس سے تن ڈھک جائے، ایسی بیوی جو اس کی شرمگاہ کی حفاظت کر سکتی ہو، اور اس کو رہن سہن کی جدوجہد میں مدد دے سکتی ہو، تو یاد رکھو کہ دنیا کامل طور سے اس شخص کو مل چکی ہے، چاہئے کہ اس پر خدا کا شکر کرے۔

بہرحال کوئی نہ کوئی کمائی کی راہ آدمی ضرور اختیار کرے اور اسی کے ساتھ قناعت کو اپنا دستورِ زندگی بنائے، اور رہنے سہنے میں اعتدال کا جادہ اختیار کرے، اور اللہ کی یاد کے لئے جو فرصت ہم دست ہو اسے غنیمت شمار کرے، کم از کم تین وقتوں صبح شام اور پچھلی رات کے ذکر کا خاص طور پر خیال رکھے، حق تعالیٰ کی یاد اس کی تسبیح و تہلیل اور قرآن کی تلاوت کے ذریعہ سے کیا کرے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنے اور ذکر کے حلقوں میں حاضر ہوا کرے۔

اے آدم کے بچو! تم نے ایسے بگڑے ہوئے رسوم اختیار کر لئے ہیں، جن سے دین کی اصلی صورت بگڑ گئی ہے، تم عاشوراء کے دن جھوٹی باتوں پر اکٹھے ہوتے ہو، اسی طرح شب برات میں کھیل کود کرتے ہو، اور مُردوں کے لئے کھانے پکا پکا کر کھلانے کو اچھا خیال کرتے ہو، اگر تم سچے ہو تو اس کی دلیل پیش کرو۔

اسی طرح اور بھی بری بری رسمیں تم میں جاری ہیں جنہوں نے تم پر تمہاری زندگی

تنگ کر دی ہے، مثلاً تقریبات کی دعوتوں میں تم نے حد سے زیادہ تکلف برتنا شروع کر دیا ہے' اسی طرح ایک بُری رسم یہ بھی ہے کہ کچھ بھی ہو جائے لیکن طلاق کو گویا تم نے ناجائز ٹھہرا لیا ہے' یونہی بیوہ عورتوں کو نکاح سے روکے رہتے ہو' ان رسموں میں تم اپنی دولت ضائع کرتے ہو' وقت برباد کرتے ہو اور جو صحت بخش روش تھی' اسے چھوڑ بیٹھے ہو۔

تم نے اپنی نمازیں برباد کر رکھی ہیں' تم میں کچھ لوگ ہیں جو دنیا کمانے میں اور اپنے دھندوں میں اتنے پھنس گئے ہیں کہ نماز کا انھیں وقت ہی نہیں ملتا' کچھ لوگ ہیں' جو قصہ کہانی سننے میں وقت گنواتے ہیں' خیر یہ بھی اگر ایسی مجلسیں لوگ ایسے مقامات پر قائم کیا کرتے جو مسجدوں سے قریب ہوں تو شاید ان کی نمازیں ضائع نہ ہوتیں' تم نے زکاۃ کو بھی چھوڑ دیا ہے' حالانکہ کوئی ایسا دولت مند نہیں ہے' جس کے اقربا و اعزہ میں حاجت مند لوگ نہیں ہوتے' اگر ان لوگوں کی وہ مدد کیا کریں اور ان کو کھلایا پلایا کریں اور زکاۃ کی نیت کر لیا کریں تو یہ بھی ان کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔

تم میں بعضوں نے روزے چھوڑ رکھے ہیں' خصوصاً جو فوجی ملازم ہیں کہتے ہیں کہ وہ روزہ رکھنے پر قادر نہیں ہیں' یعنی جو محنت انھیں برداشت کرنی پڑتی ہے' اس کے ساتھ روزے نہیں رکھ سکتے، تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ تم نے راہ غلط کر دی ہے اور تم حکومت کے سینہ پر بوجھ بن گئے ہو' بادشاہ جب اپنے خزانہ میں اتنی گنجائش نہیں پاتا جس سے تمہاری تنخواہ ادا کرے' تب رعایا پر زندگی کو دشوار کرتا ہے' سپاہیو! یہ تمہاری کیسی بُری عادت ہے ـــ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں

جو روزے رکھتے ہیں لیکن سحری نہیں کرتے اور رمضان میں ان سخت کاموں کو
نہیں چھوڑتے جن کی وجہ سے روزے ان پر گراں ہو جاتے ہیں"۔

آخر میں فرماتے ہیں:۔

"ملأ اعلیٰ کی طرف سے اصلاحی مطالبات کا اس زمانہ میں جن جن امور سے
متعلق تقاضا ہو رہا ہے اس کا ایک طویل باب ہے لیکن کھڑکی سے آدمی بڑی
نیکیوں کو جھانک سکتا ہے اور ڈھیر کے لیے اس کا نمونہ کافی ہے"[1]۔

اصلاح رسوم و تطہیر معاشرہ

شاہ صاحب نے ان خصوصی طبقات سے خصوصی خطاب پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس وقت کے مسلم معاشرہ میں صدیوں سے ہندوؤں کے درمیان رہنے، حدیث و سنت کی عدم اشاعت، علمائے دین کی غفلت و کوتاہی اور اسلامی حکومت کی فرض ناشناسی اور دینی احتساب کے فقدان کی وجہ سے جو ہندوانہ رسوم، بدعات اور غیر اسلامی شعائر رواج پا گئے تھے، اور مسلمان سختی سے ان کے پابند تھے، ان پر بھی شاہ صاحب نے نکیر فرمائی، اور ان عقائدِ فاسدہ، توہمات اور غیر مسلموں کی تقلید کی مذمت کی، عام طور پر وہ علماء، جن کا معقولات و علوم حکمت سے اشتغال تھا، ان عادات و رسوم کو معمولی سمجھ کر، یا اس بکھیڑے اور مخالفتِ عوام سے بچنے کے لئے ان کو نظر انداز کر دیا کرتے تھے، حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بعد جنھوں نے اپنے متعدد مکتوبات میں ان عقائد شرکیہ، شعائر جاہلیت و رسوم فاسدہ کی تردید و مذمت کی ہے[2]، اصلاحِ رسوم اور اسلامی معاشرہ کی تطہیر کا کام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے ذریعہ

---

[1] ایضاً صفحہ ۲۱۷ تا ۲۱۸ [2] ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت" ج ۴ از صفحہ ۲۳۹ تا ۲۵۳

شروع ہوا جس کی تکمیل ان کے فرزندان گرامی مرتبت اور انھیں کے خاندان کے تربیت یافتہ مصلحین امت، حضرت سید احمد شہیدؒ (خلیفہ شاہ عبدالعزیزؒ) حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ (نبیرۂ حضرت شاہ ولی اللہؒ) نے کی۔[1]

یہاں پر تفہیمات اور وصیت نامہ (فارسی) کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:۔

"ہندوؤں کی عادات شنیعہ میں سے ایک یہ ہے کہ جب کسی عورت کا شوہر مرجاتا ہے تو اسے وہ دوسری شادی نہیں کرنے دیتے، عربوں میں یہ عادت بالکل نہ تھی، نہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے، نہ ان کے زمانہ میں، نہ بعد میں اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو اس شنیع عادت کو ختم کرے۔ اور اگر عام لوگوں سے اس کا رواج ختم نہ ہو سکے تو اپنی قوم کے درمیان ہی عربوں کے طریقہ کو رواج دینا چاہئے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو اس عادت کو قبیح سمجھنا اور دل سے اس کا دشمن ہونا چاہئے کہ یہ ہی منکر کا سب سے آخری درجہ ہے۔

ہماری دوسری بری عادت یہ ہے کہ بہت لمبا مہر باندھتے ہیں، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم (کہ آپ سے ہمارے دین و دنیا کی عزت وابستہ ہے) اپنے گھر والوں کے مہر (جو بہترین خلائق تھے) ساڑھے بارہ اوقیہ مقرر فرمائے تھے جس کے پانچ سو درم ہوتے ہیں۔

ہماری ایک دوسری بری عادت اسراف کی ہے کہ خوشی کے موقعوں اور رسموں میں بہت خرچ کرتے ہیں، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے شادیوں میں صرف ولیمہ اور

---

[1] ملاحظہ ہو صراط مستقیم (از افادات حضرت سید احمد شہیدؒ جمع کردہ شاہ اسماعیل شہیدؒ) نیز کتاب سیرت سید احمد شہیدؒ (۱-۲) "وکاروان ایمان و عزیمت" از مصنف۔

عقیقہ ثابت ہے' چنانچہ ان دونوں کی پابندی کرنی چاہئے، اور اس کے علاوہ سے بچنا چاہئے، یا ان کا زیادہ اہتمام نہیں کرنا چاہئے۔

ہماری بری عادتوں میں غم کے موقعوں، سیُّم، چہلم، ششماہی، فاتحہ اور سالانہ کے نام پر بھی اسراف ہے' حالانکہ ان میں سے کسی کا عرب اولین میں رواج نہیں تھا، بہتر یہی ہے کہ میت کے ورثا کی تین دن تعزیت اور ایک شب و روز کے کھانے کے علاوہ کوئی اور رسم نہ کریں، تین دن کے بعد قبیلہ کی عورتیں جمع ہو کر میت کی عورتوں کے کپڑوں میں عطر ملیں، اور اگر میت کی زوجہ حیات ہو تو عدت گذرنے کے بعد سوگ کا سلسلہ ختم کر دیں[1]۔"

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے اپنے مضمون "منصب تجدید کی حقیقت" اور تاریخ تجدید میں حضرت شاہ ولی اللہ کا مقام" (الفرقان ولی اللہ نمبر) میں "ازالۃ الخفا" اور "تفہیمات" کے اقتباسات کو پیش کرنے کے بعد صحیح لکھا ہے کہ:۔

"ان اقتباسات سے ایک دھندلا سا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب نے مسلمانوں کے ماضی اور حال کا کس قدر تفصیلی جائزہ لیا ہے' اور کس قدر جامعیت کے ساتھ ان پر تنقید کی ہے' اس قسم کی تنقید کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی میں جتنے صالح عناصر موجود ہوتے ہیں، جن کے ضمیر و ایمان میں زندگی، جن کے قلب میں بُرے اور بھلے کی تمیز ہوتی ہے' ان کو حالات کی خرابی کا احساس سخت مضطرب کر دیتا ہے' ان کی اسلامی حِس اتنی تیز ہو جاتی ہے' کہ اپنے گرد و پیش کی زندگی میں جاہلیت کا ہر اثر انھیں کھٹکنے لگتا ہے' ان کی قوت امتیاز اتنی بڑھ جاتی ہے' کہ وہ زندگی کے ہر پہلو میں

[1] تفہیمات الٰہیہ از صفحہ ۲۴۶ تا ۲۴۷ طبع بجنور ۱۳۵۵ھ ۱۹۳۶ء، وصیت نامہ فارسی مطبوعہ دہلی ۱۲۶۸ھ صفحہ ۲۴

اسلام اور جاہلیت کی آمیزشوں کو محسوس کرنے لگتے ہیں؛ اور ان کی قوت ایمانی اس قدر بیدار ہو جاتی ہے کہ خارزار جاہلیت کی ہر کھٹک انھیں اصلاح کے لئے بےچین کر دیتی ہے، اس کے بعد مجدد کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ان کے سامنے تعمیر نو کا ایک نقشہ واضح صورت میں پیش کرے، تاکہ حالت موجودہ کو جس حالت سے بدلنا مطلوب ہے، اس پر وہ اپنی نظر جما سکیں، اور اپنی تمام سعی و عمل کو اسی سمت میں مرکوز کر دیں؛ یہ تعمیری کام بھی شاہ صاحب نے اسی خوبی اور جامعیت کے ساتھ انجام دیا، جو ان کے تنقیدی کام میں آپ دیکھ چکے ہیں۔[1]

---

[1] الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر صفحہ ۱۰۱، ۱۰۲

بابِ یازدہم

فرزندانِ گرامی قدر، خلفائے عالی مرتبت، ناموَر معاصر

لائق فرزندان وجانشین

مصلحینِ امت ومجددینِ اسلام میں حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ پر اللہ تعالیٰ کے جو خصوصی انعامات اور اہلِ دعوت وعزیمت میں آپ کو جو امتیازات حاصل ہیں، ان میں ایک تاریخی امتیاز اور اللہ تعالیٰ کا آپ کے ساتھ معاملۂ خاص یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسے فرزند وجانشین عطا فرمائے جو "نعم الخلف لنعم السلف" کے صحیح مصداق ہیں اور جنھوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کے جلائے ہوئے چراغ کو نہ صرف روشن وتاباں رکھا، بلکہ اس سے سیکڑوں چراغ جلائے، پھر ان چراغوں سے وہ چراغ جلتے رہے جن سے اس پورے تحتی برِاعظم (ہندوستان) اور ہندوستان کے باہر بھی کتاب وسنت، عقائدِ حقہ، اشاعتِ توحیدِ خالص، ردِّ شرک وبدعت، اصلاحِ رسوم، تزکیۂ نفس، حصولِ درجۂ احسانی، اعلائے کلمۃ اللہ وجہاد فی سبیل اللہ، حمیتِ دینی، تاسیسِ مدارسِ دینیہ، دین کی صحیح تعلیمات کی ترجمانی وتبلیغ کے لئے تصنیف وتالیف اور تراجمِ قرآن وکتبِ حدیث وفقہ کا مبارک سلسلہ اس وقت سے لے کر اس وقت تک جاری ہے، اگر ان مبارک اقدامات ومساعی کی تاریخ دیکھی جائے اور خیر وبرکت کے ان مراکز اور سلسلوں کے "شجرۂ نسب" کی تحقیق کی جائے،

تو معلوم ہوگا کہ ایک دیئے سے دوسرا دیا جلتا رہا، اور یہ سب چراغ اس چراغ سے روشن ہوئے جو بارہویں صدی ہجری کے وسط میں حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے آندھیوں کے طوفان میں جلایا تھا، اس وقت بے اختیار فارسی کا یہ شعر زبان پر آتا ہے۔

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں
ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

عجیب مماثلت

فرزندانِ گرامی اور ان کے ذریعہ سے اپنی خصوصی دعوت اور اس سلسلہ کی اشاعت میں (جو ہزار کمالات کے باوجود تذکرہ و تراجم کی کتابوں میں ایک نادر و نایاب خصوصیت ہے) آپ کو اپنے ہی سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے بانی اور شیخ الشیوخ حضرت مجدد الف ثانیؒ سے عجیب مماثلت ہے، حضرت مجدد الف ثانیؒ کے چار فرزندانِ گرامی درجۂ کمال کو پہونچے[1] خواجہ محمد صادق، خواجہ محمد سعید، خواجہ محمد معصوم، خواجہ محمد یحییٰ، ان میں سے اول الذکر حضرت خواجہ محمد صادق کا ۲۵ سال کی عمر میں ۱۰۲۵ھ میں انتقال ہوگیا، حضرت مجددؒ سے ان کے بارے میں بلند کلمات منقول ہیں، سلسلۂ مجددیہ کی اشاعت تینؔ آخر الذکر فرزندانِ گرامی کے ذریعہ ہوئی اور حضرت سید آدم بنوریؒ کو مستثنیٰ کر کے (جن کا تعلق حضرت سے نسبتِ بیعت کا تھا، اور وہ نسبت ایسی قوی اور مقبول تھی کہ انھیں کے سلسلہ میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ، اور ان کے خلفائے نامدار اور علمائے کبار ہیں) اس سلسلۂ عالیہ کی توسیع و تبلیغ اور حضرت مجددؒ کے شروع کئے ہوئے

---

[1] ان چار کے علاوہ حضرت مجدد کے بقیہ صاحبزادے شیر خوارگی اور صغر سنی میں وفات پاگئے تھے۔

کارِ تجدید و انقلاب کی تکمیل انھیں تین فرزندانِ گرامی قدر کے ذریعہ ہوئی، پھر ان تینوں میں حضرت خواجہ محمد معصومؒ کو امتیازِ خاص حاصل ہے کہ ان کے ذریعہ سے یہ سلسلہ ترکستان، عرب اور ترکی تک پہونچا اور کہنے والے نے صحیح کہا کہ ؎

چراغِ ہفت کشور خواجہ معصومؒ

منوّر از فروغش ہند تا روم

پھر آپ ہی کا مخفی ہاتھ اور توجہات باطنی تھیں کہ اکبر کے تخت پر دو پشتوں کے بعد ہی وہ باحمیت، مجاہد و غازی، متشرع اور فقیہ سلطان آیا، جو ماحیِ دین بننے کے بجائے حامیِ دین، اور ہادمِ ملت کے بجائے خادمِ ملت قرار پایا، جس کو حضرت خواجہ شروع سے اپنے مکتوبات میں "شہزادۂ دین پناہ" لکھ کر اس کارِ عظیم کے لئے تیار کر رہے تھے۔

بالکل اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے چار[1] باکمال فرزند چھوڑے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے فرزندانِ گرامی کا بھی یہی حال ہے کہ ان کے چار[2] صاحبزادوں میں سے شاہ عبدالغنی صاحب کا (جو اپنے بھائیوں میں سب سے صغیر السن تھے) اپنے بھائیوں میں سب سے پہلے (۱۲۲۷ھ میں) انتقال ہو گیا، شاہ صاحبؒ کی تعلیمات آپ کے علوم و معارف کی

---

[1] شاہ صاحبؒ کی پہلی اہلیہ سے شیخ محمد کے نام سے ایک فرزند تھے، جن کا انتقال شاہ صاحبؒ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد جوانی میں ہو گیا تھا، ان کا ذکر گذشتہ صفحات میں گذر چکا ہے مختصر ترجمہ "نزہۃ الخواطر" میں بھی ہے۔

[2] حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ انھیں کے فرزند تھے، شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد یہی چار صاحبزادے (شاہ عبدالعزیز صاحبؒ، شاہ رفیع الدین صاحبؒ، شاہ عبدالقادر صاحبؒ اور شاہ عبدالغنی صاحبؒ) معروف و مشہور ہوئے۔

صاحبزادوں کی ترتیبِ وفات عکسی ہے، سب سے چھوٹے صاحبزادہ شاہ عبدالغنی صاحبؒ نے پہلے (۱۲۲۷ھ میں) پھر ان سے بڑے شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے (۱۲۳۰ھ میں)، پھر شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے (۱۲۳۳ھ میں) پھر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے (۱۲۳۹ھ میں) وفات پائی۔

تبلیغ واشاعت، مردانِ کار کی تربیت وتکمیل اور تدریس وتصنیف کا وہ طرزِ خاص جس میں شاہ صاحبؒ کا ذوق، اور اجتہاد وتجدید کا رنگ جھلکتا تھا، انھیں تین صاحبزادوں کے ذریعہ جاری رہا، پھر ان تینوں میں بھی سراج الہند حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ کو اپنے بھائیوں میں وہ مقام حاصل ہوا، جو حضرت مجددؒ کے صاحبزادوں میں حضرت خواجہ محمد معصومؒ کو حاصل ہوا تھا، اور ان کے ذریعہ حضرت شاہ صاحبؒ کے سلسلہ، اور آپ کے علوم وتعلیمات کی عالمگیر اشاعت ہوئی، اور بعض شعبوں کی تو اس طرح توسیع وتکمیل ہوئی کہ ادب کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ: ع

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

قبل اس کے کہ ہم شاہ صاحبؒ کے شروع کئے ہوئے کاموں کی اس تکمیل توسیع وترقی کا ذکر کریں، جو شاہ عبد العزیز صاحبؒ کے ہاتھوں عمل میں آئی، ہم ان کے مختصر حالاتِ زندگی اور تذکرہ وتعارف پیش کرتے ہیں، اس سلسلہ میں ہم مولانا حکیم سید عبد الحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "نزہۃ الخواطر" کی جلد ہفتم سے ان کا تذکرہ نقل کرنے پر اکتفا کریں گے، جو ماقلّ و دلّ کا مصداق ہے۔

حضرت شاہ عبد العزیز دہلویؒ

امام العلماء، راس الفضلاء، علامہ محدث شاہ عبد العزیز بن شاہ ولی اللہ بن شاہ عبد الرحیم عمری دہلویؒ، خود اپنے زمانہ کے علماء کے سردار اور گزشتہ علماء کے سرتاج کے چشم وچراغ، بعض لوگوں نے آپ کو "سراج الہند" اور بعض نے "حجۃ اللہ" کا خطاب دیا۔ آپ پنجشنبہ کی رات ۲۵ رمضان ۱۱۵۹ھ میں پیدا ہوئے جیسا کہ آپ کے

تاریخی نام "غلام حلیم" سے معلوم ہوتا ہے' آپ نے قرآن شریف کے حفظ سے فراغت پائی' اور اپنے والد ماجد سے تعلیم کا سلسلہ شروع کیا، آپ نے ان سے قرأت وسماعت کے ذریعہ پوری تحقیق ودرایت اور توجہ سے علم حاصل کیا جس سے آپ کو علوم میں ملکۂ راسخہ حاصل ہوگیا، جب آپ ۱۶ سال کے تھے' تو آپ کے والد ماجد نے انتقال کیا، اس کے بعد آپنے شیخ نور اللہ بڑھانوی، شیخ محمد امین کشمیری سے استفادہ کیا، آپ کو اجازت علمی شاہ محمد عاشق بن عبید اللہ پھلتی سے حاصل ہوئی جو آپ کے والد ماجد کے تربیت یافتہ اور محرم راز تھے' آپ نے ان حضرات سے ان علوم وکمالات میں استفادہ اور ان کی تکمیل کی جو والد صاحب کی وفات سے تشنۂ تکمیل تھے' اپنے ایک رسالہ میں آپ نے اپنے والد صاحب اور دوسرے علماء سے اپنے استفادہ کی تفصیل لکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کتب حدیث میں پوری مؤطا مع مسوی اور مشکوٰۃ المصابیح اپنے والد صاحب سے پڑھیں، حصن حصین، اور شمائل ترمذی کی آپ کے درس میں سماعت کی جس کی قرأت آپ کے بھائی شیخ محمد کرتے تھے، صحیح بخاری کتاب الحج تک کی سماعت سید غلام حسین مکی کی قرأت سے کی، جامع الترمذی، سنن ابی داؤد کی سماعت مولوی ظہور اللہ مراد آبادی کی قرأت سے اور مقدمۂ صحیح مسلم اور اس کی بعض احادیث اور سنن ابن ماجہ کے کچھ حصوں کی سماعت محمد جواد پھلتی کی قرأت سے، مسلسلات اور مقاصد جامع الاصول کے بعض حصوں کی سماعت مولوی جار اللہ نزیل مکہ کی قرأت اور سنن النسائی کے کچھ حصوں کی سماعت آپ نے اپنے والد ماجد کے حلقۂ درس میں کی، صحاح ستہ کے باقی ابواب کی سماعت آپ نے اپنے والد ماجد کے خلفاء سے جیسے شیخ نور اللہ اور خواجہ محمد امین سے کی اور ان کے علاوہ کتابوں کی اجازت عامہ اپنے والد کے خلیفۂ ارشد

اور ماموں زاد بھائی شاہ محمد عاشق پھلتی اور خواجہ محمد امین سے پائی، اور ان دونوں کے لئے آپ کے والد ماجد صاحب کا اجازت نامہ "تفہیمات الٰہیہ" اور "شفاء العلیل" میں موجود ہے، ان لوگوں نے آپ کے والد صاحب سے پڑھا ہے، جبکہ شاہ محمد عاشق آپ کے والد ماجد کی شیخ ابو طاہر مدنی کی خدمت میں قرأت وسماعت اور ان سے اجازت میں شریک بھی تھے، ان کی اسانید ان کی کتاب "الارشاد فی مہمات الاسناد" وغیرہ رسائل میں مذکور ہیں۔

آپ طویل القامت، نحیف البدن، گندم گوں، کشادہ چشم تھے، داڑھی گھنی تھی، خط نسخ ورقاع بڑی خوبصورتی کے ساتھ لکھتے تھے، تیر اندازی، شہسواری اور موسیقی میں بھی مہارت تھی، آپ سے آپ کے بھائیوں، شاہ عبد القادرؒ، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبد الغنیؒ اور آپ کے داماد مولانا عبد الحیؒ بن ہبۃ اللہ بڈھانوی نے درس لیا، مفتی الٰہی بخش کاندھلوی اور سید قمر الدین سونی پتی آپ سے قرأت وسماعت میں آپ کے بھائیوں کے ساتھ تھے، حضرت شاہ غلام علی مجددیؒ (خلیفہ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ) نے آپ سے صحیح بخاری پڑھی، مولانا سید قطب الہدیٰ بن مولانا محمد واضحؒ رائے بریلوی نے آپ سے صحاح ستہ کا درس لیا۔

آپ کے دوسرے اصحاب نے آپ کے بھائیوں سے پڑھا ہے اور آپ سے سند لی ہے، آپ کی مجلسوں میں حاضر رہے ہیں، اور آپ کا درس قرآن سنا ہے اور آپ سے حسب توفیق استفادہ کیا ہے، آپ کے نواسہ شاہ محمد اسحاق بن افضل عمری آپ کے یہاں قاری تھے، جو ہر روز قرآن مجید کے ایک رکوع کی تلاوت کرتے تھے، اور شاہ صاحبؒ اس کی تفسیر فرماتے تھے، یہی آپ کے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہؒ کا طریقہ بھی تھا، شاہ ولی اللہ صاحبؒ

کا آخری درس قرآن آیت "اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى"[1] تک ہوا تھا جہاں سے
شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنا درس شروع کیا، آپ کا آخری درس "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ
اَتْقٰکُمْ"[2] تک ہوا تھا، وہاں سے آپ کے نواسہ شاہ محمد اسحاق صاحب نے اپنا درس شروع
کیا جیسا کہ "مقالات طریقت" میں ہے آپ اپنے علم وفضل، فہم وذکاء اور سرعت حفظ
میں یگانۂ روزگار تھے، آپ نے پندرہ سال کی عمر ہی سے درس وافادہ کا سلسلہ شروع کر دیا
اور آپ سے بڑے بڑے فضلاء نے استفادہ کیا، اکثر اطراف کے طلبہ آپ کی خدمت میں
اس ذوق وشوق سے حاضر ہوتے جیسے پیاسا پانی پر گرتا ہے۔

پچیس سال کی عمر میں آپ کو متعدد اذیت رساں امراض نے گھیر لیا، جن کے سبب
آپ مراق، جذام، برص میں مبتلا ہوئے اور بصارت بھی جاتی رہی، بعض واقفان حال
نے آپ کے چودہ تکلیف دہ امراض کا ذکر کیا ہے، اس وجہ سے آپ نے اپنی تدریسی ذمہ داری
اپنے دونوں بھائیوں شاہ رفیع الدین صاحبؒ اور شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے سپرد کر دی، مگر اس کے
ساتھ خود بھی درس دیتے تھے، تصنیف وافتاء اور وعظ کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا،
ہر شنبہ کو آپ کا ہفتہ وار وعظ قرآن مجید کی تفسیر پر مشتمل ہوتا تھا، اخیر عمر میں آپ مجلس
میں تھوڑی دیر بھی نہیں بیٹھ سکتے تھے، اس لئے اپنے قدیم وجدید مدرسہ کے درمیان ٹہلتے رہتے
اور لوگ بڑی تعداد میں اس حالت میں بھی استفادہ کرتے اور آپ کا درس وافتاء اور
وعظ ہوتا رہتا تھا، اسی طرح عصر ومغرب کے درمیان دو آدمیوں کی مدد سے مدرسہ
اور جامع مسجد کی درمیانی سڑک پر نکلتے تھے، لوگ راستہ میں آپ کے منتظر رہتے اور
اپنی مشکلات حل کراتے۔

انھیں امراض میں عدم اشتہا کا مرض اس حد تک بڑھ گیا کہ کئی کئی دن کسی چیز کے

---

[1] سورۂ المائدہ — ٨   [2] سورۂ الحجرات — ١٣

چکھنے کی بھی نوبت نہ آتی، اور بخار کی طرح اس کی بھی باری آتی تھی آپ نے "مناقب حیدریہ" کی تقریظ میں لکھا ہے :۔

"اس تقریظ میں کوتاہی کے لئے میں معذرت خواہ ہوں، جو اعذار اور امراض کے سبب ہوئی جن کی وجہ سے بھوک بالکل ختم ہو گئی ہے اور کھانے کی نوبت باری کے بخار کی طرح آتی ہے، ایسا غالباً پت کے غلبہ کے سبب ہے، قوی مضمحل ہو گئے، حواس میں فرق آگیا، اعضاء کمزور پڑ گئے، ہڈیاں اور ڈاڑھیں بھی کمزور ہو گئیں"

امیر حیدر بن نور الحسنین بلگرامی کو خط میں لکھتے ہیں :۔

"اگر آپ اپنے محب کا حال پوچھتے ہیں تو وہ بہت خراب ہے اور صبح و شام اس میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے، اور اسے ظاہری و باطنی آلام گھیرے ہوئے ہیں، قرار و سکون چھن گیا ہے، اور قلق و اضطراب بڑھ گیا ہے اور یہ سب ایسے امراض کے سبب ہے جن میں سے ایک مرض بھی آدمی کو پریشان اور غمزدہ کرنے کے لئے کافی ہے، جیسے بواسیر، معدہ اور آنتوں میں ریاح کا رکنا، اس حد تک فقدان اشتہا کہ کئی رات دن کھانا چکھنے کی بھی نوبت نہیں آتی، بخارات جب قلب کی طرف چڑھتے ہیں تو دم گھٹنے کی کیفیت ہو جاتی ہے، یہ جب دماغ کی جانب پہونچتے ہیں تو تکلیف دہ درد سر شروع ہو جاتا ہے، جو ہاون دستہ کے ضرب کی طرح محسوس ہوتا ہے "وَإِلَى اللهِ الْمُشْتَكَى وَهُوَ الْمُسْتَعَانُ" یہ حالت ایک لفظ بھی بولنے کی اجازت نہیں دیتی، چہ جائیکہ کوئی کتاب املا کرا سکے یا کوئی پیغام لکھوا سکے"

آپ کو حیرت ہو گی کہ آپ ان موذی امراض کے باوجود لطیف الطبع، حاضر جواب، خوش گفتار ہے اور تواضع، بشاشت اور مہر و محبت کی یہی ادا قائم رہی جو شروع سے تھی آپ کی صحبت فیض و فکر کو

جلا بخشی تھی، ان صحبتوں میں حیرت انگیز خبریں، چیدہ اشعار، دور دراز کے ملکوں، ان کے باشندوں اور وہاں کے عجائبات کا بیان اس طرح ہوتا تھا جس سے سامعین کو محسوس ہوتا تھا کہ آپ اپنے مشاہدات بیان فرما رہے ہیں، حالانکہ آپ نے کلکتہ کے علاوہ کوئی اور شہر نہیں دیکھا تھا، مگر آپ غیر معمولی طور پر ذہین اور متجسس فطرت کے مالک تھے، جس کے سبب آپ نے باہر سے دہلی آنے والوں اور معلومات افزا کتابوں سے (جن کے مطالعہ سے مشاہدہ کی کیفیت حاصل ہو سکتی ہے) یہ معلومات اپنے دماغ میں محفوظ کر لئے تھے۔

لوگ آپ سے علمی استفادہ کے لئے حاضر ہوتے، شاعر و ادیب ادبی استفادہ اور اپنا کلام دکھانے کے لئے[1]، اور محتاج و ضرورت مند لوگ امراء سے سفارش کرانے اور آپ کی ممکن مدد حاصل کرنے کے لئے آتے، کیونکہ آپ کے اخلاق کریمانہ کی شہرت عام تھی، اسی طرح مریض دوا علاج کے لئے حاضر ہوتے، اہل جذب و سلوک آپ سے روحانی استفادہ کے لئے آپ کے پاس جاتے تھے، پردیسی علماء و مشائخ کو آپ اپنے یہاں ٹھہراتے اور ان کی حاجت روائی کرتے، اگر آپ کے پاس کوئی مخالف یا ایسا شخص بیٹھتا جسے دینی مسائل میں کچھ اختلاف ہوتا تو آپ اپنی سحر بیانی سے

---

[1] مولوی محمد حسین آزاد "آب حیات" میں لکھتے ہیں کہ شاہ نصیر نے دکن میں کسی کی فرمائش سے وشمری ایک غزل کہی تھی جس کی ردیف تھی، آتش و آب و خاک و باد، وہ غزل مشاعرہ میں سنائی اور کہا کہ اس طرح میں جو غزل کہے اسے میں استاد مانتا ہوں، دوسرے مشاعرہ میں استاد ذوق نے (جو شاہ نصیر کے شاگرد تھے) اسی پر غزل پڑھی، شاہ صاحب کی طرف سے بجائے خود اس پر اعتراض ہوئے، جشن قریب تھا، شیخ علیہ الرحمہ نے بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ اسی طرح میں لکھا مگر پہلے مولوی شاہ عبد العزیز صاحب کے پاس لے گئے کہ اس کی صحت و سقم سے آگاہ فرمائیں، انھوں نے سن کر پڑھنے کی اجازت دی مگر ولی عہد بہادر نے اپنے شقہ کے ساتھ لے کر شاہ صاحب کے پاس بھیجا انھوں نے جو کہا تھا وہی جواب میں لکھ دیا، شیخ مرحوم کا دل اور بھی قوی ہو گیا اور دربار شاہی میں جا کر قصیدہ سنایا "آب حیات صفحہ ۴۵۲-۴۵۳" از مصنف

آگ اور پانی اور متضاد چیزوں میں اتحاد پیدا کر دیتے، اور وہ آپ سے متفق وہم خیال ہو کر جدا ہوتا۔

شیخ محسن بن یحییٰ ترہتی "الیانع الجنی" میں لکھتے ہیں:۔

"وہ فضل و کمال اور شہرت و مقبولیت کے اس مقام پر فائز تھے کہ اطراف ہند کے لوگ ان سے انتساب بلکہ آپ کے تلامذہ و منتسبین سے بھی ادنیٰ نسبت پر فخر کرتے تھے .... آپ کے ان کمالات میں جن میں آپ کا کوئی معاصر آپ کا مقابل نہ تھا، آپ کی حاضر دماغی اور حاضر جوابی بھی تھی، جس کے سبب آپ بحث میں غالب آتے اور مخاطب کو لاجواب کر دیتے، انھیں کمالات میں آپ کی قادر الکلامی حسن تعبیر و خوبی تحریر بھی تھی جس میں اہل نظر نے آپ کو سب پر فائق تسلیم کیا تھا"

آپ کے ایسے ہی کمالات میں آپ کی بے مثل فراست بھی تھی، جس کے ذریعہ اللہ تعالےٰ نے تعبیر خواب کی امتیازی صلاحیت عطا کی تھی، آپ خواب کی ایسی تعبیر دیتے جو پوری ہوتی تھی اور آپ کی چشم دید معلوم ہوتی تھی، یہ صلاحیت بڑے پاک نفس انسانوں ہی کے حصہ میں آتی ہے، ان کے علاوہ بھی آپ کے متعدد فضائل و کمالات ہیں، مختصراً یہی کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے آپ کی ذات میں نوع بہ نوع اور گوناگوں فضائل جمع کر دیئے تھے، جو ابنائے دہر میں پھیلے ہوئے تھے، اگر یہ شعر کہنے والا شاعر ان کو دیکھتا تو اس کو صاف معلوم ہوتا کہ اس کا مبالغہ بھی قاصر ہے ؎

ولم أرأمثال الرجال تفاوتا   لدى المجد حتى عُدَّ ألفٌ لواحد

(میں نے انسانوں کی طرح فرق مراتب نہیں دیکھا جس کے سبب ہزار انسان ایک کے برابر شمار ہوتے ہیں۔)

اس صورت میں آپ کے مفاخر و فضائل کا شمار کون کر سکتا ہے؟ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی سب تصنیفات علماء کے حلقوں میں بالعموم وقعت و قبولیت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں اور ان سے استدلال کیا جاتا ہے، ان کے اسلوب تحریر میں ایسی قوت اور فصاحت و سلاست ہے کہ

کان ان سے حلاوت پاتے ہیں، اور دل ان سے لذت یاب ہوتے ہیں، ان کے کلام میں تاثیر وتسخیر کی ایسی قوت ہے کہ اس سے متاثر و متفق نہ ہونا مشکل ہے، آپ کوئی کمزور اور قابلِ اعتراض تحریر دیکھتے تو بڑی خوش اسلوبی سے اس کی تردید فرماتے تھے، کلامی مسائل میں مذہب تشیع آپ کا خاص موضوعِ بحث و تنقید رہا ہے، آپ نے ایسے عالمانہ و متکلمانہ انداز سے اس پر بحث کی ہے کہ اس کا جواب شافی ابھی تک نہیں ہو سکا ہے۔

آپ کی مشہور تصانیف میں یہ کتابیں ہیں:۔

تفسیر قرآن مسمّٰی بہ "فتح العزیز" جسے آپ نے شدت مرض اور ضعف کی حالت میں املاء کرایا تھا، یہ کئی بڑی جلدوں میں تھی، جس کا بڑا حصہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ضائع ہو گیا، اور صرف شروع اور اخیر کی دو جلدیں بچ گئیں، انھیں میں "الفتاوی فی المسائل المشکلۃ"[1] بہت ضخیم تھی، مگر اب اس کا خلاصہ دو جلدوں میں ملتا ہے، انھیں کتابوں میں "تحفۂ اثنا عشریہ" (جو مذہب شیعہ کی تنقید و تردید میں ہے) ایک بے مثل کتاب ہے، دوسری کتابوں میں "بستان المحدثین"[2] ہے جو کتب حدیث اور محدثین کی تفصیلی فہرست و تذکرہ ہے، جو نامکمل رہی، "العجالۃ النافعۃ" اصول حدیث میں ایک فارسی رسالہ ہے، طلبہ حدیث کے حفظ کے لئے بھی ایک رسالہ ہے "میزان البلاغۃ" علم بلاغت کا ایک بہترین متن ہے، اسی طرح "میزان الکلام" علم کلام میں ایک متن ہے، ایک رسالہ "السر الجلیل فی مسئلۃ التفضیل" ہے، جس میں خلفائے راشدینؓ کے فرق مراتب پر گفتگو ہے، ایک رسالہ "سر الشہادتین" جو شہادت

---

[1] حضرت شاہ عبد العزیزؒ کا پایہ فقہ حنفی میں بہت بلند تھا، اس میں ان کو رسوخ کامل اور تفقہ کا درجہ حاصل تھا اور بعض اہل نظر کے نزدیک وہ اس میں حضرت شاہ ولی اللہؒ سے بھی فائق تھے۔ (مصنف)

[2] اس کتاب سے شاہ صاحب کی طبقات محدثین اور کتب حدیث پر وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرات حسنینؓ کے بیان میں ایک عمدہ رسالہ ہے، ایک رسالہ انساب میں ہے، ایک رسالہ "تعبیر رؤیا" پر ہے، ان کے علاوہ اور بھی رسائل ہیں، منطق و حکمت کی کتابوں میں "میر زاہد رسالہ" "میر زاہد ملا جلال" "میر زاہد شرح مواقف" پر آپ کے حاشیے ہیں، "حاشیہ ملا کو سج" پر "عزیزیہ" کے نام سے آپ کا حاشیہ ہے، صدر شیرازی کی "شرح ہدایۃ الحکمۃ" پر بھی آپ کا حاشیہ ہے، "ارجوزۂ اصمعی" کی شرح بھی لکھی ہے، علماء و ادباء کے نام آپ کے بہت سے خطوط بھی ہیں، اپنے والد ماجدؒ کے قصائد بائیہ و ہمزیہ کی نفیس تخمیس بھی کی ہے[1]، نظم و نثر، قوت تحریر، حسن انشاء، خوبیٔ تعبیر میں آپ اپنی مثال تھے، آپ کی تحریریں برجستگی، و بدیہہ گوئی، قلم کی روانی اور زود نویسی کی اچھی مثال ہیں۔

نماز فجر کے بعد یکشنبہ ۷ر شوال ۱۲۳۹ھ کو اسّی سال کی عمر میں انتقال فرمایا، آپ کی قبر دہلی میں شہر کے باہر آپ کے والد ماجد کے قریب ہے[2]۔

شاہ صا[illegible] تبلیغ وتکمیل

شاہ صاحبؒ کے تجدیدی کارنامہ کو ہم پانچ شعبوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ قرآن مجید کی ترجمانی، مسلمانوں میں اس کی تعلیمات و مضامین کی اشاعت عام، اس کے ذریعہ سے عقائد کی اصلاح اور دین خالص سے عوام کے براہ راست ربط و تعلق کی سعی جمیل۔

---

[1] شاہ صاحب کا عربی کلام بالخصوص ان کا قصیدۂ لامیہ (جو ان کے ترجمہ میں "نزہۃ الخواطر" میں منقول ہے) عربیت کا اعلیٰ نمونہ ہے، اور اس میں وہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے عربی کلام سے بھی فائق معلوم ہوتا ہے، اہل زبان کی سی یہ عربیت ان کے بعد ان کے تلمیذ رشید مفتی صدر الدین خاں صاحبؒ کے عربی کلام میں نظر آتی ہے، ملاحظہ ہوں وہ ابیات جو نمونۂ کلام کے طور پر "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الهند" اور "نزہۃ الخواطر" میں مفتی صاحبؒ کے تذکرہ میں منقول ہیں۔ (مصنف)

[2] "نزہۃ الخواطر" ج ۷، ص ۲۶۸–۲۷۶ باختصار خفیف۔

۲۔ حدیث کی نشر و اشاعت، اس کے درس و اجازت کے سلسلہ کا احیاء، اس کے حلقہائے درس کا اجراء اور اساتذۂ حدیث اور شارحین کتب حدیث کی تربیت۔

۳۔ فتنہ رفض و تشیع کا مقابلہ، صحابہ کرامؓ اور قرآن عظیم کو مجروح و مشکوک بنانے والی کوششوں اور سازشوں کا سدباب۔

۴۔ جہاد فی سبیل اللہ کا احیاء اور ہندوستان میں اسلامی اقتدار اور مسلمانوں کی آزادی کے لئے بڑے خطرے اور چیلنج کا مقابلہ۔

۵۔ ان مردان کار کی تربیت جو حالات اور وقت کے تقاضوں اور دین کے حقیقی مطالبوں کے مطابق دعوت و اصلاح کا کام انجام دیں۔

اشاعت و تبلیغ قرآن

جہاں تک عوام تک قرآن مجید کے پہونچانے اور اس کے ذریعہ سے عقائد باطلہ اور رسوم فاسدہ کی اصلاح اور ربط مع اللہ کی کوشش کا تعلق ہے، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اس سلسلہ میں اپنے والد بزرگوار کے کام کو بہت ترقی دی، اور اس میں بڑی عمومیت اور وسعت پیدا کردی، شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا درس قرآن سورہ نساء کی آیت "اعدلوا ھواقرب للتقویٰ" تک پہونچا تھا کہ آپ کی وفات ہوگئی، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے یہیں سے درس شروع کیا، سورہ حجرات کی آیت "ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" تک پہونچے تھے کہ یہ سلسلہ بھی آپ کے سلسلہ حیات کے ساتھ ختم ہوا، آپ کی وفات کے بعد آپ کے نواسہ (جو کلیۃً آپ ہی کے تربیت یافتہ اور آپ کے صحیح جانشین تھے) شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ نے درس شروع کیا۔

حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ کا درس قرآن ہر ہفتہ شنبہ و جمعہ کے روز ہوتا تھا جس میں خواص بطریق خاص اور عوام بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے اس درس میں آپ کی طبیعت اپنے پورے جوش پر ہوتی تھی اور مضامین کی آمد سیل رواں کی طرح[1]، اس درس سے دار السلطنت دہلی میں (جو علماء و فضلاء کا بھی مرکز تھا) قرآن مجید کا ذوق عام ہوا، اصلاح عقائد کی ایک طاقتور رو چلی اور ترجمۂ قرآن اور درس تفسیر کا وہ مبارک سلسلہ شروع ہوا جو اس وقت تک اس برصغیر میں جاری ہے اور جس سے لاکھوں انسانوں کی اصلاح ہوئی اور ان کے دل و دماغ حلاوتِ توحید اور لذت قرآن سے آشنا ہوئے، خود مدارس عربیہ میں اسی درس کے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ علماء کے اثر سے متنِ قرآن کے درس و افہام و تفہیم کا سلسلہ شروع ہوا جس کو نصاب درس میں مختصر تفسیر[2] کی شکل میں تبرکاً جگہ دی گئی تھی، اور علمائے دنیا کا پھیلایا ہوا یہ طلسم ٹوٹا کہ قرآن مجید کی اشاعت عوام میں بڑے دینی خطرات بلکہ ضلالت کا پیش خیمہ ہے، اس میں یہ مخفی اندیشہ کام کر رہا تھا کہ عوام ان پیشہ ور علماء کے ہاتھ سے نکل جائیں گے، جنھوں نے قرآن کو چیستان بنا رکھا تھا، اور عوام کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کی تھی۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا دوسرا علمی و اصلاحی کارنامہ تفسیر "فتح العزیز" کی شکل میں ہے، جسے "تفسیر عزیزی" اور "بستان التفاسیر" کا نام بھی دیا گیا ہے، یہ شاہ صاحبؒ کی باقاعدہ املائی ہوئی مستقل تصنیف ہے، خود شاہ صاحبؒ کی تصریح کے مطابق وہ سورۃ الفاتحہ، سورۃ البقرہ، پھر سورۃ الملک، آخر قرآن تک ہے[3]، لیکن سورۂ بقرہ مکمل نہیں ہو سکی (جس کے اسباب معلوم نہیں ہو سکے) صرف ربع پارۂ دوم کے قریب تک آیت "اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ" تک طبع ہو سکی، اصل فارسی تفسیر کے

---

[1] ملاحظہ ہو ملفوظات حضرت شاہ عبد العزیزؒ ص ۱
[2] قدیم درس میں جلالین کامل اور بیضاوی شریف (سورۂ بقرہ) ہوتی تھی، پورے متن قرآن کے ترجمہ و تفسیر کا رواج نہ تھا۔
[3] مقدمہ تفسیر "فتح العزیز" از حضرت شاہ عبد العزیزؒ ص ۳، مقدمہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس تصنیف کا سلسلہ برادر بزرگ مولانا محمد بن شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تحریک و تقاضے سے ۱۲۰۸ھ میں شروع کیا گیا۔

متعدد ایڈیشن شائع ہوئے ہیں، کتاب تین جلدوں میں ہے، پہلی جلد سورۂ فاتحہ سے لے کر پارۂ دوم کے ربع کے قریب تک ہے، دوسری جلد سورۃ الملک (انتیسویں پارے) سے لے کر آخر سورۃ المرسلات تک ہے، تیسری جلد سورۂ "عَمَّ یَتَسَاءَلُونَ" (سورۂ نباء) سے شروع ہو کر آخر قرآن مجید یعنی سورۃ الناس کے ختم تک ہے۔

شاہ صاحب کے بعد ان کے شاگرد رشید علامہ حیدر علی فیض آبادی (م ۱۲۹۹ھ) صاحب "منتہی الکلام" نے اس کا تکملہ لکھا، صاحب "مقالات طریقت" لکھتے ہیں کہ: "مولوی حیدر علی صاحب "منتہی الکلام" نے حسب خواہش سکندر بیگم والی بھوپال تفسیر "فتح العزیز" کا تکملہ ستائیس جلدوں میں کیا، راقم نے دیکھا ہے"[1]۔

یہ تکملہ صرف پانچویں پارہ کے اختتام تک کتب خانہ ندوۃ العلماء میں محفوظ ملتا ہے، ابتدا کے ایک دو ورق نہیں ہیں۔

ایک کتاب (اردو میں) "تفسیر عزیزی" المعروف بوعظ عزیزی کے نام سے مطبع انصاری دہلی کی چھپی ہوئی بھی ملتی ہے جس میں اس کے مرتب ابو الفرید محمد امام الدین صاحب کی تصریح کے مطابق شاہ صاحب کا درس قرآن و حدیث (جو ہر سہ شنبہ اور جمعہ کو ہوتا تھا) قلمبند کر کے پیش کیا گیا ہے، یہ ۱۲۵۹ھ کی تالیف ہے اور سورۃ المومنون سے سورۃ الصافات تک ہے۔

لیکن اس عدم تکمیل کے باوجود اس تفسیر میں بہت سے ایسے نکات و تحقیقات ہیں جو بہت سی مشہور تفاسیر میں نہیں ملتیں، شاہ صاحب کے درس تفسیر اور آپ کی کتاب تفسیر فتح العزیز میں ان مسائل پر خاص طور پر محققانہ کلام کیا گیا ہے، جن کے بارے میں اس وقت کے علماء نے تحقیق و صاف بیانی سے کام نہیں لیا تھا، اور اس کی وجہ سے عوام کی ایک بڑی تعداد فساد عقیدہ اور مشرکانہ اعمال تک میں گرفتار تھی، مثلاً آیت "وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ" کی تفسیر جو اس کتاب کے خصوصی مقامات میں سے ہے، اسی طرح سحر کی بحث (وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ الخ کے ذیل میں)

---

[1] مقالات طریقت ص ۳۳

اور بعض دوسری آیات کے سلسلہ میں تحقیقات نادرہ اس کتاب کی خصوصیات میں سے ہیں۔

حدیث کی تدریس و ترویج

جہاں تک درس حدیث اور اس کی ترویج و اشاعت کا تعلق ہے ہندوستان کی علمی و دینی تاریخ میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے آپ کے درس حدیث کی مدت تقریباً چونسٹھ سال کی ہے اس مدت میں آپ نے نہ صرف صحاح کا درس دیا اور بستان المحدثین العجالۃ النافعہ جیسی مفید تصنیفیں کیں جو حدیث کا صحیح ذوق، طبقات حدیث سے واقفیت اور محدثین کا مرتبہ شناس بنانے اور اصول سے واقف کرانے [illegible] بن گیا سیکڑوں صفحات کا عطر آ گیا ہے آپ نے حدیث کے ایسے اساتذہ کا [illegible] پیدا کیے جنھوں نے ہندوستان ہی میں نہیں حجاز میں بھی درس حدیث کا فیض عام کیا اور ایک عالم کو مستفید کیے ان باکمال تلامذہ کی تعداد جن کے تراجم حضرت "نزہۃ الخواطر" کی جلد ہفتم میں موجود ہیں چونسٹھ ہے، ان میں ان کے وہ حضرات جن سے حدیث کے درس کے حلقے قائم ہوئے اور انھوں نے حدیث کے دوسرے شیوخ و اساتذہ پیدا کیے، حسب ذیل ہیں:-

مولانا شاہ محمد اسحٰق دہلوی، مولانا شاہ محمد یعقوب دہلوی، مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، مولانا سید اولاد حسن قنوجی، مرزا حسن علی شافعی لکھنوی، مولانا حسین احمد ملیح آبادی محدث، مولانا حیدر علی ٹونکی، مولانا خرم علی بلہوری، مفتی صدر الدین دہلوی، مولانا مفتی علی کبیر مچھلی شہری، مولانا سید قطب الہدیٰ حسنی رائے بریلوی۔

ان کے علاوہ جن لوگوں نے آپ سے حدیث کی سند لی ان کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اس کا استقصاء مشکل ہے یہاں ان چند حضرات کے نام لکھے جاتے ہیں جو اپنے بعض دوسرے کمالات یا سلسلۂ طریقت یا شہرت کے لحاظ سے امتیاز خاص رکھتے ہیں:-

حضرت شاہ غلام علی دہلوی (خلیفہ اعظم حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ)

حضرت شاہ ابو سعید دہلوی (خلیفہ حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ)

حضرت شاہ احمد سعید دہلوی (خلیفہ حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ)

حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ (خلیفہ حضرت شاہ محمد آفاق دہلوی)

مولانا بزرگ علی مارہروی (استاد مفتی عنایت احمد صاحب کاکوروی)

شاہ بشارت اللہ بہرائچی (مجددی سلسلہ کے ایک بڑے شیخ)

شاہ پناہ عطا سلونوی (سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے ایک بڑے شیخ جن کو مکاتبۃً اجازت حاصل تھی)

شیخ ظہور الحق پھلواروی۔

ان تلامذۂ حدیث اور تربیت یافتہ شیوخ میں حدیث کی سب سے بڑی اشاعت حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کے ذریعہ ہوئی جنھوں نے ۱۲۵۸ھ میں مکہ معظمہ ہجرت کی اور ان سے حجاز کے ممتاز ترین علماء نے حدیث کی سند لی۔

آپ کے تلامذہ میں مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی معروف بہ میاں صاحب، قاری عبدالرحمٰن صاحب، پانی پتی، مولانا سید عالم علی مرادآبادی، مولانا مفتی عبدالقیوم ابن مولانا عبدالحی بڑھانوی (خلیفۂ اجل حضرت سید احمد شہیدؒ) حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ، نواب قطب الدین دہلوی (مصنف مظاہر حق) مولانا احمد علی سہارنپوری (محشی و ناشر صحیح بخاری) مفتی عنایت احمد کاکوروی (استاد الاساتذہ العلماء مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی) اور بہت سے علماء ہیں جن کی فہرست طویل ہے، بقول صاحب "نزہۃ الخواطر" ہندوستان میں یہی سند حدیث باقی رہی۔

حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ کے تلامذہ میں تنہا مولانا سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی (م ۱۳۲۰ھ) نے دہلی میں سالہا سال حدیث کا درس دیا اور آپ کے درس سے متعدد جلیل القدر ناشرین و شارحین حدیث پیدا ہوئے، جن میں مولانا عبدالمنان وزیرآبادی (جن کے کثیر التعداد تلامذہ پنجاب میں مصروف درس و افادہ تھے) عارف باللہ سید عبداللہ غزنوی امرتسری اور ان کے

فرزند جلیل مولانا سید عبد الجبار غزنوی امرتسری (والد مولانا سید داؤد غزنوی) مولانا شمس الحق ڈیانوی مصنف غایۃ المقصود، مولانا محمد حسین بٹالوی، مولانا غلام رسول قلعوی، مولانا محمد بشیر سہسوانی، مولانا امیر احمد سہسوانی، مولانا حافظ عبد اللہ غازیپوری ابو محمد مولانا ابراہیم آروی صاحب طریق النجاۃ، مولانا سید امیر علی ملیح آبادی، مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری صاحب تحفۃ الاحوذی، (اور علمائے عرب میں سے) شیخ عبد اللہ بن ادریس الحسنی السنوسی، شیخ محمد بن ناصر النجدی، شیخ سعد بن احمد بن عتیق النجدی، کے نام اس درس کی وسعت وافادیت کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔

حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب کے تلامذہ میں حضرت شاہ عبد الغنی مہاجر مدنی (م ۱۲۹۶ھ) بھی شامل ہیں، جن سے ہندوستان کے کبار علماء و اساتذۂ حدیث کو شرف تلمذ حاصل ہے، اور ان کے ذریعہ سارا ہندوستان حدیث کے نور سے منور اور معمور ہوگیا، اور اس وقت کے سارے حلقہائے درس اور مدارس عربیہ انھیں سے شرف انتساب رکھتے ہیں، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (بانی دار العلوم دیوبند) ان کے نامور تلامذہ میں سے ہیں، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے تلامذہ کبار میں مولانا محمد یحیٰی کاندھلویؒ، اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ صاحب بذل المجہود کا نام لینا کافی ہے، مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کے تلامذہ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی مصنف اوجز المسالک وغیرہ کا نام لینا کافی ہے، مولانا محمد قاسم صاحب کے تلامذہ میں مولانا سید احمد حسن امروہی اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اور ان کے تلامذہ میں مولانا سید انور شاہ کشمیری اور مولانا سید حسین احمد مدنی کا نام اور کام محتاج تعارف نہیں، شاہ صاحبؒ

کے علو اسناد، عموم فیض اور بلند مرتبہ کے لئے ان کے شاگرد رشید مولانا محسن بن یحییٰ ترہتی کی مشہور کتاب "الیانع الجنی فی أسانید الشیخ عبد الغنی" کا مطالعہ معلومات افزا و بصیرت افروز ہے۔

نصرتِ سنّت وردِّ شیعہ

جہاں تک فتنہ رفض و تشیّع کے مقابلہ اور اس کے اثر سے اہل سنت کو محفوظ رکھنے کے کارنامہ کا تعلق ہے، اور جس کی ابتدا حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اپنی بے نظیر کتاب "ازالۃ الخفاء" سے کی تھی، اس کی تکمیل اور تقویت حضرت شاہ عبد العزیزؒ نے اپنی نادرۂ روزگار تصنیف "تحفۂ اثنا عشریہ" سے کی، جو ان کتابوں میں ہے، جن کو ——— تاریخ ساز کہا جا سکتا ہے، اور جس طرح ملا محب اللہ بہاری کی تصانیف "سلّم العلوم" اور "مسلّم الثبوت" نے تقریباً سو برس تک علمائے ہند کو اپنی شرح و تحشیہ میں مشغول رکھا، اور ان کی بہترین ذہانتوں اور توانائیوں کو مرکوز کر لیا[1]، اسی طرح اس کتاب کے جواب نے ممتاز ترین شیعہ علماء کو تصنیف و تالیف میں مشغول کر دیا، تنہا عبقات جس کا پورا نام "عبقات الانوار فی إمامة الأئمة الأطهار"[2] ہے، اور جس کے مصنف مولوی سید حامد حسین صاحب کنتوری (م ۱۳۰۶ھ) ہیں، آٹھ جلدوں میں لکھی گئی،

---

[1] مولانا حکیم سید عبد الحیٔ صاحبؒ کی کتاب "الثقافة الاسلامية فی الهند" مطبوعہ مجمع اللغۃ العربیہ دمشق اور اس کے اردو ترجمہ "اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں" مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ سے ان شروح و حواشی کی حیرت خیز تعداد معلوم ہو سکتی ہے، جو ان دونوں کتابوں بالخصوص سلّم کی شرح میں لکھی گئیں۔ [2] کتاب کے متعدد اجزاء لکھنؤ و لدھیانہ کے مختلف مطابع میں شائع ہوئے ہیں۔

اس کتاب کی ضخامت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کی جلد اول ۱۲۵۱ صفحات میں، جلد دوم ۹۷۷ صفحات میں، سوم ۶۰۹ صفحات میں، چہارم ۳۹۹ صفحات میں، پنجم ۵۴۷ صفحات میں، ششم کل صفحات ۴۰۷، بقیہ حصص علیٰ ہذا القیاس ـــــــــ پوری کتاب ۳۰ حصوں میں ہے، مصنف کے فرزند مولوی سید ناصر حسین صاحب نے کتاب کی تکمیل کی، کتاب نجوم السماء سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی سید حامد حسین صاحب کے علاوہ مولوی دلدار علی صاحب مجتہد اول، حکیم مرزا محمد کامل دہلوی، مفتی محمد قلی خاں کنتوری، اور سلطان العلماء سید محمد صاحب نے بھی اس کتاب کی تردید میں اور اس کے اثر کو زائل کرنے کے لئے ضخیم کتابیں تصنیف کیں، یہ سلسلہ مرزا ہادی رسوا لکھنوی پر جا کر ختم ہوا، جو ادب و فلسفہ کے میدان کے آدمی تھے، لیکن انھوں نے بھی اس کار خیر میں حصہ لینے کی کوشش کی۔

تدریسی مشغولیت وانہماک، درس تفسیر و حدیث، اشاعت کتاب و سنت، بیعت و ارشاد و تربیت مریدین، افتاء و فصل خصومات کی ہوش رُبا مشغولیت میں اور مختلف عوارض و امراض کی موجودگی میں شاہ صاحبؒ کو اس مسئلہ کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونے کا خیال اور ایک ایسی کتاب تصنیف کرنے کی فرصت کیسے ہوئی جس کے لئے بیسیوں کتابوں اور ہزاروں صفحات کا مطالعہ اور ذہنی یکسوئی اور توجہ کامل ضروری تھی؟ اس کا اندازہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ بارہویں صدی ہجری کے وسط و آخر (اٹھارویں صدی کے نصف آخر کی) ہندوستان بالخصوص شمالی ہند، دہلی اور اس کے اطراف، اور اودھ، بہار و بنگال کے مسلم معاشرہ و تمدن کی صورت حال پر گہری نظر نہ ہو اور اس ذہنی انتشار، دینی تشکیک اور مسلمان خاندانوں بالخصوص شرفاء، اہل حکومت اور صاحبِ اثر طبقہ پر تشیّع کے اثرات اور اس کے اقدامی و جارحانہ رویّہ سے واقفیت نہ ہو، اس کا اندازہ وہ شخص نہیں کر سکتا جس نے ہمایوں کے

ایران سے واپس آنے کے بعد سے فرخ سیر اور اس کے بعد تک کے سیاسی و انتظامی انقلابات ایرانی النسل امراء و علماء کے اثر و نفوذ، سید برادران (حسن علی خاں اور حسین علی خاں) کے دربار دہلی پر اثر و رسوخ، پھر دہلی میں نواب نجف علی خاں کے تسلط کی تفصیلات[1]، نیز اودھ میں نواب ابوالمنصور خاں صفدر جنگ نیشاپوری کے خاندان کی حکومت قائم ہو جانے اور شجاع الدولہ کے بعد سے شیعیت کے اثرات کا جائزہ نہ لیا ہو، اس کا کسی قدر اندازہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے اس بیان سے ہو سکتا ہے، جو تحفہ کے مقدمہ میں ان کے محتاط قلم سے نکلا ہے، وہ فرماتے ہیں:۔

"اس ملک میں جس میں ہم سکونت پذیر ہیں، اور اس زمانہ میں جو ہمارے حصہ میں آیا ہے، مذہب اثنا عشری کا رواج اور اس کے شیوع کی نوبت اس حد تک آ گئی ہے کہ (سنیوں کے) کم گھر ہوں گے جن میں ایک دو شخص اس گھر کے اس مذہب کے پیرو، اور اس عقیدہ کی طرف راغب نہ ہوں، ان میں سے اکثر علم تاریخ و اخبار سے بے خبر اور اپنے اسلاف کے حالات و اصول سے ناواقف اور غافل نظر آتے ہیں، جب مجالس اور محافل میں اہل سنت والجماعت کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں تو کچھ بیانی

---

[1] نواب نجف علی خاں کا دہلی پر مکمل تسلط و اقتدار تھا، اور وہ کھل کر تشیع کے حامی اور اہل سنت کے مخالف تھے ان کی تعدی کے متعدد واقعات مشہور ہیں، جو خواہ کلیۃً صحیح نہ ہوں اور ان میں مبالغہ یا تعصب سے کام لیا گیا ہو مگر ان کی کچھ اصل ضرور ہے، غالباً اس تعدی سے بچنے کے لئے، شاہ صاحبؒ نے تحفہ کی تصنیف کی نسبت اپنے مشہور نام کے بجائے اپنے تاریخی نام "غلام حلیم" کی طرف کی ہے، اور سرورق پر حسب ذیل عبارت ہے۔

"مصنفہ عالم باعمل فاضل اکمل حافظ غلام حلیم ابن شیخ قطب الدین احمد بن شیخ ابوالفیض دہلوی قدس سرہم" کتاب کا جواب لکھنے والوں نے جہاں مصنف کا حوالہ دیا ہے، وہاں "فاضل عزیز" کے لقب سے یاد کیا ہے۔

اور غلط مبحث سے کام لیتے ہیں، اس غرض کے لئے حسبۃً للہ تعالیٰ یہ رسالہ ترتیب دیا گیا تاکہ بحث و مناظرہ کے وقت اس مذہب کے پیرو پٹری سے اترنے نہ پائیں، اور خود اپنے اصول کے منکر نہ ہوں، اور ان بعض امور میں جو حقیقت پر مبنی ہیں، شک و تردد کو راہ نہ دیں۔[1]"

شاہ صاحبؒ نے اس کتاب میں ان مناظرانہ اور متکلمانہ کتابوں اور اسلوب کی پیروی نہیں کی، جو کسی مخالف فرقہ کی تردید و ابطال میں لکھی جاتی ہیں، اور ان کی خاص زبان ہوتی ہے، اولاً اس کتاب میں مذہب تشیع کے پیدا ہونے اور اس کے مختلف فرقوں میں تقسیم ہونے کا بیان ہے، اسی طرح فرقۂ شیعہ کے اسلاف علماء اور ان کی کتابوں کا تعارف ہے، پھر خلافت کی بحث اور مطاعن صحابہؓ اور ان کے جوابات پر اکتفا کرنے کے بجائے اصولی مسائل، الٰہیات، نبوت، معاد، اور امامت پر مستقل ابواب تحریر کئے گئے ہیں، پھر خلفائے ثلاثہؓ اور حضرت ام المؤمنین حضرت عائشہؓ اور دوسرے صحابہؓ پر شیعوں کی طرف سے جو اعتراضات اور قدح کی گئی ہے، ان کا مفصل جواب ہے، پھر مذہب شیعہ کے خواص، ان کے اوہام و تعصبات پر کلام کیا گیا ہے، اور ان کی غلطیوں اور غلط فہمیوں پر تبصرہ ہے، آخری باب (دوازدہم) تولا و تبرا پر مشتمل ہے، جو دس مقدمات پر مبنی ہے، کتاب بڑی تقطیع اور باریک طباعت میں ۴۰۰ صفحات میں آئی ہے۔

دوسری خصوصیت زبان کی حلاوت و سلاست اور برجستگی ہے، جس کا اعتراف ہندوستان اور ایران کے متعدد شیعہ علماء نے بھی کیا ہے، خود نام سے اس طرز فکر اور قصد و ارادہ کا اظہار ہوتا ہے، جو اس کتاب کی تصنیف کا محرک ہوا ہے، اس کے مقابلہ میں

---

[1] تحفہ اثنا عشریہ ص۲ مطبوعہ مطبع نولکشور، لکھنؤ ۱۳۲۵ھ

جو کتابیں لکھی گئیں، ان کے ناموں سے اکثر غضب و اشتعال کا اظہار ہوتا ہے اور سیف و سناں کی چمک ظاہر ہوتی ہے، مثلاً ایک کتاب کا نام "صوارم الإلٰہیات" ہے ایک کا "حسام الإسلام" ایک کا "سیف ناصری" ایک کا "ذوالفقار"۔

اس عہد میں اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس کتاب کی تصنیف نے جو وقت کی ایک ضرورت تھی، کیا خدمت انجام دی، راقم نے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی سابق صدر الصدور امور مذہبی ریاست حیدرآباد سے (جن کا خاندان حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور ان کے خلفاء سے وابستہ رہا ہے) خود سنا کہ "اس کتاب کی تصنیف نے شیعیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے مقابلہ میں ایک مضبوط پُشتہ کا کام کیا" یہ کتاب شاہ صاحبؒ کی زندگی میں ۱۲۱۵ھ میں طبع ہو کر مشہور ہو گئی تھی[1] اور اس کے جوابات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، شاہ صاحبؒ کے ایک فاضل شاگرد مولوی اسلمی مدراسی نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا، راقم نے یہ ترجمہ شیخ الاسلام عارف حکمت بے کے کتب خانہ واقع باب جبریل مدینہ طیبہ میں دیکھا ہے۔

انگریزی اقتدار کی مخالفت اور مسلمانوں کا مِلّی تحفّظ

جہاں تک ہندوستان میں اسلامی اقتدار کی حفاظت اور مسلمانوں کی آزادی کی راہ میں پیش آنے والے خطرے اور چیلنج کے مقابلہ کا تعلق ہے، شاہ صاحبؒ نے اس سلسلہ میں حالات کے اس حقیقت پسندانہ جائزہ، بیدار مغزی، دور بینی اور شان عزیمت کا نمونہ پیش کیا، جو ایک صاحبِ بصیرت و فراست عالم دین، داعی و مصلح، اور اپنے وقت کے دینی رہنما کے

---

[1] مقالات طریقت صـ۲۳

شایانِ شان ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے زمانہ میں وقت کا سب سے بڑا مسئلہ مرہٹوں کی تاخت اور ان کی اس فوج کشی وغارت گری کو روکنا تھا، جو ایک روز مرہ کا واقعہ بن گیا تھا، اور جس سے ایک طرف سلطنتِ مغلیہ بے بس، بے اثر اور ذلیل ہو رہی تھی، دوسری طرف مسلمانوں کی عزت وناموس محفوظ نہیں رہے اور شہروں کی معمول کے مطابق زندگی باقی نہیں رہی تھی، اس وقت اس خطرہ کو دور کرنا، اور اس کو روکنے کے لئے کسی امکانی امداد کو حاصل کرنا ایسا ہی تھا جیسے کسی گھر یا محلہ میں آگ لگنے کے وقت آگ بجھانے والے انجن و دستہ FIRE BRIGADE کو طلب کیا جاتا ہے، اور شاہ صاحبؒ کی نظر میں احمد شاہ ابدالی اور اس کی فوج کی یہی حقیقت تھی، اور ان سے یہی شرط ہو گئی تھی کہ اس آگ کو بجھانے کے بعد واپس چلے جائیں گے، شاہ صاحبؒ کی نظر میں یہ سلطنتِ مغلیہ کو سنبھلنے کا موقع دینے کے لئے اور کسی بہتر نظام کو اس کی جگہ لینے کے لئے (اگر اس کے بغیر چارہ نہیں ہے) ایک عارضی انتظام اور تدبیر کے درجہ کی چیز تھی، جو اس وقت کے مغل تاجدار شاہ عالم کی دوں ہمتی اور کوتاہ نظری کی وجہ سے کامیاب نہیں ہو سکی، اس وقت تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان کی زمامِ اقتدار سنبھالنے، پھر اس وسیع ملک پر سات سمندر پار کی ایک ملک کی حکومت قائم ہو جانے کے وہ آثار ظاہر نہیں ہوئے تھے، جو شاہ صاحبؒ کی توجہ کو پورے طور پر اس پر مرکوز کر دیتے۔

لیکن شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد ہندوستان کے حالات تیزی سے بدلے ۱۱۷۹ھ / ۱۷۶۵ء میں (شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی وفات کے تین سال بعد) بنگال، بہار، اڑیسہ تینوں صوبوں کی دیوانی بلا شرکتِ غیرے بطور "التمغا" (انعامی یا عطا شدہ جاگیر کی سند) سرکار کمپنی کو دی جا چکی تھی، سرکار بنارس اور غازی پور بطور جاگیر کمپنی کو مل چکے تھے، اب

خاندان تیموریہ کے بادشاہ شاہ عالم کے پاس ملک میں صرف ایک صوبہ الہ آباد تھا اور آمدنی میں وہ روپیہ تھا جو انگریز اس کو دیتے تھے، ۸ مارچ ۱۷۸۸ء (۱۲۰۲ھ) میں کلکتہ گزٹ میں شہر کیا گیا کہ "مسلمانوں کی سلطنت تو نہایت حقیر و ذلیل ہو گئی ہے، ہندوؤں سے ہم کو کچھ خوف نہیں ہے" ۱۷۵۷ء میں انگریزوں نے پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ کو اور ۲۳ اکتوبر ۱۷۶۴ء (۱۱۷۸ھ) میں بکسر کے میدان میں شجاع الدولہ کو شکست دی، ۱۷۹۹ء (۱۲۱۴ھ) میں سلطان شہید سلطان ٹیپو نے سرنگاپٹن کے میدان میں شہادت حاصل کی، اور گویا ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار کی قسمت پر مہر لگ گئی، سلطان شہید کی نعش دیکھ کر جنرل ہارس HARRIS نے بجا طور پر کہا کہ "آج ہندوستان ہمارا ہے"[1]

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے جو دہلی میں مصروف درس و افادہ تھے، لیکن ان کی حقیقت بین نگاہ سارے ہندوستان پر تھی، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی طور پر حقیقت پسند ذہن اور صاحب حمیت و عزیمت طبیعت عطا فرمائی تھی، اس انقلاب کا پورا جائزہ لیا اور اس نتیجہ تک پہونچ گئے کہ اس وقت بچے کھچے اسلامی اقتدار اور اس ملک میں مسلمانوں کے مستقبل کے لئے خطرہ انگریز ہیں، ان کے ایک عربی شعر میں اس حقیقت کی پوری عکاسی ہے، اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزوں کے اثرات کو ہندوستان ہی تک محدود نہیں سمجھتے تھے، ان کو اس سے زیادہ وسیع اور دور رس سمجھ رہے تھے، وہ فرماتے ہیں:-

وإني أرى الإفرنج أصحاب ثروة　　لقد أفسدوا ما بين دهلي وكابل

(میں فرنگیوں کو جو دولت کے مالک ہیں دیکھتا ہوں کہ انھوں نے دہلی اور کابل کے درمیان فساد برپا کر رکھا ہے)

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ سلطنت خداداد میسور از محمود خاں محمود بنگلوری ص ۲۶۶

ہمارے علم میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس وقت ہندوستان کو دارالحرب قرار دینے کی جرءت کی، اور صورت حال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے ہوئے فقہ و اصول فقہ کی روشنی میں مسئلہ کی ایسی تنقیح کی جس سے ان کی بصیرت کا بھی اظہار ہوتا ہے اور اخلاقی و دینی جرءت کا بھی، فتاویٰ عزیزی جلداول میں اس سوال کے جواب میں کہ دارالاسلام دارالحرب ہوسکتا ہے یا نہیں؟ "دُرِّ مختار" کی ایک طویل عبارت نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"اس شہر (دہلی) میں امام المسلمین کا حکم اصلاً جاری نہیں ہے نصرانی حکام کا حکم بے دغدغہ جاری ہے فقہا جس کو اجرائے احکام کفر کہتے ہیں، اس سے مراد یہ ہے کہ ملک داری کے معاملہ، رعایا کے بندوبست، خراج و باج، اور اموال تجارت کے عشور کے وصول کرنے، ڈاکوؤں، چوروں کو سزا دینے فصلِ خصومات اور جرائم کی تعزیر میں کفار بطور خود حاکم و مختار ہوں، اگر بعض اسلامی احکام جیسے جمعہ اور عیدین، اذان و ذبح بقر سے وہ تعرض نہ کرتے ہوں لیکن اصل الاصول یہی ہے کہ یہ چیزیں ان کے رحم و کرم پر ہوں، ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مساجد کو بے تکلف منہدم کر دیتے ہیں، کوئی مسلمان، یا (غیر مسلم) ذمّی ان کی اجازت کے بغیر اس شہر اور اس کے نواح میں داخل نہیں ہوسکتا، اپنی منفعت کے لئے وہ باہر سے آنے والوں، مسافروں، اور سوداگروں کو منع نہیں کرتے لیکن دوسرے ذی وجاہت لوگ مثلاً شجاع الملک، ولایتی بیگم بغیر ان کے حکم کے ان شہروں میں داخل نہیں ہوسکتے، اس شہر دہلی سے کلکتہ تک نصاریٰ کی عملداری پھیلی ہوئی ہے، ہاں دائیں بائیں مثلاً حیدرآباد، لکھنؤ اور رام پور میں انھوں نے اپنے احکام جاری نہیں کئے ہیں،

کچھ تو اپنے مصالح کی بنا پر اور کچھ ان ریاستوں کے حکام کے ان کی اطاعت قبول کرلینے کی بنا پر۔[۱]

حضرت شاہ صاحبؒ کے خیالات کا، اور وہ انگریزوں کو جس نظر سے دیکھتے تھے، پورا عکس ان کے جلیل القدر خلیفہ اور تربیت یافتہ داعی و مصلح حضرت سید احمد شہیدؒ کے خیالات وجذبات میں پایا جاتا ہے، جن کی صاف جھلک آپ کے خطوط میں نظر آتی ہے، جو آپ نے اس وقت ہندوستان کے بعض ذی اثر وصاحبِ حکومت رؤسا، اور بعض غیر ملکی مسلمان اہل حکومت کو لکھے ہیں، شاہ سلیمان والیِ چترال کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

قضارا از مدت چند سال حکومت	تقدیر سے چند سال سے ہندوستان
وسلطنت ایں ملک برایں عنوان	کی حکومت وسلطنت کا یہ حال
گردیدہ کہ نصارا نکوہیدہ خصال	ہوگیا ہے کہ عیسائیوں اور مشرکین
ومشرکین بدمآل بر اکثر بلاد ہند استیلاً	نے ہندوستان کے اکثر حصہ پر
یافتند وآں دیار را بہ ظلمات ظلم وبیداد	غلبہ حاصل کرلیا ہے، اور ظلم وبیداد
مشحون ساختند۔[۲]	شروع کردی ہے۔

اس سے زیادہ واضح الفاظ میں ہندو راؤ وزیر گوالیار کو لکھتے ہیں:۔

برائے سامی روشن ومبرہن است کہ	جناب کو خوب معلوم ہے کہ یہ پردیسی
بیگانگان بعید الوطن، ملوک زمین	سمندر پار کے رہنے والے، دنیا
وزمن گردیدہ، وتاجران متاع فروش	جہاں کے تاجدار اور یہ سودا

۱؎ فتاویٰ عزیزی جلد اول مطبوعہ مطبع مجتبائی، دہلی ص۱۱۲ ۲؎ سیرت سید احمد شہید حصہ اول ص۳۸۹

بہ پایۂ سلطنت رسیده، امارت	پہنچنے والے سلطنت کے مالک بن گئے
امرائے کبار و ریاست رؤسائے عالی	ہیں، بڑے بڑے اہل حکومت کی
مقدار برباد نموده اند، و عزت	حکومت اور ان کی عزت و حرمت
و اعتبار ایشاں بالکل ربوده.[1]	کو انھوں نے خاک میں ملا دیا ہے.

غلام حیدر خاں کے نام لکھتے ہیں، جو گوالیار کے ایک فوجی افسر تھے :-

اکثر بلاد ہندوستان بدست	ملکِ ہندوستان کا بڑا حصہ غیر ملکیوں
بیگانگان افتاده و ایشاں ہر جا بنائے	کے قبضہ میں چلا گیا ہے، اور انھوں نے
و آئین جور و ظلم نہاده، ریاست	ہر جگہ ظلم و زیادتی پر کمر باندھ لی
رؤسائے ہندوستان برباد رفتہ.[2]	ہے، ہندوستان کے حاکموں کی
	حکومت برباد ہو گئی.

سید صاحبؒ کے اس خط سے جو انھوں نے شہزادہ کامران کو لکھا ہے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس جہاد سے آپ کا مقصود اصلی ہندوستان تھا، جو بتدریج انگریزوں کے قبضہ میں چلا جا رہا تھا، خط میں تحریر فرماتے ہیں :-

باز خود ایں جانب معہ مجاہدین صادقین	اس مہم (سرحد و پنجاب) سے
بہ سمت بلاد ہندوستان بنا بر	فراغت کے بعد یہ خاکسار مع مجاہدین
ازالۂ کفر و طغیان متوجہ خواہد شد،	صادقین کفر و طغیان کے ازالہ کی
کہ مقصود اصلی خود ہندوستان	نیت سے ملک ہندوستان کی طرف
است.[3]	متوجہ ہو گا کہ وہی مقصود اصلی ہے.

---

[1] سیرت سید احمد شہیدؒ حصہ اول ص ۳۸۹-۳۹۰ [2] ایضاً ص ۳۹۰ [3] ایضاً

اس کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ سید صاحبؒ ۱۲۲۷ھ میں (حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی وفات سے بارہ سال پہلے) امیر خاں کے لشکر میں تشریف لے گئے[1]، جو اس وقت انگریزوں سے برسرپیکار تھے اُن کے ساتھ ہندوستان کا بہترین فوجی عنصر، مسلمانوں کا گرم و تازہ خون، ہندوستان کی فاتح طاقت کا بچا کھچا سرمایہ، اور وقت کے بہت سے شاہین و شہباز تھے، یہ ہندوستان میں ایک بڑھتی ہوئی آزاد طاقت تھی جس کو وقت کا کوئی مبصّر نظر انداز نہیں کر سکتا اور جس کو با مقصد اور منظّم بنا کر انگریزوں کی ابھرتی ہوئی طاقت کے مقابلہ میں لایا جا سکتا تھا، کہ ملکوں اور قوموں کی تاریخ میں ایسی حوصلہ مند طاقتوں نے اپنی عددی اور سلاحی کمزوری کے باوجود حالات کا رخ بدل دیا ہے، اس کا کوئی تحریری ثبوت ابھی تک نہیں ملا ہے، کہ حضرت سید صاحبؒ، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی صریح ہدایت اور حکم سے نواب امیر خاں کے لشکر میں تشریف لے گئے، لیکن اس کا قرینہ ضرور پایا جاتا ہے کہ یہ اقدام حضرت شاہ صاحبؒ کے ایماء پر یا کم سے کم تائید و پسندیدگی پر ہوا، اس لئے کہ ۱۲۳۳ھ میں جب نواب نے انگریزوں سے مصالحت کر لی اور راجپوتانہ اور مالوہ کے چند متفرق اور غیر اہم حصوں پر قناعت کر کے جن کے مجموعہ کا نام ریاست ٹونک تھا، انگریزوں سے جنگ کرنے سے علیحدگی اختیار کر لی، اور سید صاحبؒ نے اب ہاں مزید قیام بے سود سمجھا تو آپ نے علیحدگی کا فیصلہ فرمایا اور ایک خط حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کو لکھا جس کا مضمون تھا:۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہیدؒ" حصہ اول۔ امیر خاں مرحوم کو پنڈاروں سے جن کو انگریزی تاریخوں، اور ان سے متأثر مؤرخوں کی کتابوں میں ایک راہزن اور تخریبی گروہ کی حیثیت سے یاد کیا گیا ہے، کوئی تعلق نہ تھا، اصلیت صرف اتنی ہے کہ پنڈارے کبھی کبھی ان کی پناہ لے لیتے تھے، اور وہ ان کو فوری خطرہ سے بچا لیتے تھے۔

"خاکسار قدم بوسی کو حاضر ہوتا ہے، یہاں لشکر کا کارخانہ درہم برہم ہو گیا"
نواب صاحب انگریزوں سے مل گئے، اب یہاں رہنے کی کوئی صورت نہیں"[1]

اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یہ سفر شاہ صاحبؒ کے ایماء و مشورہ سے ہوا تھا، اس لئے واپسی پر آپ کو اس کی اطلاع دینی ضرور تھی۔

اس طرح شاہ صاحبؒ نے اس خطرہ کے پہچاننے میں جو مسلمانوں اور ہندوستان کو درپیش تھا، خداداد بصیرت اور مومنانہ فراست سے کام لیا، اور اس کے لئے وہ اپنے زمانہ میں جو تدبیر کر سکتے تھے اس میں کوئی کمی نہیں کی، ان کی یہی بصیرت اور جذبہ ان سے انتساب رکھنے والی جماعت مجاہدین (جس کی قیادت حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ صاحبؒ کے قابل فخر بھتیجے حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کر رہے تھے) میں پورے طور پر کارفرما نظر آتا ہے، اور جس کا پورا مظاہرہ مولانا ولایت علی عظیم آبادی، مولانا یحییٰ علی صادقپوری، مولانا احمد اللہ، و مولانا عبد اللہ صاحب کی انگریزوں کے خلاف سرحدی جنگوں، اور صادقین صادقپور کی عظیم قربانیوں میں جلوہ فگن ہے، جن کی نظیر ملنی مشکل ہے۔[2]

پھر یہ جذبہ اس جماعت سے ان علماء اور دینی قائدین کی طرف منتقل ہوا جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں اس کے لئے جان کی آخری بازی لگائی، اور جن میں مولانا احمد اللہ شاہ مدراسیؒ، مولانا لیاقت علی الہ آبادیؒ، حضرت حاجی امداد اللہ تھانویؒ اور حضرت حافظ ضامن شہیدؒ کے نام معروف و مشہور ہیں، اور اس کے بعد ان علماء کی طرف جنھوں نے اس شمع کو روشن رکھا اور ۱۹۴۷ء تک اس کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح جاری رکھا۔ ؏

---

[1] وقائع احمدی (قلمی) صفحہ نسخہ محفوظہ کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "کاروان ایمان و عزیمت" از صفحہ ۴۴ تا ۶۱

مردانِ کار کی تربیت

جہاں تک ان مردانِ کار کی تربیت کا تعلق ہے جو حالات اور وقت کے تقاضوں اور دین کے حقیقی مطالبوں کے مطابق دعوت و اصلاح کا کام انجام دیں اور جہد و جہاد کا بیڑہ اٹھائیں یہ تقدیر اور حکمت الٰہی کی بات ہے کہ اس میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا حصہ اپنے بہت سے مشائخ و اسلاف اور بعض ایسے حضرات سے بھی بڑھا ہوا ہے، جن کا درجہ ممکن ہے (اور قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں) کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان سے بڑھا ہوا ہو، شاہ صاحبؒ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ایسے متعدد عالی استعداد اور بلند ہمت و عزیمت رکھنے والے صاحبِ تاثیر نفوس کی تربیت کا کام لیا، جنھوں نے ہزاروں انسانوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیا، اور ایک پوری صدی سنبھال لی، شاہ صاحبؒ کے علم اور زندگی کے دریا کی سطح ساکن تھی، لیکن بقول اقبال ؎

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موجِ تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

حضرت سید احمد شہیدؒ

اس دعوے کے ثبوت کے لئے تنہا ان کے خلیفۂ ارشد حضرت سید احمد شہیدؒ (سنہ ۱۲۰۱ھ تا سنہ ۱۲۴۶ھ) کا نام لینا کافی ہے جنھوں نے اس تحنی برّ اعظم میں اس عظیم اسلامی تحریک کی رہنمائی کی جس کی نظیر جامعیت قوت تاثیر اور اسلام کی اولین دعوت اور

طریق نبوت سے قریب مماثلت میں نہ صرف تیرہویں صدی میں نظر نہیں آتی جو اس کا عہد ہے، بلکہ گزشتہ کئی صدیوں میں بھی اس جیسی ایمان آفریں تحریک، اور صادقین و مخلصین کی ایسی مربوط و منظم جماعت کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ وہ عقائد و اعمال کی تصحیح، افراد کی تربیت، وعظ و تبلیغ، اور جہاد و سرفروشی کے وسیع و طویل محاذ پر جس طرح سرگرم عمل رہے، اس کا اثر صرف ان کے میدان کارزار اور ان کی معاصر نسل تک محدود نہ رہا، بلکہ اس نے آئندہ نسل پر اپنے بعد آنے والے اہل حق، اصحاب دعوت اور دین کے علمبرداروں اور خادموں پر گہرے اور دیرپا نقوش چھوڑے، بڑھتے ہوئے انگریزی اقتدار کے مقابلہ ہندوستان اور اس کے پڑوسی مسلم ممالک کی حفاظت اور قیام حکومت اسلامیہ علی منہاج الخلافۃ الراشدہ کی جدوجہد کی ابتدا بھی آپ ہی نے کی، اس تحریک اور جدوجہد کی زمام قیادت ہندوستان میں اول اول اسی جماعت کے علما اور قائدین کے ہاتھ میں رہی، ہندوستان کے مختلف حصوں میں دینی کتابوں کی تصنیف و تالیف، اور ترجمہ اور نشر و اشاعت کی جدید تحریک (جس نے اس وسیع و عمیق خلیج کو پر کیا، جو مسلم عوام اور صحیح اسلامی تعلیمات اور کتاب و سنت کے درمیان پائی جاتی تھی) انھیں کی کوششوں کی رہین منت ہے، مسلمانوں کی دینی و سیاسی بیداری بالواسطہ اور بلاواسطہ اسی دعوت و تحریک کا نتیجہ اور ثمرہ ہے، اس تحریک کے اثرات علم و ادب، فکر اسلامی، اور زبان و اسالیب بیان پر بھی پڑے، اس نے اصلاح معاشرہ، جاہلی رسوم کے ابطال، ہندوانہ اثرات کے ازالہ اور صحیح اسلامی زندگی کی طرف بازگشت کا زبردست کام انجام دیا۔

سید صاحبؒ اور ان کی دعوت و تربیت کے اثرات کی وسعت، قوت اور گہرائی و گیرائی کا اندازہ کرنے کے لیے یہاں پر ہم چند اہل نظر کی تحریروں کے کچھ اقتباسات

پیش کرتے ہیں۔

ہندوستان کے شہرۂ آفاق مصنف و مؤرخ نواب سید صدیق حسن خاںؒ والیٔ بھوپال (م ۱۳۰۷ھ) جنھوں نے سید صاحبؒ کی تعلیم و تربیت کے اثرات کو خود دیکھا تھا، اور آپ کے دیکھنے والوں کی ایک بڑی جماعت کا زمانہ پایا تھا، اپنی تصنیف "تقصار جیود الاحرار" میں لکھتے ہیں:۔

"خلق خدا کی رہنمائی اور خدا کی طرف رجوع کرنے میں وہ خدا کی ایک نشانی تھے، ایک بڑی خلقت اور ایک دنیا آپ کی قلبی و جسمانی توجہ سے درجۂ ولایت کو پہونچی، آپ کے خلفاء کے مواعظ نے سرزمین ہند کو شرک و بدعت کے خس و خاشاک سے پاک کر دیا اور کتاب و سنت کی شاہراہ پر ڈال دیا، ابھی تک ان کے وعظ و پند کے برکات جاری و ساری ہیں۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"خلاصہ یہ کہ اس زمانہ میں دنیا کے کسی ملک میں بھی ایسا صاحب کمال سنا نہیں گیا اور جو فیوض اس گروہ حق سے خلق خدا کو پہونچے ان کا عُشر عَشیر بھی اس زمانہ کے علماء و مشائخ سے نہیں پہونچا۔"[۱]

علامۂ عصر استاد الاساتذہ حضرت مولانا حیدر علی رام پوری ٹونکی (م ۱۲۷۳ھ) تلمیذ حضرت شاہ عبد العزیز دہلویؒ "صیانۃ الناس" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ان کی ہدایت کا نور آفتاب کے مثل کمال زور و شور کے ساتھ بلاد و قلوب عجم میں منور ہوا، ہر ایک طرف سے سیدان ازلی رخت سفر باندھ کر منزلوں سے

---

[۱] تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار (فارسی) مطبوعہ بھوپال ۱۲۹۸ھ ص ۱۰۹-۱۱۰

آ آ کے شرک و بدعات وغیرہ منہیات سے (جن کے حسب عادت زمانہ خوگر ہو رہے تھے) توبہ کر کے توحید و سنت کی راہ راست اختیار کرنے لگے اور اکثر ملکوں میں خلفائے راست کردار جناب موصوف نے سیر فرما کر لاکھوں آدمی کو دین محمدیؐ کی راہ راست بتادی، جن کو سمجھ تھی، اور توفیق الٰہی نے ان کی دستگیری کی، وہ اس راہ پر چلے[1]"۔

ہندوستان کے ایک باخبر اور ثقہ عالم دین مولوی عبدالاحد صاحب جنھوں نے اس جماعت قدسیہ کے بہت سے افراد کی زیارت کی تھی، اور جن کا زمانہ سید صاحبؒ سے قریب تھا، لکھتے ہیں :-

"حضرت سید صاحبؒ کے ہاتھ پر چالیس ہزار سے زیادہ ہندو وغیرہ کفار مسلمان ہوئے، اور تیس لاکھ مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور جو سلسلۂ بیعت آپ کے خلفاء کے ذریعہ تمام روئے زمین پر جاری ہے اس سلسلہ میں تو کروڑوں آدمی آپ کی بیعت میں داخل ہیں[2]"۔

---

[1] "صیانۃ الناس عن وسوسۃ الخناس" مطبوعہ ۱۲۷۰ھ ص ۲

[2] سوانح احمدی، اس سلسلہ میں مزید شہادتیں اور حضرت مولانا ولایت علی عظیم آبادی (م ۱۲۶۹ھ) مولانا کرامت علی جونپوری (م ۱۲۹۰ھ) کے بیانات مصنف کے رسالہ "تحقیق و انصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ" میں دیکھے جائیں سید صاحبؒ کے مفصل حالات و کمالات کے لئے مولانا غلام رسول مہر کی کتاب "سید احمد شہید" (۱۔۲۔۳۔۴) اور مصنف کی کتاب "سیرت سید احمد شہید" (۱۔۲) کا مطالعہ کیا جائے، سید صاحب کے خلفاء کے ذریعہ جو عمومی ہدایت، اصلاح ہوئی، وہ جس درجہ کے صاحب تاثیر تھے اس کا کچھ اندازہ "الذکر الجلی فی کرامات السید محمد علی" (اردو) تصنیف افسر الدولہ جان جہاں خاں ابن نواب محمد خاں عالم خاں بہادر تہور جنگ مطبوعہ ۱۳۰۵ھ مطبع مرغوب دکن سکندر آباد) سے ہوسکتا ہے جو سید صاحب کے خلیفہ مولانا سید محمد علی واعظ رامپوری کے حالات و کرامات اور مدراس میں ان سے جو ہدایت و فیض پہونچا اس کے تذکرہ میں ہے۔

اسی عظیم الشان اصلاحی وتجدیدی کارنامہ کی بناء پر اکثر اصحاب نظر واہل انصاف آپ کو تیرہویں صدی کا مجدد مانتے ہیں۔

مولانا عبدالحی بڑھانویؒ اور مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی تعلیم وتربیت کا دوسرا نمونہ آپ کے دوؔ تلامذۂ رشید اور عزیز قریب مولانا عبدالحی بڑھانویؒ اور مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ ہیں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ خود ان دونوں کی فضیلت علمی اور تبحر کے قائل تھے' آپ نے ایک خط میں ان دونوں کو "تاج المفسرین فخر المحدثین سرآمدِ علمائے محققین" لکھا ہے' اور فرمایا ہے کہ :-

"دونوں حضرات تفسیر وحدیث' فقہ واصول ومنطق وغیرہ میں اس فقیر سے کم نہیں ہیں' جناب باری کی جو عنایت ان دونوں بزرگوں کے شامل حال ہے' اس کا شکر مجھ سے ادا نہیں ہو سکتا' ان دونوں کو علمائے ربانی میں شمار کرو اور جو اشکال حل نہ ہو ان کے سامنے پیش کرو۔"[1]

مولانا عبدالحی صاحبؒ کا پایہ اہل علم کے نزدیک علوم رسمیہ میں بہت بلند تھا' اور تفسیر میں خود شاہ صاحبؒ مولانا کو اپنے تمام تلامذہ پر فضیلت دیتے تھے' اور فرماتے تھے کہ وہ میرا نمونہ ہیں' شیخ الاسلام کا لقب جو اسلام میں خاص خاص علماء کو دیا گیا ہے' شاہ صاحبؒ نے خود مولانا کو ایک خط میں دیا ہے۔

علمی تبحر اور ذہنی کمالات پر بھی جو چیز فوقیت رکھتی ہے' وہ آپ کی للّٰہیت اور اخلاص ہے کہ اس علم وفضل کے ساتھ سید صاحبؒ کی طرف رجوع ہوئے' جو عمر میں آپ سے کہیں خورد سال

---

[1] مکتوب بنام منشی خیرالدین صاحب (سرائے سالی خاں لکھنؤ) ملاحظہ ہو سیرت سید احمد شہیدؒ حصہ اول ص ۲۱۶-۲۱۷

اور علم میں آپ سے تلمذ کا شرف رکھتے تھے بیعت ہوتے ہی آپ سید صاحبؒ کے رنگ میں رنگ گئے، اور اپنے سارے علم و فضل کو آپ پر اور دعوت و جہاد کے کام پر تصدّق، اور قلم و زبان اور خدا کی دی ہوئی ہر قوت و قابلیت کو حق کی اشاعت و نصرت کے لئے وقف کردیا، اور سفر ہجرت و جہاد ہی میں جان جاں آفریں کے سپرد کی۔

جہاں تک مولانا شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ کا تعلق ہے، وہ ان اولوالعزم، عالی ہمت، ذکی، جری اور غیر معمولی افراد میں تھے، جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں، وہ مجتہدانہ دماغ کے مالک تھے، اور اس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ ان میں بہت سے علوم کو از سر نو مدوّن کرنے کی قدرت و صلاحیت تھی، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ایک خط میں ان کو حجۃ الاسلام کے لقب سے یاد کیا ہے، آپ کی تصانیف اور علم میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے طرز کی جھلک نظر آتی ہے[1]، وہی علم کی تازگی، استدلال کی لطافت، نکتہ آفرینی، سلامت ذوق، قرآن و حدیث کا خاص تفقہ اور استحضار اور زور کلام۔

شاہ صاحبؒ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے علماء اہل درس اور اہل ذکاوت کے اس دائرہ سے باہر قدم نکالا، جو برسوں بلکہ صدیوں سے اس گروہ کے لئے مقرر ہو چکا تھا، اور اصلاح و ارشاد عام اور جہاد و عزیمت کے دائرہ میں نہ صرف قدم رکھا، بلکہ اس میں قیادت کا فرض انجام دیا، ان کی تنہا تصنیف "تقویۃ الایمان" سے خلق خدا کو وہ فائدہ پہونچا اور عقائد کی ایسی اصلاح ہوئی کہ شاید کسی حکومت کی منظم کوشش سے مشکل سے ہوتی، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی فرماتے تھے کہ "مولوی اسماعیل صاحبؒ کی حیات ہی میں ڈھائی لاکھ آدمی درست ہو گئے تھے، اور ان کے بعد جو نفع ہوا، اس کا تو اندازہ

---

[1] ملاحظہ ہو "منصب امامت" "عبقات" "ایضاح الحق الصریح فی احکام المیت والضریح"

ہو ہی نہیں ہو سکتا"

عمومی دعوت واصلاح کے اس عظیم کام کے ساتھ آپ نے جہاد فی سبیل اللہ کے لئے اپنے کو پورے طور پر تیار کیا، سید صاحبؒ کی (جن سے آپ نے بیعت سلوک و بیعت جہاد کی تھی) نہ صرف ہمرکابی اور رفاقت کا حق ادا کیا، بلکہ اس کام میں آپ کی حیثیت تحریک کے ایک قائد اور امیر کے وزیر و نائب کی تھی، پھر اسی کام میں اپنی ہستی فنا کر دی اور بالاکوٹ کے معرکہ میں شہادت کا شرف حاصل کیا، اقبال نے ایسے ہی حضرات کے متعلق کہا ہے ؎

تکیہ بر حجت و اعجاز بیاں نیز کنند　　کارِ حق گاہ بہ شمشیر و سناں نیز کنند
گاہ باشد کہ تہ خرقہ زرہ می پوشند　　عاشقاں بندۂ حال اند چنیں نیز کنند

مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ و شاہ محمد یعقوب صاحبؒ

شاہ صاحبؒ کے ذوق خاص "درس حدیث" اجازت و اسناد اور علوم دینیہ کی نشر و اشاعت میں آپ کے جانشین آپ کے دونوں نواسے حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ (۱۱۹۷ھ-۱۲۶۲ھ) اور شاہ محمد یعقوبؒ (۱۲۰۰ھ تا ۱۲۸۲ھ) تھے، جو شاہ محمد افضل کے صاحبزادے تھے، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ کو اپنا جانشین بنایا، اور اپنی تمام کتابیں اور گھر وغیرہ آپ ہی کو ہبہ کر دیا، آپ شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد ان کی مسند درس پر بیٹھے اور ۱۲۳۹ھ سے لے کر ۱۲۵۸ھ تک دہلی میں اور ۱۲۵۸ھ سے (جب آپ نے مکہ معظمہ ہجرت کی) ۱۲۶۲ھ تک حجاز مقدس میں حدیث کی تدریس و خدمت میں سرتاپا غرق و منہمک رہے، اور ہندوستان کے صدہا علماء نے آپ سے حدیث کا درس لیا، اور بڑے بڑے علماء

واساتذۂ حدیث نے بلاد وامصار سے آکر آپ سے استفادہ کیا اور حدیث کی سند لی جن میں شیخ عبداللہ سراج مکیؒ اور دوسرے کبار علماء شامل ہیں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے کہ اللہ نے ان کو شاہ محمد اسماعیل (بھتیجہ) اور شاہ محمد اسحٰق (نواسہ) کی شکل میں دو قوتِ بازو اور عصائے پیری عطا فرمائے، اور اکثر یہ آیت پڑھتے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ" دوشنبہ ۲۷ رجب ۱۲۶۲ھ مکۂ معظمہ میں وفات پائی اور جنۃ المعلاۃ میں حضرت سیدہ خدیجہؓ کی قبر کے پاس دفن ہوئے۔[1]

شاہ محمد یعقوب صاحبؒ نے بھی دہلی میں ایک مدت تک درس وافادہ کا سلسلہ جاری رکھا، پھر اپنے بڑے بھائی شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ کے ساتھ ۱۲۵۸ھ میں مکہ معظمہ ہجرت کی اور وہیں متوطن ہوگئے، ان سے نواب سید صدیق حسن خاں قنوجیؒ (والی بھوپال[2]) حضرت مولانا سید خواجہ احمد حسنی نصیر آبادیؒ[3]، اور ایک خلق نے استفادہ کیا، جمعہ کے دن ۲۷ ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ میں مکہ مکرمہ میں انتقال کیا، اور جنۃ المعلاۃ میں مدفون ہوئے۔

اجلّۂ علماء واساتذۂ کبار

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے درس وتربیت وصحبت سے جن علماء نے

---

[1] حالات کے لیے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" ج ۷۔ [2] نواب صاحب نے حدیث کی جو خدمت کی اور ان کی ذات سے کتب حدیث کی جو اشاعت ہوئی ان کی توجہ اور سرپرستی سے ریاست بھوپال جس طرح درس حدیث کا ایک مرکز اور محدثین کا مسکن وموطن بن گیا وہ ایک تاریخی حقیقت اور ان کا ایک کارنامہ ہے، پہلی بار فتح الباری کی طباعت ان کی توجہ سے بولاق مصر سے ہوئی اور اس پر پچاس ہزار روپیہ کی رقم صرف ہوئی، علماء اور طلبائے علم حدیث پر احسان عظیم ہے اور یہ شرف اولیت ان کو حاصل ہے۔ [3] آپ حضرت سید احمد شہیدؒ کے خاندان اور سلسلہ کے بلند پایہ مصلح، داعی الی اللہ اور صاحب سلسلہ تھے، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "کاروانِ ایمان وعزیمت"۔

فائدہ اٹھایا، پھر اپنا حلقۂ درس قائم کر کے سارے ہندوستان میں نام پیدا کیا، اور دینی نظام تعلیم میں زندگی کی ایک نئی روح پھونک دی، پھر خود ان کے درس کے فیض سے کثیر التعداد جید علماء تیار ہو کر نکلے، ان میں سے چند کے نام یہاں لکھے جاتے ہیں جو اپنی قوت و ملکۂ تدریس، منقول و معقول کی جامعیت اور تبحر علمی میں مشہور و مسلّم تھے، اور جو اپنی اپنی جگہ خود ایک مدرسہ اور دبستان تھے۔

(۱) مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلوی (۲) مولانا امام الدین دہلوی (۳) مولانا حیدر علی رامپوری ٹونکی (۴) مولانا حیدر علی فیض آبادی صاحب "منتہی الکلام" (۵) مولانا رشید الدین دہلوی (۶) مولانا مفتی صدر الدین دہلوی۔

ان کاملین علم و فن، اساتذۂ کبار اور ان سے بیشتر جن اہل دعوت و عزیمت اور تحریک اصلاح و تجدید اور جہاد فی سبیل اللہ کے قائدین کا نام آیا، جو شاہ صاحبؒ سے نسبت روحانی اور استفادۂ باطنی رکھتے تھے، ان سب کی وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ تیرہویں صدی حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے تعلیم و ارشاد اور تربیت افراد کی صدی تھی، "وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ"۔

شاہ صاحبؒ کے تذکرہ سے فارغ ہو کر جو سلسلۂ ولی اللہی کے دائرہ کا نقطۂ مرکزی، اور ان کے صاحبزادگان اور تلامذہ کے سلک نوریں دُرِّ شہوار (واسطۃ العقد) کی حیثیت رکھتے تھے، ہم شاہ صاحبؒ کے دوسرے دو صاحبزادوں حضرت شاہ رفیع الدینؒ اور حضرت شاہ عبد القادرؒ کا اور شاہ صاحبؒ کے تین خلفائے کبار حضرت شاہ محمد عاشق پھلتیؒ، خواجہ محمد امین کشمیری اور سید شاہ ابو سعید حسنیؒ رائے بریلوی کا تذکرہ پیش کریں گے، جو "نزہۃ الخواطر" ج ۷ سے ماخوذ و مقتبس ہوگا۔

شاہ رفیع الدین دہلویؒ

شیخ الاسلام امام کبیر علامہ رفیع الدین عبدالوہاب بن ولی اللہ بن عبدالرحیم عمری دہلوی اپنے وقت کے مشہور محدث، متکلم، اصولی، مسند وقت، فرید عصر اور نادرۂ دہر تھے دہلی میں ولادت اور نشوونما ہوئی اور اپنے برادر اکبر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے تحصیل علم کی اور ایک مدت تک ان کے ساتھ رہے طریقت میں شاہ محمد عاشق بن عبیداللہ پھلتی سے استفادہ کیا، اور بیس سال کی عمر میں علم و افتاء اور درس میں امتیاز و شہرت حاصل کی، اپنے برادر مذکور کی زندگی ہی میں آپ نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، اور اکابر علماء میں شمار ہونے لگے تھے، شاہ صاحبؒ کے آنکھوں سے معذور ہونے کے بعد درس و تدریس کا کام آپ نے سنبھال لیا، طلبہ کا ہجوم ہوا اور انھوں نے بقدر استعداد آپ کے علمی افادات سے فائدہ اٹھایا، علمائے آفاق نے آپ کے علم و فضل کا اعتراف کیا، اور آپ کی تصانیف نے قبولیت و شہرت حاصل کی، آپ کے برادر معظم شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے شیخ احمد بن محمد شروانی کو شاہ رفیع الدین صاحبؒ کے بارے میں لکھا تھا:۔

> "اب برادر یگانہ اور خلیق زمانہ کا وقت ہے جو نسباً میرے حقیقی بھائی ہیں، اور فنون علم و ادب میں (جن کا لوگ مجھ سے انتساب کرتے ہیں) میرے شریک ہیں، وہ عمر میں مجھ سے کچھ ہی چھوٹے ہیں، مگر فن و حکمت میں میرے برابر ہیں، اللہ تعالٰی نے اپنی مہربانی سے ان کی پرورش میرے ہاتھوں کی اور ان کی تکمیل کا مجھے ذریعہ بنا کر مجھ پر احسان کیا، وہ چند دنوں کے سفر کے بعد

واپس آئے تو مجھے ایک مختصر مگر قیمتی رسالہ کا تحفہ دیا، جو ایسے لطائف و نکات پر مشتمل ہے، جن میں وہ منفرد ہیں اور ان سے پہلے انھیں کسی نے نہیں لکھا ان کی یہ انفرادیت آیت نور کی تفسیر اور اس کے اندر پوشیدہ معانی کی رونمائی کے سلسلہ میں ہے، میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس باب میں ان کے بیانات ایسے حیرت انگیز ہیں، جن کے ذریعہ انھوں نے مغز سخن کو ظاہر کر دیا اور دلوں کے چراغ روشن کر دیئے اور اپنے اسلوب کی انفرادیت سے سعید روحوں کو تازہ دم کر دیا ہے۔"

شیخ محسن بن یحییٰ ترہتی "الیانع الجنی" میں فرماتے ہیں:۔

"ان مروجہ علوم کے علاوہ شاہ صاحبؒ کو علوم اوائل میں بھی مہارت تامہ حاصل تھی، جو ان کی طرح بہت کم اہل علم کے حصہ میں آتی ہے، ان کی تصانیف بہت عمدہ اور صحیح ہیں۔ ——————— میں نے بعض کتابیں دیکھیں تو آپ کی علمی و فنی عبارتوں میں ایسے اسرار و رموز نظر آئے جن کے رمز آشنا کم ہی ہوتے ہیں، تھوڑے سے لفظوں میں آپ بہت سے مسائل جمع کر دیتے ہیں، جس سے آپ کی علمی گہرائی اور دقت فہم کا اندازہ ہوتا ہے، آپ کی کتاب "دمغ الباطل" علم حقائق کے بعض مشکل مسائل پر مشتمل ہے، جس کی اہل فن نے تعریف کی ہے، آپ کا ایک مختصر و جامع رسالہ اور ہے، جس میں آپ نے ہر چیز میں محبت کی کارفرمائی دکھائی ہے، اور اس کی وضاحت کی ہے، اس کا نام "اسرار المحبۃ" ہے، ایسے بہت کم لوگ ملیں گے جنھوں نے اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہو، میرے خیال میں آپ سے پہلے اس موضوع پر

صرف دو فلسفیوں، ابوالنصر فارابی اور بوعلی سینا نے لکھا ہے، جیسا کہ نصیر الدین طوسی کی بعض کتابوں سے معلوم ہوتا ہے۔

شیخ محسن کی ذکر کردہ کتابوں کے علاوہ بھی ان کی کتابیں ہیں، جن میں عروض میں ایک رسالہ، مقدمہ علم تاریخ، اثبات شق القمر، حکماء کے اصول پر براہینِ حکمیہ کے ابطال، تحقیق الوان، آثار قیامت، حجاب، برہان تمانع، عقد انامل، اربعین کافات کی شرح، منطق، امور عامہ پر بھی آپ کے رسالے ہیں، رسالہ میر زاہد پر حاشیہ بھی لکھا ہے۔

آپ کی کتابوں میں "تکمیل الصناعۃ" ایسی عجیب کتاب ہے کہ بہت کم مصنفین کو ایسی کتاب لکھنے کا اتفاق ہوا ہوگا، ان کے علاوہ بھی آپ کی متعدد بلند پایہ کتابیں ہیں، اپنے والد ماجد کے بعض عربی قصائد کی آپ نے تخمیس بھی کی ہے، ان کے عربی اشعار کا نمونہ یہ ہے:۔

یا احمد المختار یا زین الورٰی　　یا خاتما الوسل ما اعلاکا

یا کاشف الضراء من متنجد　　یا منجیا فی الحشر من والاکا

ھل کان غیرک فی الأنام من استوٰی　　فوق البراق وجاوز الأفلاکا

ان کا ایک اور فصیح و بلیغ قصیدہ ہے جس سے علوم عقلیہ میں ان کی بلندی اور عربی پر قدرت کا پتہ چلتا ہے آپ نے اس میں بوعلی سینا کے قصیدہ "عینیہ" کا جواب لکھا ہے، جو "قصیدۃ الروح" کہلاتا ہے، اور جس کا مطلع ہے ؎

ھبطت الیک من المحل الارفع　　ورقاء ذات تعزز و تمنع

یہ قصیدہ ابن سینا کی عربی زبان پر قدرت، بیک وقت حلاوت و سلاست اور شکوہ الفاظ کا مظہر ہے، ہر شخص کا کام نہیں تھا کہ اس کا جواب دے، حضرت شاہ

رفیع الدین صاحبؒ نے اس کا جواب لکھا ہے، جس سے آپ کی قادر الکلامی اور عربیت کا اظہار ہوتا ہے، آپ کے قصیدہ کا مطلع ہے ؎

عجبا لشیخ فیلسوف ألمعی　　خفیت لعینیہ منارة مشرع [1]

آپ نے اپنے برادر بزرگ شاہ عبد العزیزؒ کی حیات ہی میں ۶ شوال ۱۲۳۳ھ کو دہلی میں وفات پائی اور شہر کے باہر اپنے والد ماجد و جدامجد کے پاس دفن ہوئے۔[2]

شاہ عبد القادر دہلویؒ

شیخ امام، عالم کبیر و عارف شہیر شاہ عبد القادر بن شاہ ولی اللہ بن شاہ عبد الرحیم عمری دہلوی علوم الٰہیہ کے ممتاز علماء میں تھے، آپ کی ولایت و جلالت پر لوگوں کا عام اتفاق ہے، جب آپ کے والد ماجد کی وفات آپ کے بچپن میں ہوگئی تو آپ نے اپنے برادر بزرگ شاہ عبد العزیز صاحبؒ سے تحصیل علم کیا اور شاہ عبد العدل دہلویؒ سے طریقت کی تعلیم پائی اور علم و عمل، زہد و تواضع، اور حسن سلوک میں امتیاز کے مالک ہوئے، ان فضائل کے سبب اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں آپ کی محبت پیدا کردی اور آپ اپنے شہر میں مرجع عام بن گئے اور علم روایت و درایت، اصلاح نفس، اور روحانی تربیت میں آپ سے رجوع کیا جانے لگا۔

آپ درس و افادہ میں مشغول اور دہلی کی اکبر آبادی مسجد میں مقیم رہتے تھے، آپ سے مولانا عبد الحیؒ بن ہبۃ اللہ بڑھانوی، مولانا محمد اسماعیلؒ بن شاہ عبد الغنی دہلویؒ، مولانا فضل حق بن

---

[1] علامہ نعمان آلوسی بغدادی کی "جلاء العینین" میں دونوں قصیدے ملاحظہ ہوں ص۱۵۳-۱۲۸ شاہ صاحب کا قصیدہ ایک سو سولہ (۱۱۶) اشعار کا ہے۔ [2] نزہۃ الخواطر جلد سابع ص۱۸۲-۱۸۶

فضل امام خیر آبادی، مرزا حسن علی شافعی لکھنوی، شاہ اسحٰق بن شاہ افضل عمری دہلوی (مدفون مکہ مکرمہ) مولانا سید محبوب علی جعفری، مولانا سید اسحٰق بن عرفان رائے بریلوی (برادر معظم حضرت سید احمد شہیدؒ) اور بہت سے لوگوں نے استفادہ کیا۔

آپ پر اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی عنایت یہ تھی کہ آپ کو ہندوستانی زبان میں قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر کی توفیق ملی، علماء نے اس کی بڑی قدر دانی کی اور اسے معجزاتِ نبویؐ میں سے ایک معجزہ قرار دیا۔ والد ماجدؒ نے "مہر جہاں تاب" میں لکھا ہے کہ "شاہ عبدالقادرؒ نے یہ ترجمہ لکھنے سے پہلے خواب دیکھا تھا کہ آپ پر قرآن نازل ہوا، اسے آپ نے اپنے بھائی شاہ عبدالعزیزؒ سے بیان کیا تو انھوں نے فرمایا کہ یہ سچا خواب ہے، مگر چونکہ اب نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سے وحی آنے کا سلسلہ موقوف ہو گیا ہے، تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے قرآن کی بے مثال خدمت لے گا" چنانچہ یہ بشارت "موضح القرآن" کی صورت میں پوری ہوئی۔

اس کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ انھوں نے زبان کے مقابلہ میں ایسی زبان اختیار کی ہے جس میں عموم و خصوص اور اطلاق و تقیید اور محل استعمال کا پورا لحاظ ہے، یہ اللہ کی ایسی عنایت ہے جس کے لئے وہ چند ہی لوگوں کو مخصوص کرتا ہے[1]۔

---

[1] مختلف مثالوں سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کو عربی زبان و ادب کا جیسا صحیح ذوق اور قرآنی الفاظ کی روح اور طاقت اور منشاء کے مطابق اردو کے الفاظ کے انتخاب میں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے اس کی نظیر کم سے کم ہندوستان میں نہیں ہے، اور بعض مقامات پر وہ علامہ زمخشری و راغب اصفہانی جیسے علمائے بلاغت و ائمہ لغت سے بھی بڑھ جاتے ہیں، تائید الٰہی، اعلیٰ درجہ کے اخلاص اور وہبی ادبی اور لسانی صحیح ذوق کے سوا کسی چیز سے اس کی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ (مصنف)

میں نے "موضح القرآن" کی سماعت و روایت اپنی نانی صاحبہ سیدہ حمیرا بنت شاہ علم الہدیٰ حسنی نصیر آبادی سے کی ہے جنھوں نے شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی صاحبزادی سے روایت کی ہے اور جنھوں نے اپنے والد ماجد سے روایت کی تھی آپ کی وفات چہار شنبہ ۱۹ رجب ۱۲۳۰ھ میں ہوئی اور اپنے والد کے پاس دفن ہوئے اس وقت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ حیات تھے اس لئے قدرتی طور پر انھیں بہت صدمہ ہوا، وہ حضرات ان کے دفن کے وقت یہ کہہ رہے تھے کہ "ہم ایک انسان کو نہیں بلکہ سراپائے علم و عرفان کو دفن کر رہے ہیں!"

یہ عجائبات زمانہ میں سے ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے چار صاحبزادے ارادت خاتون بنت سید ثناء اللہ سے تھے جن میں بڑے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ پھر شاہ رفیع الدین صاحبؒ پھر شاہ عبدالقادر صاحبؒ پھر سب سے چھوٹے شاہ عبدالغنی صاحبؒ (مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے والد) تھے، مگر سب سے پہلے چھوٹے بھائی شاہ عبدالغنی صاحبؒ کی وفات ہوئی پھر ان کے بعد شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی، پھر شاہ رفیع الدین صاحبؒ کی، پھر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی وفات ہوئی، یہ سب بھائی علم و عمل، افادہ و فیض رسانی میں (شاہ عبدالغنی صاحبؒ کے سوا کیونکہ ان کی وفات عنفوان شباب میں ہو گئی تھی) فضلائے زمانہ میں ممتاز تھے، شاہ عبدالغنی صاحبؒ کے صاحبزادہ گرامی قدر حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ کو اللہ نے ایسی توفیق عطا کی جس سے انھوں نے اپنے والد ماجد کی طرف سے پوری تلافی کر دی[1]۔

شاہ محمد عاشق پھلتی

عالم کبیر و محدث جلیل مولانا شاہ محمد عاشق بن عبیداللہ بن محمد صدیقی پھلتی،

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۹۵-۲۹۶

کبار مشائخ میں سے تھے آپ کا نسب حضرت محمد بن ابی بکر صدیق رضی تک اکیس واسطوں سے پہونچتا ہے بچپن ہی سے تحصیل علم میں مشغول ہوئے اور شیخ اجل حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی صحبت اختیار کی (جو آپ کے پھوپھی زاد بھائی تھے) اُن سے آپ نے علم و معرفت حاصل کی اور ان کے ساتھ ۱۱۴۳ھ میں حرمین شریفین کا سفر بھی کیا اور حج و زیارت سے مشرف ہوئے اور اساتذۂ حرمین سے اخذ و استفادہ میں آپ کے ساتھ شریک رہے جن میں شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی امتیاز خاص رکھتے ہیں شیخ ابو طاہر نے ان کو اجازت بھی دی۔

شاہ ولی اللہ صاحب کے اصحاب میں آپ علم و معرفت کے لحاظ سے سب پر فائق تھے اس طرح آپ شاہ صاحب دہلوی کے محرم اسرار ہو گئے، جیسا کہ شیخ ابو طاہر نے اپنے اجازت نامہ میں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہ اُن (شاہ ولی اللہ) کے کمالات کا آئینہ اور خصالِ جمیلہ کا نمونہ ہیں" ان کے استاد حضرت شاہ ولی اللہ نے انھیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا ؎

یحدثنی نفسی بأنك واصل إلی نقطة قصوى و وسط المراكز

وأنك في تيك البلاد مفخم بكفيك يوما كل شيخ و ناهز

(میرا دل کہتا ہے کہ تم علمی مرکزوں کے مقام بلند پر فائز ہو گے اور ان شہروں میں محترم ہو گے اور چھوٹا بڑا تمہارا تابع ہو گا۔)

دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

وان يك حقا ما اعلمت فانه سيلقى إليك الامر لابد سابغا

سيأتيك أمر لا يطاق بهاءه إلى كل سرلا محالة بالغا

وثلج وبرد يبعجان شتاتكم ... يزيلجان همامى فؤاد ولاذعا

(اگر میرا یقین صحیح ہے تو سررشتہ تمہارے ہاتھ آئے گا، اور تمہیں وہ نور حاصل ہو گا جس سے نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی اور وہ ہر راز کو افشا کر دے گا، اور شرح صدر سے وہ جمعیت خاطر حاصل ہو گی جو تمہارا غم غلط کر دے گی۔)

شرح دعائے اعتصام کی تقریظ میں شاہ صاحبؒ نے لکھا تھا ؎

ليهنك ما اوفيت ذروة حفه ... من الغوص والتفتيش والفهم والفكر

ويهنك من طى العلوم ونشرها ... ونظمك أصناف الجواهر والدر

وحفظك للرمز الخفى مكانه ... وخوضك بحرا زاخرا ايما بحر

فلله ما أوتيت من حل المنى ... ولله ما أعطيت من عظم الفخر

(علم و تحقیق اور فکر و نظر کی بلندیوں پر فائز ہونا مبارک ہو اور علوم کی تحقیق و اشاعت اور علم کے ہیرے موتیوں کی تنظیم و ترتیب بھی مبارک ہو نیز رمز مخفی کی حفاظت اور علم و عمل کے بحر زخار کی غواصی و شناوری تمہیں یہ مرادیں اللہ ہی کی طرف سے ملی ہیں، اور مفاخر کا سرمایہ بھی اللہ ہی کا عطیہ ہے۔)

ان سے شاہ عبدالعزیزؒ اور ان کے بھائی شاہ رفیع الدینؒ اور سید ابوسعید رائے بریلویؒ اور ایک خلق نے استفادہ کیا، ان کی کتابوں میں "سبیل الرشاد" فارسی میں تصوف کی ایک مبسوط کتاب ہے، دوسری کتاب "القول الجلی فی مناقب الولی" ان کے شیخ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے حالات میں ہے، "دعائے اعتصام" حقائق و معارف میں حضرت شاہ صاحبؒ کی کتاب کی شرح، ان کی سب سے بڑی کتاب "تبییض المصفیٰ شرح الموطا" ہے جو شاہ صاحبؒ کی کتاب "مصفیٰ" سے

متعلق ہے ۱۱۶۳ھ میں انتقال کیا جیسا کہ سید ابو سعید رائے بریلویؒ کے نام حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے گرامی نامہ سے معلوم ہوتا ہے۔

خواجہ محمد امین کشمیری ولی اللّٰہی

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے ان چارؔ خلفاء و تر شدین کبار میں سے جن سے ان کے سلسلہء تعلیماتؔ اور مقاصد کی اشاعت و تبلیغ ہوئی ان کے ایک اہم شاگرد خلیفہ خواجہ محمد امین کشمیری بھی تھے، مولانا حکیم سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ "نزہۃ الخواطر" میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ اصلاً کشمیر سے تعلق رکھتے تھے لیکن دہلی میں سکونت تھی، وہ شاہ صاحبؒ کے اجلہؔ اصحاب میں تھے، اپنے شیخ کی طرف اپنی نسبت کرتے تھے، اور ولی اللہی لکھتے اور کہلاتے تھے، ان کے امتیاز و شرف کے لئے اتنا کافی ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد ان سے علوم کی تکمیل کی جیسا کہ خود شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اپنے رسالہ "عجالہ نافعہ" میں اس کی صراحت کی ہے، ان کے اعزاز و امتیاز کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ان کے لئے خصوصی طور پر بعض رسائل تصنیف فرمائے، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے اس مکتوب گرامی سے جو انھوں نے حضرت شاہ ابو سعید رائے بریلوی کے نام بھیجا ہے۔

لہ مولانا عبید اللہ صاحب سندھی مرحوم اپنی کتاب "التمہید" (حصہ اردو) میں لکھتے ہیں:-

"شاہ صاحب کے مکمل نظریہ کو سمجھنے والے ایسے چار رفقاء سے زیادہ نہیں ہیں (۱) ان کے ماموں زاد بھائی شاہ محمد عاشق (۲) جمال الدین شاہ محمد امین ولی اللہی کشمیری (۳) شاہ نور اللہ بڈھانوی (۴) شاہ ابو سعید بریلوی" (شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک از مولانا عبید اللہ سندھی ص ۱۴۲-۱۴۳)

اصحاب ثلاثہ شیخ محمد عاشق پھلتی، خواجہ محمد امین کشمیری ولی اللہی اور شاہ ابو سعید صاحب رائے بریلوی کا ذکر مستقل طور پر آیا ہے، چوتھے صاحب شیخ نور اللہ صدیقی بڈھانوی حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خصوصی تلامذہ میں تھے اور شاہ صاحب کی زندگی ہی میں اُن کو امتیازی شہرت حاصل ہو گئی تھی، اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے جو ان کے داماد بھی تھے انہی سے فقہ کی کتابیں پڑھیں، ۱۱۸۷ھ کے قریب ان کی وفات ہوئی۔

(نزہۃ الخواطر جلد ۶)

پتہ چلتا ہے کہ ان کا انتقال ۱۱۸۰ھ میں یا اس کے آس پاس ہوا، اس لئے کہ حضرت سید شاہ ابو سعید حسنیؒ ربیع الاول ۱۱۸۰ھ میں عازم حج ہوئے تھے اور ۱۱۸۱ھ میں ان کی مراجعت ہوئی اور شاہ صاحبؒ کا یہ خط ان کی واپسی پر تھا[1]۔

خواجہ محمد امین کشمیری کی خصوصیت اس سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ کلمات طیبات میں شاہ صاحبؒ کے ان کے نام چار اہم مکتوب ہیں جو دقیق حقائق و معارف پر مشتمل ہیں[2]۔

ان چار خلفائے عظام کے علاوہ شاہ صاحب کے بعض دوسرے خلفاء بھی تھے، جن کے حالات تفصیل سے نہیں ملتے، ان میں ایک حافظ عبدالنبی معروف بہ عبدالرحمٰن بھی تھے، جن سے شاہ صاحب کا خصوصی تعلق معلوم ہوتا ہے[3]۔

شاہ ابو سعید حسنی رائے بریلویؒ

سید والا تبار ابو سعید بن محمد ضیاء بن آیت اللہ بن شیخ اجل علم اللہ نقشبندیؒ بریلوی، علمائے ربانیین میں سے تھے، رائے بریلی میں ولادت اور نشو و نما ہوئی، اور ملا عبداللہ امیٹھوی سے تعلیم حاصل کی، پھر اپنے چچا سید محمد صابر بن آیت اللہ نقشبندیؒ سے بیعت ہوئے اور صوفیہ کے اذکار و اشغال میں ایک مدت تک مصروف رہے، اس کے بعد دہلی جا کر حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے پاس رہ کر ان سے استفادہ کیا اور ان کی وفات کے بعد ضرورت کا احساس کر کے شاہ صاحبؒ کے شاگرد شیخ محمد عاشق بن عبید اللہ پھلتی سے بھی استفادہ کیا، شاہ محمد عاشق صاحبؒ نے آپ کے

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۸۶ [2] کلمات طیبات ص ۱۶۱-۱۶۷

[3] ملاحظہ ہو رسالہ برہان مقالہ مسعود انور صاحب علوی ایم۔ اے علیگ شمارہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۸۳ء۔

اجازت نامہ میں لکھا ہے :۔

"سید تقی ونقی، عارف باللہ، قابل تعریف ولی میر ابو سعید ہمارے شیخ ولی اللہ محدث کے ساتھ رہے ہیں اور ان سے بعض اشغالِ طریقت معلوم کرکے ان پر مداومت کی ہے، حتی کہ ان پر شیخ کی توجہ کی برکت سے ظاہری و باطنی لطائف واسرار کے دروازے کھل گئے، اور ان کی شخصیت میں صوفیہ کے احوال و آثار ظاہر ہوئے اور انھیں وہ "شہود" حاصل ہوا جو صوفیہ کا مقصود ہے۔"

آگے تحریر فرماتے ہیں :۔

"پھر جب حضرت شیخ نے دارِ رضوان کو انتقال فرمایا تو انھیں خیال ہوا کہ سلسلۂ نقشبندیہ، قادریہ، چشتیہ وغیرہ کے بقیہ اشغال فقیر سے حاصل کریں، اور صوفیہ کے متوارث طریقہ میں داخل ہوں، میں نے ان کی طلب دیکھ کر حدیث "الجام" کے خوف سے حصولِ مقصد میں ان کی مدد کی اور ان اشغال کی تلقین کی، اور جب ان میں ان کے آثار و انوار کا مشاہدہ کیا اور ان کی پختگی کا اندازہ کر لیا، تو استخارہ کے بعد انھیں طالبین وسالکین کی رہنمائی کی اجازت دی، اور انھوں نے تمام طریقوں میں بیعت کی، اور انھیں "خرقۂ فقریہ فخریہ" انابت و اجازت کے طور پر پہنایا، جیسا کہ ہمارے شیخ نے ہمیں پہنایا تھا، اور اس کی اجازت دی تھی، اور جیسا کہ شیخ عبید اللہ نے ہمیں اپنے آباء و مشائخ کرام کے ذریعہ حاصل ہونے والے لباس اور اجازت سے نوازا تھا، اس کے ساتھ میں نے انھیں تفسیر و حدیث، فقہ و تصوّف کے درس کی (بشرط مطالعہ و مراجعت شروح) اور

نحو و صرف کے درس کی اجازت دی، نیز جائز ضرورتوں کے وقت تعویذ اور اعمال شلغم کی اجازت دی "القول الجمیل فی بیان سواء السبیل" "الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ" میں مندرج تمام اعمال و اشغال کی اجازت دی۔"

سید شاہ ابوسعیدؒ ایک باوقار، کریم النفس، کثیر الاحسان، مہمان نواز، غریب پرور بزرگ تھے، رفقاء کے ساتھ آپ نے حجاز کا سفر کیا اور ۲۸ ربیع الاول ۱۱۸۷ھ کو مکہ مکرمہ پہونچے اور حج سے مشرف ہو کر مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور وہاں چھ ماہ مقیم رہے اور "مصابیح" کی شیخ ابوالحسن سندھی صغیر سے سماعت کی، ایک بار آپ مرقد نبویؐ (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، آپ کو دیکھا کہ حجرۂ مبارکہ سے باہر جلوہ افروز ہیں، پہلے آپؐ کے دوش مبارک ظاہر ہوئے، پھر جسد مطہر ظاہر ہوا اور آنحضرتؐ سامنے تشریف فرما ہو کر متبسم ہوئے، آپ کے مرید و مجاز شیخ امین بن حمید علوی کاکوروی اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں کہ :۔

"شیخ ابوسعیدؒ فرماتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینہ منورہ میں بچشم سر دیکھا ہے۔"

پھر آپ مکہ مکرمہ واپس ہوئے اور "جزریہ" شیخ محمد میرداد انصاری سے پڑھی، پھر طائف ہوتے ہوئے، ہندوستان آئے اور "مدراس" میں داخل ہوئے، اور وہاں ایک مدت تک قیام کیا اور مقبولیت حاصل کی، اور آپ سے بہت سے لوگ مستفید ہوئے ان میں الحاج امین الدین بن حمید الدین کاکوروی، مولانا عبدالقادر خاں خالص پوری، میر عبدالسلام بدخشی، شیخ میرداد انصاری مکی، مولانا جمال الدین بن محمد صدیق قطب، مولانا عبداللہ آفندی، اور شیخ عبداللطیف حسینی مصری، اور بہت سے دوسرے

لوگ تھے، ۹ر رمضان ۱۱۹۳ھ کو رائے بریلی میں وفات پائی اور وہیں سپرد خاک ہوئے[1]۔

ایک نامور معاصر و مصلح شیخ محمد بن عبدالوہاب

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ایک نامور معاصر اور عظیم مصلح مجدد کے ایک ممتاز عالم اور صاحبِ عزیمت داعی و مصلح شیخ محمد بن عبدالوہاب بن سلیمان التمیمی، الحنبلی، (۱۱۱۵-۱۲۰۶ھ)(۱۷۰۳-۱۷۹۲ء) ہیں، وہ سنہ ولادت کے لحاظ سے شاہ صاحبؒ کے متقارب السن[2]،

---

[1] واضح رہے کہ آپ حضرت سید احمد شہیدؒ کے حقیقی نانا تھے، خاندان ولی اللہی سے آپ کے تعلقات کی نوعیت، اور آپ کی خصوصیت و عظمت کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے، جو شاہ اہل اللہ (برادر حضرت شاہ ولی اللہ) مولانا نور اللہ، حضرت شاہ محمد عاشقؒ، اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے آپ کے نام بھیجے ہیں، اور جن میں خاندانی حوادث اور پیش آنے والے واقعات کی اطلاع، نیز آپ کے بلند مقام اور کمالات کا اعتراف ہے، یہ مجموعہ مولوی سید ابوالقاسم صاحب ہنسوی کا مرتب کیا ہوا "مکتوب المعارف" کے نام سے خاندانی ذخیرۂ کتب میں محفوظ ہے، آپ ہی کے حقیقی چچا زاد بھائی مولانا سید محمد واضح حسنی کو بھی حضرت شاہ ولی اللہؒ کی طرف سے اجازتِ عامہ تھی اور شاہ صاحبؒ ان کا بلند الفاظ میں ذکر فرماتے ہیں۔

(ملاحظہ ہو مکتوب مشمولہ مکتوبات قلمی عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری حیدرآباد ص۱۵)

[2] شاہ صاحبؒ کی ولادت ۱۱۱۴ھ کی ہے، اس طرح آپ شیخ سے ایک سال بڑے تھے۔

اور سنہ وفات کے لحاظ سے ان سے تیس[۳۰] سال متاخر ہیں، معاصر ہونے اور متعدد ما بہ الاشتراک باتوں کے باوجود، ملاقات تو بجائے خود ایک کی دوسرے سے واقفیت کا بھی ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا، حضرت شاہ صاحبؒ ۱۱۴۳ھ میں حج کے لئے گئے اور ایک سال سے کچھ زیادہ حجاز میں قیام فرمایا، یہ وہ زمانہ ہے کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت و تحریک نجد کے علاقہ عُیینہ و درعیہ وغیرہ میں محدود تھی، امیر محمد بن سعود نے اس وقت تک نہ شیخ سے بیعت کی تھی اور نہ ان دونوں کے درمیان (دعوت کی نشر و اشاعت اور اس کی بنیاد پر حکومت کے قیام اور اس کی تائید کا) کوئی معاہدہ اور سمجھوتہ ہوا تھا، یہ معاہدہ ۱۱۵۸ھ میں ہوا اور اس کے نتیجہ میں درعیہ دعوت کا مرکز اور ایک دینی دار الحکومت بنا، شیخ کی دعوت کا حجاز میں اس وقت تعارف اور اثر و نفوذ پیدا ہوا جب ۱۲۱۸ھ میں (شیخ کی وفات کے بارہ[۱۲] سال اور شاہ صاحبؒ کی وفات کے بیالیس[۴۲] برس بعد) مکہ معظمہ پر آل سعود کا قبضہ ہوا۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت و جدّ و جہد کا اصل دائرہ توحیدِ خالص کی دعوت و تبلیغ، ردِّ شرک، و استیصال رسوم جاہلیت (جس کے بعض مظاہر و شعائر کا بُعدِ زمانہ، جہالت، اور علماء کی غفلت سے جزیرۃ العرب کے مشرقی حصہ کے بعض علاقوں اور قبائل میں ظہور ہو گیا تھا[۱]) توحید الوہیت و توحید ربوبیت کا فرق اور خدا کی طرف سے جس توحید کا اپنے بندوں سے مطالبہ اور قرآن مجید میں

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مولانا مسعود عالم ندوی کی کتاب "محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح" (مطبوعہ مکتبہ نشأت ثانیہ حیدرآباد) نیز عربی کی وہ کتابیں جو شیخ کے حالات میں لکھی گئیں اور ان کی فہرست طویل ہے۔

اس کی صریح دعوت ہے' اس کی وضاحت و تنقیح تھی[1]' اس بارے میں شیخ کو جو کامیابی ہوئی اس کی مثال پچھلے دور کے مصلحین میں ملنی مشکل ہے' اگرچہ بقول ڈاکٹر احمد امین' اس میں اس کو بہت دخل تھا کہ اس کی بنیاد پر ایک حکومت' (حکومت سعودیہ) قائم ہوئی' اور اس نے اس دعوت کو اپنا لیا' اور اس کی سرپرستی کی[2]' لیکن بہر حال یہ حقیقت ہے کہ شیخ نے اس سلسلہ میں ایک انقلابی مصلح کا کردار ادا کیا' اور خواہ کسی صاحب علم کو ان کے افکار' دعوت پیش کرنے کے طریقہ و لہجہ اور طرز عمل سے سو فیصدی اتفاق نہ ہو' اس دعوت کی افادیت' اثر انگیزی اور ان خاص حالات میں اس کی ضرورت سے انکار نہیں ہو سکتا۔

عقیدۂ توحید کی توضیح و تنقیح' قرآن مجید سے اس کے ثبوت' اور توحید الوہیت و توحید ربوبیت کے درمیان فرق کا جہاں تک تعلق ہے' اس میں حضرت شاہ صاحبؒ اور شیخ محمد بن عبد الوہابؒ کے خیالات و تحقیقات میں بڑی مماثلت نظر آتی ہے' جو قرآن مجید کے عمیق اور براہ راست مطالعہ و تدبر اور کتاب و سنت سے گہری واقفیت کا نتیجہ ہے' اور جس نے اپنے زمانہ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور اپنے اپنے زمانہ میں دوسرے محققین و مصلحین کو مماثل نتائج پر پہونچایا اور ان کو واضح اور دو ٹوک دعوت توحید کی اشاعت و تبلیغ پر آمادہ کیا۔

لیکن شاہ صاحبؒ کا دائرۂ عمل اور ان کے اصلاحی و تجدیدی کام کا میدان اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے' اس میں علوم اسلامیہ کا احیاء' فکر اسلامی کی تجدید'

---

[1] ملاحظہ ہو شیخ کا شہرۂ آفاق رسالہ "التوحید الذی ھو حق اللہ علی العبید"

[2] ملاحظہ ہو "زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث" ترجمہ شیخ محمد بن عبد الوہاب۔

اسرار و مقاصد شریعت کی نقاب کشائی، شریعت اور تعلیمات اسلامی کو مربوط و مکمل شکل میں پیش کرنے کا علمی کارنامہ، علمی جمود اور مذاہب فقہیہ کے تعصب کی اصلاح، تطبیق بین العقل والنقل اور توفیق بین المذاہب الفقہیہ کا مجتہدانہ کام، ہندوستان میں اسلامی اقتدار کی حفاظت کی سعی، حدیث کا عمیق مطالعہ اور اس کی نشر و اشاعت کی مجددانہ کوشش، تزکیۂ نفس اور حصولِ درجۂ احسان کی دعوت اور اس کی تعلیم اور مردان کار کی تربیت شامل ہے، اسی کے ساتھ شاہ صاحبؒ کے یہاں (اقبالؔ کے الفاظ میں) "حجازی ریگ زار" (توحید خالص کی مضبوط زمین) میں زمزم کا چشمۂ شیریں (محبت و لینت کی جوئے شیر) بھی ہے، جو شاہ صاحبؒ کے خاص ماحول و تربیت اور تصوف و سلوک کا نتیجہ ہے، اور جس کا نمونہ ان کے نعتیہ قصائد اور شوقیہ اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے، اس لحاظ سے ان کا اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کا (جن کی سعی بہر حال مشکور ہے) تقابلی مطالعہ کرنے اور ان دونوں میں مماثلت و اتفاق کے نقاط تلاش کرنے کے بجائے شاہ صاحبؒ کا اور شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کا تقابلی مطالعہ اور اتفاق و اختلاف کے نقاط تلاش کرنا زیادہ مناسب ہوگا کہ دونوں اپنے علمی تبحر، علوم کتاب و سنت میں درجۂ امامت و اجتہاد تک پہونچنے، عمق و وسعتِ نظر، کار اصلاح و تجدید کے تنوع اور شخصیت کی عظمت و عبقریت میں زیادہ مماثل نظر آتے ہیں، (اور کتاب میں اس کی طرف جابجا اشارات گزر چکے ہیں) اس اختلاف کے ساتھ جو ماحول تعلیم و تربیت، زمان و مکان کے اختلاف اور سلوک و تربیت باطنی کا نتیجہ ہے۔

بابِ دوازدہم[12]

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تصنیفات

کتب و رسائل

یہاں حضرت شاہ صاحبؒ کی چھوٹی بڑی عربی فارسی تصنیفات کی حروف تہجّی کے اعتبار سے فہرست دی جارہی ہے، اہم کتابوں کا مختصر تعارف بھی کرایا گیا ہے، قلمی و مطبوعہ اور زبان کی نشان دہی کی بھی کوشش کی گئی ہے۔

(ا)

۱۔ الأربعین (عربی) چالیسؔ احادیث کا مجموعہ جو ان مختصر اور جامع احادیث پر مشتمل ہے جو "جوامع الکلم" کا مصداق ہیں، مطبع انوار محمدی لکھنؤ سے ۱۳۱۹ھ میں شائع ہوا، ۱۲۵۴ھ میں اس کا اردو ترجمہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے ایک خلیفہ سید عبداللہ مرحوم نے مطبع احمدی کلکتہ سے شائع کیا، اس کے بعد متعدد ترجمے شائع ہوئے، مولانا عبدالماجد دریاآبادیؒ نے ۱۳۸۶ھ (۱۹۶۷ء) میں اس کا ترجمہ اور مختصر تشریح کی، جو ہندوستان و پاکستان سے "چہل حدیث ولی اللّٰہی" اور "اربعین ولی اللّٰہی" کے نام سے شائع ہوئی۔

۲۔ الإرشاد إلی مُہمّات علم الاسناد (عربی) اس میں اپنے اساتذہ و شیوخ حجاز کا

ذکر ہے، رسالہ مطبوعہ ہے۔

۳۔ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء (فارسی) موضوع، حجم، طباعت اور اہم مضامین کی تلخیص، کتاب کے تعارف میں گزر چکی ہے۔

۴۔ أطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم (عربی) یہ شاہ صاحبؒ کے نعتیہ قصائد کا مجموعہ ہے، جن سے شاہ صاحبؒ کی قادر الکلامی اور عشق نبویؐ کا اندازہ ہوتا ہے، مطبع مجتبائی دہلی سے ۱۳۰۸ھ میں شائع ہوا۔

۵۔ ألطاف القدس (فارسی) کتاب لطائف باطنی کی تشریح اور تصوف کے بنیادی مسائل کی توضیح میں ہے، سید ظہیر الدین صاحبؒ کے اہتمام میں مطبع احمدی سے شائع ہوئی۔

۶۔ الإمداد فی مآثر الأجداد (فارسی) مختصر رسالہ ہے، اس میں شاہ صاحبؒ نے اپنے چند اجداد کا حال لکھا ہے، اس میں اپنا سلسلہ نسب بھی درج کیا ہے "انفاس العارفین" میں یہ رسالہ بھی شامل ہے، نیز مطبع احمدی دہلی کے طبع کردہ مجموعہ خمسہ رسائل شاہ ولی اللہ دہلویؒ میں بھی شامل ہے۔

۷۔ الانتباہ فی سلاسل أولیاء اللہ[1] (فارسی) تصوف کے مختلف سلاسل کی تاریخ اور ان کی تعلیمات کا مختصر تذکرہ، ۱۳۱۱ھ میں سید ظہیر الدین صاحبؒ کے اہتمام میں اردو ترجمہ کے ساتھ مطبع احمدی سے شائع ہوا۔

---

[1] الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ میں ص۱۰۰ پر کشف قبور کے عنوان کے ماتحت جو طریقہ لکھا گیا ہے وہ ان تمام احتیاطوں اور محققانہ و مجددانہ ذوق سے مطابقت نہیں رکھتا جو شاہ صاحبؒ کی اہم تصنیفات بالخصوص حجۃ اللہ البالغۃ، تفہیمات الٰہیہ اور الفوز الکبیر میں نمایاں ہے، اور اگرچہ اس کی تاویل کی جا سکتی ہے (ملاحظہ ہو حفظ الایمان از حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ص۸) لیکن ان موہم الفاظ میں بھی اس مضمون کا آنا جو مشائخ طریقت کے تجربات اور بعض کے عمل کے مطابق ہے عملی لغزش اور غلط فہمی کا باعث ہو سکتا ہے، امام مالکؒ کے درجے اللہ تعالیٰ بلند فرمائے کہ انھوں نے مسجد نبویؐ کے درس میں قبر انور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "کل یؤخذ من قولہ ویرد إلا صاحب ھذا القبر" (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

۸۔ انسان العین فی مشائخ الحرمین (فارسی) اس رسالہ کا تعارف شاہ صاحبؒ کے تذکرہ میں گزرچکا ہے "انفاس العارفین" کا جزء ہے، مطبع احمدی سے مجموعۂ خمسہ رسائل شاہ ولی اللہؒ کے ضمن میں بھی شائع ہوا ہے۔

۹۔ الانصاف فی بیان أسباب الاختلاف (عربی) رسالہ کے تعارف کے سلسلہ میں اس کی اہمیت، طباعت اور مختلف ایڈیشنوں کی تفصیل گزرچکی ہے۔

۱۰۔ انفاس العارفین (فارسی) کتاب کا تعارف شاہ صاحبؒ کے تذکرہ میں گزرچکا ہے، ۱۳۳۵ھ (۱۹۱۷ء) میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوئی، یہ کتاب دراصل حسب ذیل سات رسالوں کے مجموعہ کا نام ہے۔

(۱) بوارق الولایۃ (۲) شوارق المعرفۃ (۳) الامداد فی مآثر الاجداد

(۴) النبذۃ الابریزیۃ فی اللطیفۃ العزیزیۃ (۵) العطیۃ الصمدیۃ فی انفاس المحمدیۃ

(۶) انسان العین فی مشائخ الحرمین (۷) الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف

اس میں سے اکثر رسائل علیحدہ بھی طبع ہوئے ہیں۔

(ب)

۱۱۔ البدور البازغۃ۔ (عربی) کتاب فلسفۂ دینی کے بیان پر مشتمل ہے، لیکن اس میں فلسفہ کی اصطلاحات فطرت وترکیب انسانی، طبقات وافراد کے خصائص پر فلسفیانہ اور اشراقی رنگ میں روشنی ڈالی گئی ہے، اور طبعیات وعلم الاخلاق کے مباحث ملے جلے ہیں، ارتفاقات کو بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، اور صالح تمدن اور اس بارے میں شریعت کی رہنمائی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، جماعت انسانی کی صحیح تنظیم اور خلافت وامارت کے احکام وآداب بھی بیان کئے گئے ہیں، پھر معرفت الٰہی،

اور اسماء وصفات سے بھی پردہ اٹھایا گیا ہے، مراتب احسان اور ان کے حجابات کا بھی ذکر کیا گیا ہے، مرض شرک اور اس کے اصناف اور طبقات کا بھی ذکر ہے فتن اور قیامت کا اثبات بھی ہے، عالم برزخ وحشر کے منازل، فضائل اعمال و مناقب کا تذکرہ، نبوت کا اثبات، اقسام انبیاء و مراتب وحی کی بھی تفصیل ہے، ملت کی حقیقت، اس کے ظہور کے انواع، جاہلیت اولیٰ کا تذکرہ اور ملل سابقہ کا بھی تعارف کرایا گیا ہے، پھر اس ملت کی شریعت، اس کے ارکان دین، علم تشریع اور مقاصد شرع کا بیان تفصیل سے ہے، اور ارکان اربعہ کے اسرار و حکم پر خاص طور سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کتاب میں "حجۃ اللہ البالغہ" کے مقابلہ میں مضامین کی کثرت اور ان کا تنوع زیادہ ہے، اور اس میں بعض ایسے مباحث الٰہیہ اور مسائل کلامیہ بھی آگئے ہیں جن کو جمہور متکلمین اور حکمائے امت نے بیان نہیں کیا تھا لیکن حجۃ اللہ البالغہ اپنے عمق، علم ونظر کی پختگی، ذہنی وعلمی ارتقاء اور علوم وحقائق کو شریعت وسنت کی زبان اور زیادہ طاقتور عربی اسلوب میں بیان کرنے میں فائق ہے، مجلس علمی ڈابھیل نے ۱۳۵۴ھ میں مدینہ پریس بجنور سے شائع کیا۔

۱۲۔ بوارق الولایۃ (فارسی) یہ رسالہ انفاس العارفین کا جزء ہے، اس میں اپنے والد شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کے اقوال واحوال وواقعات وتصرفات ذکر کئے ہیں۔

(ت)

۱۳۔ تاویل الاحادیث (عربی) اس میں انبیاء علیہم السلام کے ان قصص کے جو قرآن مجید میں بیان کئے گئے ہیں، لطائف ونکات اور ان سے استخراج کئے ہوئے بہت سے اصول شرعیہ کا بیان ہے، اختصار کے باوجود کتاب میں بعض بڑے قیمتی اشارات اور قرآن مجید کے عمیق فہم کے نمونے ہیں، شاہ ولی اللہؒ اکیڈمی حیدرآباد (پاکستان) کی جانب سے شائع ہوئی۔

۱۴۔ تحفۃ الموحدین۔ یہ عقیدۂ توحید کی تشریح پر شاہ صاحب کا فارسی میں ایک مختصر رسالہ ہے جس کا متن افضل المطابع دہلی سے شائع ہوا تھا، مولانا حافظ محمد رحیم بخش دہلوی مصنف "حیات ولی" نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا، ۱۳۸۱ھ بمطابق ۱۹۶۲ء میں مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور کی طرف سے یہ ترجمہ شائع ہوا ہے، شاہ صاحب کی تصنیفات میں عام طور پر اس رسالہ کا ذکر نہیں آتا، رسالہ کا بنیادی مضمون اگرچہ شاہ صاحب کی دوسری تحریرات کے مطابق ہے، لیکن بعض مضامین کی بنا پر بعض اہل نظر کو اس کی شاہ صاحب کی طرف نسبت میں تردد ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

۱۵۔ تراجم ابواب البخاری (عربی) اس میں اصولی طور پر ایسے قواعد بیان کئے گئے ہیں، جن سے تراجم بخاری کے حل میں مدد ملے، مجموعہ رسائل اربعہ نیز مسلسلات مطبوعہ مطبع نور الانوار آرہ کے آخر میں طبع ہوا ہے۔

۱۶۔ التفہیمات الإلٰہیۃ (عربی و فارسی) اس میں شاہ صاحبؒ کے وارداتِ قلبی اور وجدانی مضامین ہیں، جو زیادہ تر عربی اور کمتر فارسی میں ہیں، اس کی حیثیت ایک ایسی بیاض کی سی ہے جس میں آدمی اپنے تأثرات و مشاہدات قلم بند کر لیتا ہے، اور وہ خاص حلقۂ احباب و تلامذہ کے مطالعہ میں آنے کے لئے موزوں ہوتی ہے، بعض اوقات صاحبِ بیاض ان کی عام اشاعت کو پسند نہیں کرتا، اس کو مجلس علمی ڈابھیل نے ۱۳۵۵ھ (۱۹۳۶ء) میں مدینہ پریس بجنور سے شائع کیا، اس کتاب میں شاہ صاحبؒ نے مسلمانوں کے مختلف طبقات کو الگ الگ خطاب کیا ہے، جو کتاب کا مؤثر ترین اور مفید ترین حصہ ہے، کتاب دو جلدوں میں ہے۔

(ج)

۱۷۔ الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف (فارسی) ذاتی حالات کا مختصر بیان

اور یادداشت، تذکرہ کے سلسلہ میں تعارف گزرچکا ہے" انفاس العارفین" کا جزو ہے اور علیحدہ بھی طبع ہوا ہے،

(ح)

۱۸۔ حجۃ اللہ البالغۃ (عربی) کتاب کا تعارف اس کے اہم مضامین کا بیان اور اس کے طبعات کا تذکرہ باب ہفتم میں گزرچکا ہے۔

۱۹۔ حسن العقیدۃ (عربی) اسلام کے بنیادی عقائد کو اہل سنت کے مسلک اور قرآن وحدیث کی روشنی میں جامع طریقہ پر بیان کیا گیا ہے، رسالہ کا تعارف اور اس کی طباعت واشاعت کا تذکرہ باب پنجم میں گزرچکا ہے، رسالہ" العقیدۃ الحسنۃ" کے نام سے بھی معروف ہے، مولانا محمد اویس صاحب نگرامی ندوی مرحوم نے اس کی شرح "العقیدۃ السنیۃ" کے نام سے کی، جو مکتبۂ ندوۃ العلماء سے شائع ہوئی اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں نصاب میں شامل ہے۔

(خ)

۲۰۔ الخیرالکثیر (عربی) یہ حقیقتاً فلسفۂ دینی کی کتاب ہے، اس میں معرفت ذات، اسماء الٰہی کی حقیقت، حقیقت وحی، کلام الٰہی وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، وحدۃ الوجود پر بھی فلسفیانہ انداز میں گفتگو کی گئی ہے، عرش، زمان ومکان، افلاک وعناصر، معدن، نبات وحیوان، اعیان ثابتہ، عالم مثال وغیرہ سے بحث کی گئی ہے، کتاب کا باب الخزانۃ الخامسۃ اہم ہے، جس میں نبی کی بعثت، نبوت کے پانچ مزاج، اور انبیاء کے اصناف وغیرہ کا بیان ہے۔
کتاب فلسفہ، طبعیات، تصوف، حکمۃ الاشراق سب کا مجموعہ ہے۔
خزانہ ثالثہ میں بعثت سے پہلے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کمالات سے بحث ہے۔

خزانہ ثامنہ میں شریعت کے نشوونما اور اس کے ارتقاء سے بحث ہے۔

خزانہ تاسعہ میں معاد کے احوال ومراتب سے بحث ہے۔

خزانہ عاشرہ میں متفرق فوائد ہیں۔ مجلس علمی ڈابھیل سے ۱۳۵۲ھ میں شائع ہوئی۔

(د)

۲۱۔ الدر الثمین فی مبشرات النبی الأمین (عربی) آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبشرات کا ایک مجموعہ جو شاہ صاحبؒ کی ذات یا بزرگوں سے متعلق ہیں، رسالہ مسلسلات اور النوادر کے ساتھ ۱۳۹۱ھ (۱۹۷۰ء) میں طبع ہوا ہے، کتب خانہ یحیوی سہارنپور سے بھی شائع ہوا۔

۲۲۔ دیوان اشعار (عربی) جسے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے جمع کیا، اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے مرتب کیا، مخطوط کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

(ر)

۲۳۔ رسالہ۔ حضرت خواجہ خورد شیخ عبداللہ بن عبدالباقی کے جواب میں اپنے کشف کے مطابق۔

۲۴۔ رسالہ دانشمندی (فارسی) اصولِ تعلیم واساتذہ کے لئے قیمتی ہدایات پر مشتمل ایک پُرمغز اور مفید رسالہ ہے، اردو ترجمہ "الرحیم" حیدرآباد سندھ سے ستمبر ۱۹۶۴ء میں پروفیسر محمد سرور نے شائع کیا، نیز عربی ترجمہ "البعث الاسلامی" شمارہ ۴ جلد ۲۷ محرم ۱۴۰۳ھ میں محمد اکرم ندوی کے قلم سے "اصول الدراسة والتعلیم" کے عنوان سے شایع ہوا۔

(ز)

۲۵۔ زہراوین ۔ سورۂ بقرہ و سورۂ آل عمران کی تفسیر۔

(س)

۲۶۔ سطعات (فارسی) در بیان طلسم الٰہی کہ رابطہ است در بیان مجرد محض و عالم شہادت و بعض خواص و آثار آں۔

کتاب کو فلسفۂ الٰہیہ میں سمجھنا چاہئے جس میں فلسفیانہ اور متصوفانہ اصطلاح اور فلسفۂ وحدۃ الوجود کی تعبیرات استعمال کی گئی ہیں اور جس میں حقیقتاً ربط الحادث بالقدیم کے معمّہ کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، کتاب ان اخص الخواص کے مطالعہ کے قابل ہے، جو فلسفۂ قدیم کے پورے رمز شناس اور وحدۃ الوجود کی تائیدی و تردیدی بحثوں کے کوچہ سے آشنا ہوں، عام اشاعت اور دعوت کی چیز نہیں ہے، کتاب میں طبی اصطلاحات اور حکمت طبعیہ کے مضامین کی بھی شمولیت ہے، کتاب میں ان اصولوں کے ماتحت بعض آیات کی لطیف تفسیر بھی ہے، کہیں کہیں اپنی تحقیق سے فلاسفہ اور متکلمین دونوں سے اختلاف ظاہر کیا ہے، تعلیم الٰہی کے اقسام کو بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اس کے اشکال اور صورتوں کو بیان کیا ہے "شخص اکبر" کی اصطلاح جابجا استعمال کی ہے، ہدایت الٰہی و بعثت انبیاء سے بحث کی ہے اور یہ کہ وہ کن کن مظاہر میں ظاہر ہوتی ہے، تجلیات الٰہیہ ان کے اقسام و مظاہر سے بھی بحث کی ہے کل رسالہ چوبیس ۲۴ صفحے میں آیا ہے، مطبع احمدی سے سید ظہیر الدین صاحب کے اہتمام میں شائع ہوا، ۱۹۳۶ء میں مولوی فضل احمد صاحب نے بیت الحکمہ کراچی سے اور ۱۹۶۴ء میں مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی نے شاہ ولی اللہؒ اکیڈمی سے بھی شائع کیا۔

۲۷۔ سرور المحزون (فارسی) ابن سیدالناس کی سیرت پر مشہور کتاب "نور العیون فی سیر الامین المامون" کا خلاصہ ہے اپنے نامور معاصر اور سلسلۂ مجددیہ کے شیخ کبیر حضرت مرزا مظہر جانجاناں کی فرمائش سے تصنیف کیا، اردو میں اس کے متعدد ترجمے شائع ہوئے۔

(ش)

۲۸۔ شرح تراجم ابواب صحیح البخاری (عربی) صحیح بخاری کے تراجم اور عنوانات واحادیث کے مطابق لطائف واسرار پر ۱۳۲۳ھ میں دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہوا، اس کے شروع میں تراجم ابواب البخاری بھی ہے۔

۲۹۔ شفاء القلوب (فارسی) حقائق ومعارف میں ایک رسالہ ہے۔

۳۰۔ شوارق المعرفۃ (فارسی) شاہ صاحبؒ کے چچا شیخ ابوالرضا کے حالات پر مشتمل ہے، انفاس العارفین کا جزء ہے۔

(ع)

۳۱۔ العطیۃ الصمدیۃ فی انفاس المحمدیۃ (فارسی) یہ مختصر رسالہ شیخ محمد پھلتیؒ کے حالات میں ہے، جو شاہ صاحبؒ کے جد مادری تھے "انفاس العارفین" کا جزء ہے، مجموعہ خمسہ رسائل میں بھی شامل ہے۔

۳۲۔ عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید (عربی) باب ششم میں رسالہ کا تعارف گزر چکا ہے۔

العقیدۃ الحسنۃ دیکھئے حسن العقیدۃ۔

(ف)

۳۳۔ فتح الرحمٰن (فارسی) قرآن مجید کا فارسی ترجمہ، باب پنجم میں اس کا تعارف و تذکرہ گزر چکا ہے، مطبع فاروقی دہلی سے ۱۲۹۴ھ میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے فارسی فوائد اور شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے ترجمہ اردو اور فوائد موضح القرآن کے ساتھ شائع ہوا، جو کلکتہ کے مطبوعہ نسخہ کی نقل ہے۔

۳۴۔ فتح الخبیر (عربی) قرآن مجید کے مشکل الفاظ کی تشریح، یہ رسالہ "الفوز الکبیر" کے تتمہ کے طور پر شامل ہے۔

۳۵۔ فم اودود معرفۃ الجنود (عربی) مطبوعہ مصنف کی نظر سے نہیں گذرا مولانا رحیم بخش نے "حیاتِ ولی" میں اس کو اخلاق و تصوف سے متعلق لکھا ہے، لیکن نام سے اس کی وضاحت نہیں ہوتی۔

۳۶۔ الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الأمین (عربی) مطبوعہ، یہ رسالہ مسلسلات کے نام سے معروف ہے، فن حدیث سے متعلق ہے۔

۳۷۔ الفوز الکبیر (فارسی) رسالہ کا تذکرہ و تعارف باب پنجم میں گزر چکا ہے۔

۳۸۔ فیوض الحرمین (عربی) کتاب زیادہ تر قیام حجاز کے زمانہ کے مشاہدات، حقائق باطنی، مسائل کلامی اور مسائل تصوف سے تعلق رکھتی ہے، یہ کتاب بھی خواص کے مطالعہ کی ہے، ان لوگوں کے دسترس سے بالاتر ہے جو فلسفہ اور تصوّف میں پورا درک نہیں رکھتے۔

(ق)

۳۹۔ قُرّۃ العینین فی تفضیل الشیخین (فارسی) حضرات شیخین کی فضیلت کے اثبات میں، متعدد مرتبہ طبع ہو چکا ہے۔

۴۰۔ القول الجمیل فی بیان سواء السبیل (عربی) عربی کا رسالہ ہے، جس میں بیعت کا ثبوت، بیعت کی سنّیت، بعض ابتدائی زمانوں میں اس کے عدم رواج اور پابندی نہ ہونے کے اسباب، حکمت بیعت، شرائط مرشد، شرائط مرید، صوفیا کی بیعت کے اقسام، تکرار بیعت کے حکم سے بحث کی گئی ہے، طریقۂ تربیت اور تعلیم مرید کو بیان کیا گیا ہے، عالمِ حقّانی کے صفات اور تذکیر و وعظ گوئی کے آداب کا ذکر ہے، پھر سلسلۂ قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ کے اشغال و مراقبات اور طریقۂ مجددیہ کے اشغال کا تکملہ بھی ہے اور اصطلاحات کی تشریح بھی، شاہ صاحب نے اپنے خاندانی اعمال و مجرّبات کو بھی درج کر دیا ہے، جو مختلف حالات اور ضرورتوں میں معمول بہا اور آزمودہ ہیں، مختصراً کتاب ان طالبین کے دستور العمل اور ہدایت نامہ کی حیثیت رکھتی ہے، جو ان سلاسلِ ثلاثہ میں کسی سے منسلک ہوں، اور ان کو سنت حقّہ کا اہتمام اور دعوت و اصلاح کا بھی ذوق ہو۔

کتاب کا مطالعہ کرنے والے کو اس کتاب میں کہیں کہیں وہ محدثانہ و مجتہدانہ رنگ نظر نہیں آئے گا، جو شاہ صاحب کی اہم و مشہور کتابوں کی خصوصیت ہے، بلکہ اس کے بعض مندرجات توحید کے بارہ میں شاہ صاحب کے معروف عالمانہ اور مصلحانہ مسلک سے میل نہیں کھاتے، مثلاً اصحابِ کہف کے ناموں کے بارہ میں لکھا ہے،
"أسماء أصحاب الکهف امان من الغرق والحرق والنهب والشرق"[۱]
پھر ان کے نام لکھے ہیں، حالانکہ یہ نام بھی کسی صحیح حدیث یا قطعی الثبوت ذریعہ سے ثابت نہیں ہیں۔

---

[۱] نسخہ مطبوعہ مصر، مطبع الجلیہ مصر سنہ ۱۲۹۰ھ ص ۳۹

اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ کتاب سفرِ حرمین (۱۱۴۳ھ سے ۱۱۴۵ھ) کے پیشتر کی تصنیف ہے اس کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ کتاب میں جہاں اپنے مشائخِ تصوّف ان کی اجازت اور خرقوں کا ذکر کیا ہے وہاں اپنے محبوب و مربّی استاذ شیخ ابوطاہر مدنی کا ذکر نہیں ہے حالانکہ "الجزء اللّطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف" میں اس کی صراحت موجود ہے شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"ولبست الخرقۃ الصوفیۃ عن الشیخ ابی طاھر المدنی رحمہ اللہ ولعلھا حاویۃ لخرق الصوفیۃ کلھا"[۱]

حدیث کی اسانید اور ان کے شیوخ میں بھی والد ماجد (حضرت شاہ عبدالرحیم) اور حاجی محمد افضل کا ذکر کیا ہے شیخ ابوطاہر اور شیوخ حجاز میں سے کسی کا ذکر نہیں ہے حالانکہ اس موقعہ پر یہ ضروری اور ہر طرح قرین قیاس تھا۔[۲]

---

[۱] الجزء اللطیف ص ۵ مطبوعہ سلفیہ لاہور۔

[۲] ڈاکٹر مظہر بقا نے اپنی کتاب "اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ" (مطبوعہ ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد پاکستان) میں لکھا ہے: "یہ کتاب سفرِ حرمین کے بعد کی ہے"۔ (ص ۶۵)

لیکن یہ ایک مفروضہ سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا کہ "یہ کتاب سفرِ حرمین کے بعد کی ہے" قرائن اور داخلی شہادتیں جیسا کہ اوپر گذرا اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ کتاب شاہ عبدالرحیم صاحب کی وفات ۱۱۳۱ھ اور سفرِ حج ۱۱۴۳ھ کے درمیان کی ہے، جب شاہ صاحب کے منتسبین اور طالبینِ سلوک کا ان کے فرزندِ جلیل (حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ) کی طرف رجوع ہوا۔

° "القول الجمیل" کے کتب خانہ ندوۃ العلماء میں دو قدیم مخطوط نسخے ہیں، ایک نسخہ مولانا سید قطب الہدیٰ حسنی (م ۱۲۳۶ھ) کے قلم کا ہے، جو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے ممتاز تلامذہ میں ہیں، اور وہ مستند اور قدیم العہد نسخہ ہے جو مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ کے کتب خانہ کا ہے، جو کتب خانہ ندوۃ العلماء میں محفوظ ہے، دوسرا نسخہ نواب سید صدیق حسن خانؒ کے کتب خانہ کا ہے۔

پھر بھی اس کتاب میں شاہ صاحب کا اصلاحی رنگ نمایاں ہو کر رہا ہے صوفیہ کی عبادت کے بعض طریقوں مثلاً صلوۃ معکوس کا اس بنا پر ذکر نہیں کیا ہے کہ اس کا سنت اور اقوالِ فقہا سے ثبوت نہیں ہے اسی طرح مصحف کو آگے پیچھے، دائیں بائیں رکھ کر ضرب لگانے سے اختلاف کیا ہے اور اس کو بے ادبی پر محمول کیا ہے۔ بعض احادیث پر جو ان سلاسل میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سلوک کی تلقین کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں، محدثانہ کلام کیا ہے، شاہ صاحب کا مسلک اور اصلی ذوق اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے:۔

"یہ وصیت ہے کہ صحبت نہ اختیار کرے صوفیان جاہل کی، اور نہ جاہلان عبادت شعار کی، اور نہ فقیہوں کی جو زاہد خشک ہیں، اور نہ محدثین ظاہری کی جو فقہ سے عداوت رکھتے ہیں، اور نہ اصحاب معقول اور کلام کی جو منقول کو ذلیل سمجھ کر استدلال عقلی میں افراط کرتے ہیں، بلکہ طالب حق کو چاہئے کہ عالم صوفی ہو، دنیا کا تارک، ہر دم اللہ کے دھیان میں، حالات بلند میں ڈوبا ہوا، سنت مصطفویہ میں راغب، احدیث اور آثار صحابہؓ کرام کا متجسس، حدیث و آثار کی شرح اور بیان کا طلب کرنے والا، ان فقیہان محققین کے کلام سے جو حدیث کی طرف مائل ہیں تلطف سے، اور ان اصحاب عقائد کے کلام سے جن کے عقائد ماخوذ ہیں سنت سے، جو ناظر ہیں دلیل عقلی میں بطریق تبرع اور عدم لزوم کے، اور ان اصحاب سلوک کے کلام سے جو جامع ہیں علم و تصوف کے، تشدد کرنے والے نہیں اپنے نفوس پر، اور نہ تدقیق سے کام لینے والے سنت نبویہ پر اضافہ کر کے۔"[۱]

---

[۱] شفاء العلیل ص۱۱۶-۱۱۷

اس کتاب میں شاہ صاحب کا تطبیقی ذوق (جو ان کو وراثت میں ملا تھا اور ان کا فطری رجحان تھا) نمایاں ہو کر رہا ہے، انھوں نے مذاہب فقہا میں سے کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر ترجیح دینے کو ناپسند کیا ہے، ان کے نزدیک مناسب یہ ہے کہ ان کو بالاجمال قبولیت کی نظر سے دیکھے اور پیروی اس کی کرے جو صریح اور مشہور سنت کے موافق ہو۔[1]

ہندوستان کے مخطوطہ نسخوں کے علاوہ یہ رسالہ مولانا محمد صادق مدراسی کے مختصر مقدمہ اور تشریحات کے ساتھ ۱۳۹۸ھ میں الحاج منصور محمد کے مطبع (المجلیہ مصر) میں عبدالعال احمد کا کتابت کیا ہوا لیتھو میں چھپا ہے اور کتب خانہ ندوۃ العلماء میں موجود ہے، کتاب کا ترجمہ مولانا خرم علی بلہوری (م ۱۲۷۱ھ) نے ۱۲۶۰ھ میں اردو میں کیا وہ لکھتے ہیں کہ "جو حواشی مصنف قدس سرہٗ اور ان کے خلف الرشید علامۂ عصر مسند دہر مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کے اس کتاب پر صحیح پائے مزید توضیح و تفسیر فوائد کے ساتھ اس کا ترجمہ بھی ذیلی فوائد میں مندرج کر دیا" یہ ترجمہ پہلی مرتبہ ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء میں مطبع درخشانی میں اور دوسری بار ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء میں مطبع نظامی کانپور میں چھپا۔

(ک)

۲۱۔ کشف الغین عن شرح الرباعیتین (فارسی) حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی دو رباعیوں کی خواجہ کے قلم سے شرح ہے، اس شرح کی شرح شاہ صاحبؒ نے فرمائی ہے، مطبع مجتبائی دہلی سے ۱۳۱۰ھ میں شائع ہوئی۔

---

[1] شفاء العلیل ص ۱۱۷

(ل)

۴۲۔ لمعات (فارسی) مطبوعہ، علم تصوف سے متعلق ہے۔

(م)

۴۳۔ المقالۃ الوضیّۃ فی النصیحۃ والوصیۃ (فارسی) "وصیت نامہ" کے نام سے متعدد بار شائع ہو چکا ہے، مطبع مطیع الرحمٰن سے قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی کی شرح کے ساتھ بھی ۱۲۶۶ھ میں دہلی سے شائع ہوا، قاضی صاحب کی تشریحات ان کے مشہور رسالہ ارشاد الطالبین سے ماخوذ ہیں۔

۴۴۔ المقدمۃ السنیۃ فی الإنتصار للفرقۃ السُّنّیۃ (عربی) مجدد صاحبؒ کے رسالہ "ردِّ روافض" کا ترجمہ مع اضافہ فوائد ہے[1]، ٹونک اور بھوپال کے کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں، حال میں مولانا ابوالحسن زید فاروقی مجددی کے اہتمام میں دہلی سے بھی شائع ہوا ہے۔

۴۵۔ المقدمۃ فی قوانین الترجمۃ (فارسی) مطبوعہ فتح الرحمٰن کے شروع میں بھی شامل ہے۔

۴۶۔ المسوّی من أحادیث المؤطّا (عربی) مؤطا کی عربی شرح دہلی سے دوبار اور مکہ معظمہ سے ایک بار شائع ہوئی۔

۴۷۔ مُصفّٰی (فارسی) مؤطا امام مالکؒ کی فارسی شرح ہے جو بڑے فوائد و تحقیقات پر مشتمل ہے، اور شاہ صاحبؒ کی اہم کتابوں میں ہے، جلد اول مطبع فاروقی دہلی اور جلد ثانی مطبع مرتضوی دہلی سے ۱۲۹۳ھ میں طبع ہوئی۔

۴۸۔ المکتوب المدنی (عربی مطبوعہ) ایک اہم مکتوب وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے تقابل میں جو شیخ اسماعیل بن عبداللہ رومی کے نام لکھا گیا،

---

[1] شاہ صاحبؒ نے یہ ترجمہ اپنے استاد شیخ ابوطاہر مدنی کی خواہش اور فرمائش پر ۱۱۴۴ھ میں قیام حجاز کے دوران کیا۔

یہ "التفهیمات الإلٰهیة" میں موجود ہے نیز علیحدہ بھی بعض رسائل کے ساتھ طبع ہوا ہے۔

۴۹۔ مکتوبات مع مناقب امام بخاری وفضیلت ابن تیمیہؒ (فارسی) مولوی عبدالرؤف صاحب مہتمم کتب خانہ نذیریہ نے شائع کیا، یہ کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے، کلمات طیبات کا ایک مکتوب جو امام بخاری کے مناقب میں لکھا تھا، اور ایک مکتوب جو حافظ ابن تیمیہؒ کے دفاع میں لکھا گیا ہے، لے کر جمع کر دیا گیا ہے۔

(ن)

۵۰۔ النبذة الابریزیة فی اللطیفة العزیزیة (فارسی) اس میں شاہ عبدالرحیمؒ کے نانیہالی جد اعلیٰ شیخ عبدالعزیز دہلویؒ اور ان کے اسلاف واخلاف کے حالات ہیں، "انفاس العارفین" کا جزء ہے، مجموعہ خمسہ رسائل مطبوعہ مطبع احمدی میں بھی شامل ہے۔

۵۱۔ النوادر من أحادیث سید الأوائل والأواخر (عربی) مطبوعہ مسلسلات کے ساتھ طبع ہوا ہے۔

(ھ)

۵۲۔ همعات (فارسی) ضخامت ۶۰ صفحے، متوسط سائز، مطبوعہ تحفۂ محمدیہ، دربیان نسبت الی اللہ، تمہید میں کہا گیا ہے کہ "جب اللہ تعالیٰ نے دین محمدیؐ کی حفاظت کا ذمہ لیا اور وہ تمام ادیان پر غالب ہوا، تو تہذیب نفوس عرب وعجم اور ان کے درمیان جو مظالم تھے ان کا ازالہ بوجہ اتم وجود میں آیا، اور چونکہ دین محمدیؐ کا ایک ظاہر ہے ایک باطن، ظاہر کا تعلق صور ومظاہر، تعیین اوقات، اور

اوضاع و مقادیر سے ہے، اور اس کا پورا اہتمام کیا گیا ہے، اور تحریف کا سدِّباب کیا گیا، باطن کا تعلق طاعات کے انوار و آثار کے حصول سے ہے، اس کا تعلق دو چیزوں سے ہے، ظاہر کے حامل وارثین پیغمبر ہیں، جنھوں نے ظاہر شرع کی حفاظت کی، ان میں فقہاء و محدثین، مجاہدین و قاری داخل ہیں، اور باطن کے حامل (جس کا نام احسان ہے) وہ انوار طاعات، حلاوت کے احساس اور اخلاق فاضلہ سے متخلق اور احوال سنیہ کے حامل ہیں، (جو صوفیۂ کرام ہیں) ان پر ہر زمانہ میں ان اشغال کا القاء ہوا، جو اس زمانہ کے لوگوں کی طبیعت کے مناسب تھے، اور ان کے کلام و صحبت میں اللہ تعالیٰ نے ایک جذب و تاثیر عطا فرمائی اور ان کو کرامات اور نور باطن سے نوازا اور ہر سلسلہ میں مخصوص اشغال و اوراد کا تعین ہوا، اور لوگ ان کی پیروی کر کے فائز المرام ہوئے، ہر زمانہ میں ایک خانوادہ کے وابستگان اپنے خانوادہ کو دوسرے خانوادوں پر ترجیح دیتے ہیں، یہ ایک طرح سے صحیح ہے، بعض پہلوؤں سے امتیاز ہوتا ہے، لیکن حصر صحیح نہیں

پھر شاہ صاحبؒ نے ان خانوادوں اور ان خانوادوں سے نکلنے والی شاخوں اور ان کے بانیوں کا تذکرہ فرمایا، اس کے بعد شاہ صاحبؒ نے ان تغیرات کلیہ کا ذکر کیا ہے جو طریق تصوف میں پیش آئے، اور عہد رسالت کے بعد زمانہ کے تغیر سے حصولِ احسان کے جو طریقے اور معالجات تجویز کئے گئے ان کا ذکر کیا، اس بارے میں شاہ صاحبؒ نے جس دقیقہ رسی اور تحلیل و تجزیہ سے کام لیا ہے، وہ انھیں کا حصہ ہے، شیخ اکبر اور ان کے مسلک وحدۃ الوجود کے ظہور میں آنے کا بھی ذکر کیا ہے، آپ نے بتایا ہے کہ

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ مسلکِ تصوف کے سب سے بڑے مقنّن اور مرتّب ہیں، پھر ان کے نزدیک اس کے جو شرائط اور بنیادی ارکان ہیں، ان کا ذکر کیا ہے، پھر اپنے اپنے زمانہ کے جن مجدّدین و مجتہدین نے اپنے زمانہ کی استعداد و مزاج کے مطابق اس کا جو نصاب و دستور العمل مرتب کیا، اس کی تفصیل کی ہے، پھر شاہ صاحبؒ نے اپنے زمانہ کے سالک کے لئے جو نصاب ہونا چاہئے وہ بیان کیا ہے، اور جن چیزوں کی طرف اس کی توجہ ہونی چاہئے اس کو بیان کیا ہے، پھر اس طریق کے موانع اور مضر اسباب کا ذکر کیا ہے، اور ان کا طریقِ علاج بتایا ہے، اس راہ میں جو منزلیں پیش آتی ہیں اُن کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، پھر نسبتوں کا ذکر کیا ہے، اس سلسلہ میں صحابہؓ و تابعین اور جمہور صالحین کی نسبت کا ذکر کیا ہے، اور اس کو احسان سے موسوم کیا ہے، پھر اس کی تعریف کی ہے، پھر مختلف انسانوں کی استعدادات کا ذکر کیا ہے، اور لطائف کو بھی بیان کیا ہے، پوری کتاب دقیق مضامین، لطیف نکات اور ذاتی تجربات سے اس طرح مملو ہے جیسے کوئی حاذق اور طویل تجربہ رکھنے والا طبیب انسانی مزاجوں، اجسام اور صحت و بیماری کے اسباب اور ان کے معالجات پر روشنی ڈالتا ہے۔

۵۳ ۔ ہوامع شرح حزب البحر (فارسی) **مطبوعہ** ۔

INDEX

اشاریہ

"تاریخ دعوت و عزیمت حصہ پنجم ۵"

مرتبہ

محمد غیاث الدین ندوی

شخصیات

سیدنا ونبینا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم

(الف)

(سیدنا حضرت) آدم علیہ السلام ۱۳۲، ۲۲۷
(سیدنا حضرت) ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام
۱۱۹، ۱۵۴، ۲۴۱، ۲۴۲
(سیدنا حضرت) اسماعیل علیہ السلام ۲۴۱
(سیدنا حضرت) ابوبکر صدیق رض ۲۴، ۲۶۰
۲۶۹، ۳۰۳
(ابو محمد مولانا) ابراہیم آروی ۳۶۰
(سلطان) ابراہیم شاہ ۲۸
(شیخ) ابراہیم بغدادی ۱۷۹
(شاہ) ابراہیم چشتی ۲۸۱
(شیخ) ابراہیم کورانی کردی ۱۰۹–۱۱۲
ابراہیم خاں گاردی ۳۱۹
(علامہ) ابراہیم نخعی ۲۰۳
(شیخ الاسلام حافظ) ابن تیمیہؒ ۳۱، ۱۱۱، ۱۱۲
۱۳۵، ۱۶۴، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۷۵، ۱۷۶
۲۴۷، ۲۵۷، ۲۹۴، ۳۹۶، ۳۹۷، ۴۱۳
(علامہ) ابن جوزی ۳۲۴
(علامہ) ابن حزم ۲۰۴، ۲۰۸
(علامہ) ابن خلدون ۲۶، ۱۰۱، ۲۹۹

(علامہ) ابن رشد ۲۴۷
(سلطان) ابن سعود ۲۳
(علامہ) ابن قیم الجوزیہ ۱۶۴
(علامہ) ابن کثیر ۲۶۰
(امام) ابن ماجہ ۳۵
(علامہ) ابواسحاق شیرازی ۳۵
(مولانا سید) ابوالاعلی مودودی ۳۴۱
(امام) ابوالحسن اشعری ۱۴۸
(مولانا) ابوالحسن زید ۴۱۲
(شیخ) ابوالحسن سندھی صغیر ۳۹۳
(علامہ) ابوالحسن سندھی کبیر ۳۲
(علامہ) ابوالحسن علی الماوردی ۲۵۵، ۲۵۷
(مولانا سید) ابوالحسن علی ندوی ۱۴
(علامہ) ابوحیان نحوی ۳۱
(امام) ابوحنیفہ ۲۰۳، ۲۵۵
(امام) ابوداؤد ۳۵، ۲۴۳
(شیخ) ابوالرضا محمد ۷۲–۷۴، ۸۰، ۸۲
۸۶، ۴۰۶
(علامہ) ابوالسعود ۳۴
(حضرت شاہ) ابوسعید دہلوی ۳۵۸
(حضرت شاہ) ابوسعید حسنی رائے بریلوی ۱۰۵، ۱۱۸

۱۱۹، ۱۲۴، ۱۲۷، ۳۸۱، ۹۳ — ۳۸۹
(شیخ) ابوطالب مکی ۲۰۵
(شیخ) ابوطاہر کردی مدنی ۱۶، ۱۲۳، ۱۲۴ - ۱۰۹
۱۸۹، ۱۹۹، ۳۴۸، ۳۸۸، ۴۰۹، ۴۱۲
(مولانا) ابوالعرفان خاں ندوی ۱۳، ۱۸۳
(امیر) ابوالعلاء حسینی اکبرآبادی ۸۲، ۸۳
(میر) ابوالفضل (فوجدار) ۲۸۸
(شیخ) ابوالفیض دہلوی ۳۶۳
(شیخ) ابوالقاسم اکبرآبادی ۸۲، ۸۳
(مولانا سید) ابوالقاسم ہنسوی ۳۹۴
(نواب) ابوالمنصور خاں صفدر جنگ نیشاپوری
۳۶۳
ابوالنصر فارابی ۳۸۴
(سید) ابونبی ۲۳
(حکیم) ابوالوفاء کشمیری ۳۱۵
آپاجی سندھیا ۳۱۹
(مولوی) احسن مارہروی ۱۲۸
(شیخ) احمد ۶۹
(ڈاکٹر) احمد امین مصری ۳۹۶
(مولانا) احمد بن ابوسعید امیٹھوی (ملا جیون)
۵۹
(سلطان) احمد ثالث ۲۰
(سرسید) احمد خاں ۱۲۸
(شیخ) احمد بن اسماعیل مانڈوی ۱۶۹
(امام) احمد ابن حنبل ۲۰۳

(مولانا سید) احمد حسن امروہی ۲۲۳، ۳۶۰
(مولانا سید خواجہ) احمد حسنی نصیرآبادی ۳۸۰
(نواب سید) احمد روہیلہ ۳۰۵
(حضرت شاہ) احمد سعید دہلوی ۳۵۸
(حضرت سید) احمد شہیدؒ رائے بریلوی ۹۲، ۳۰۰
۱۱۹، ۱۴۲، ۲۸۶، ۳۲۱، ۳۴۰، ۳۴۴
۳۵۹، ۳۶۹، ۳۷۳-۷۱، ۳۸۰، ۳۸۶
۳۹۴، ۳۹۸
(مولانا) احمد علی سہارنپوری ۳۵۹
(مولوی) احمد علی خیرآبادی ۱۰۶
(شیخ) احمد علی ۱۱۰، ۱۱۲
(مولانا) احمد اللہ شاہ مدراسی ۳۷۲
(نواب فیروز جنگ نظام الملک) احمد شاہی
۳۰۵، ۳۰۶
(سلطان) احمد شاہ بن محمد شاہ ۴۶
(درِ دوراں) احمد شاہ ابدالی (درانی) ۱۷
۲۹، ۳۰، ۵۷، ۲۸۰، ۲۸۴، ۲۹۳، ۲۹۶
۳۰۵، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۵-۳۱۲، ۳۲۰-۳۱۸
۳۶۶
(حضرت شیخ) احمد فاروقی مجددؒ دیکھئے مجدد الف ثانی
(سید) احمد کبیر ۹۳
(حضرت سید) آدم بنوری ۷۵، ۸۱، ۸۴
۳۴۴
آدینہ بیگ ۲۷۶
(سیدہ بی بی) ارادت خاتون ۱۰۶، ۳۸۷

(گرو) ارجن ۲۸۱، ۲۸۲
ارجن دیو ۱۰۶
(شاہ) ارزانی بدایونی ۶۷
(مولانا) آزاد بلگرامی دیکھئے غلام علی
اسٹینلی لین پول ۴۳، ۴۴، ۴۵
(امام) اسحاق ابن راہویہ ۲۰۳
(شاہ) اسحاق دہلوی دیکھئے محمد اسحاق
(مولانا سید) اسحاق بن عرفان رائے بریلوی ۲۸۶
(مولوی) اسلمی مدراسی ۳۶۵
(علامہ) اسماعیل حقی ۳۳
(مولانا) اسماعیل شہیدؒ دیکھئے محمد اسماعیل
(سلطان) اسماعیل صفوی ۳۵
(شیخ) اسماعیل بن عبداللہ روی ۴۱۲
(شیخ) اسماعیل عجلونی (الجراحی) ۳۲
(شیخ مخدوم) اسماعیل فقیہ السکری صدیقی ۱۹۹
(سلطان) اشرف خاں ۲۶
(حکیم الامت مولانا) اشرف علی تھانوی ۳۹۹
اصغر خاں (تورانی) ۲۸۸
(نظام الملک نواب) آصف جاہ ۵۲، ۵۶، ۳۰۵، ۳۰۶
(علامہ) اقبال ۴۴، ۵۵، ۵۸، ۲۸۶، ۲۹۵، ۳۷۳، ۳۷۹، ۳۹۶
(سلطان) اکبر ۳۶، ۵۳، ۲۸۱، ۳۲۰
(شیخ) اکبر دیکھئے محی الدین ابن عربی
(ملک) الپ ارسلان ۲۵۶
(مفتی) الٰہی بخش کاندھلوی ۳۴۸، ۳۵۸، ۳۸۱
(ماونٹ اسٹوارٹ) الفنسٹن ۲۱، ۲۷۹
(مولانا) امام الدین دہلوی ۳۸۱
(بی بی) امۃ العزیز ۱۰۷
(حضرت حاجی) امداد اللہ مہاجر مکی ۳۴۴، ۳۷۲
(گرو) امرداس ۲۸۱
(مولانا) امیر احمد سہسوانی ۳۶۰
(نواب) امیر خاں ۳۷۱
(مولانا سید) امیر علی ملیح آبادی ۳۶۰
(شیخ) امین الدین بن حمید الدین علوی کاکوروی ۳۹۳
(مولانا سید) انور شاہ کشمیری ۳۶۰
(سلطان) اورنگ زیب عالمگیر ۳۰، ۴۲، ۴۳، ۴۵-۵۰، ۵۳، ۵۵، ۷۳، ۷۷، ۸۴، ۸۵، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۹۵، ۳۲۰
(مولانا) اولاد حسن قنوجی ۳۵۸
(شاہ) اہل اللہ ۸۸، ۱۲۷، ۳۹۴

ب پ

(سلطان) بابر ۵۵
(امام) باقر بن امام زین العابدین ۱۰۶
(میر) باقر داماد ۳۶

(خواجہ) باقی باللہ ۸۱، ۸۳، ۸۴، ۲۱۱
بالاجی ۳۱۹
(امام) بخاری ۱۸۹، ۲۱۳
(شاہ) بدیع الدین مدار مکنپوری ۳۳۰
(قاضی) بدہ ۶۹
(سید) برکات (شریف مکہ) ۲۳
(ڈاکٹر) برنیر (BERNIER) ۴۴
(مولانا) بزرگ علی مارہروی ۳۵۹
بسواس راؤ ۳۱۹
(شاہ) بشارت اللہ بہرائچی ۳۵۹
(مولوی) بشیر الدین ۱۱۵
(امام) بغوی ۱۲۸
بندہ بیراگی ۲۸۳، ۲۸۴
بوعلی سینا ۳۸۴
(نواب) بہادر خاں بلوچ ۳۱۴
(شاہ عالم) بہادر شاہ اول (محمد معظم) ۴۶-۴۹
[illegible] ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۷
(سلطان ابو ظفر) بہادر شاہ ۳۰۴
[illegible]
[illegible] ۱۲۹
[illegible]
[illegible] ۳۰۷
[illegible] ۱۰۶
[illegible] ۳۵۹
[illegible] ۳۶

ت ٹ ث
(علامہ) تاج الدین سبکی ۷۸
(شیخ) تاج الدین قلعی حنفی ۱۱۲، ۱۹۹
تاج محمد خاں بلوچ ۳۰۵
(شیخ) تاج محمود جونپوری ۷۳
(شیخ الاسلام) تقی الدین ابن دقیق العید ۳۱
(علامہ) تقی الدین سبکی ۷۸
(گرو) تیغ بہادر ۲۸۳
(شہزادہ) تیمور ۲۸۴
(سلطان) تیمور شاہ ۳۰
(سلطان شہید) ٹیپو سلطان ۳۴۷
(قاضی) ثناء اللہ پانی پتی ۱۹۰، ۲۱۲
(سید) ثناء اللہ سونی پتی ۱۰۵

ج چ
(سیدنا حضرت) جابر بن عبداللہ ۱۹۱
مولوی جار اللہ (نزیل [illegible]) ۳۴۷
(مولانا) جامی [illegible]
(مرزا) جان [illegible]
[illegible] جان جاناں [illegible]
[illegible]
[illegible] علی وردی خاں
(سر) جدوناتھ سرکار ۴۳، ۵۷، [illegible] ۱۸۰
۳۰۶، ۳۱۹
(سردار) جسا سنگھ کلالی ۲۸۷
(امام) جعفر صادق ۱۰۶

(شیخ) جلال ۷۵
(پیر) جلال ۲۸۱
(شیخ) جمال ۷۱
(مولانا) جمال الدین بن محمد صدیق قطب ۳۹۳
(مدارالمہام مولانا) جمال الدین خاں ۲۷۳، ۲۲۱
(میر) جملہ ۴۲
جمیل الدین بدایونی علیگ ۴۱
(حضرت) جنید بغدادی ۴۱۵
(مرزا) جواں بخت ۳۲۰، ۲۷۷
(شیخ) جوہر کشمیری ۱۷۹
(شہنشاہ) جہانگیر ۳۲۰، ۲۸۲
جی سندھیا ۳۱۹
J.P. CUNNINGHUM ۲۸۲
جندوکال ۲۸۲

ح

(ملا) حامد ۸۵
(مولوی سید) حامد حسین کنتوری ۳۶۲، ۳۶۱
(نواب صدر یار جنگ مولانا) حبیب الرحمن خاں شروانی ۳۶۵
حریری ۱۰۲
(سالار) حسام الدین ۹۷
(سیدنا امام) حسنؓ ۳۵۴، ۲۷۱، ۲۲۰
(شیخ سید) حسن ۲۸۱
(امام) حسن بصری ۲۰۱، ۱۹۱، ۹
(شیخ) حسن بن محمد السلقی (نظام نیشاپوری دولت آبادی) ۱۳۵
(شیخ) حسن العجمی ۱۱۲، ۱۱۰، ۳۳
(سید) حسن علی خاں ۳۶۳
(مرزا) حسن علی شافعی لکھنوی ۳۸۶، ۳۵۸
(سبط اکبر سیدنا) حسن مجتبیٰ ۲۷۱
(سیدنا امام) حسینؓ ۲۲۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۹۱، ۳۵۴
(مولانا) حسین احمد مدنی ۳۶۰
(مولانا) حسین احمد ملیح آبادی محدث ۳۵۸
(سلطان) حسین شاہ ۲۶
(سید) حسین علی خاں ۳۶۳
(امیر الامراء) حسین علی خاں ۵۰، ۵۱، ۵۳، ۶۲
(الامام المنصور باللہ) الحسین بن المتوکل علی اللہ ۲۵
(ملا) حمد اللہ سندیلوی ۵۹
(سیدہ) حمیرہ بنت علم الہدیٰ ۳۸۷
(امیر) حیدر بن نور الحسین بلگرامی ۳۵۰
(مولانا) حیدر علی رامپوری ٹونکی ۳۵۸، ۳۷۵، ۳۸۱
(علامہ) حیدر علی فیض آبادی ۳۸۱، ۳۵۷

خ

(سیدنا حضرت) خالدؓ ۲۶۹
(ام المؤمنین حضرت) خدیجہؓ ۳۸۰
(امیر) خافی خاں ۲۸۸
(سلطان) خدیو محمد علی ۴۱
(مولانا) خرم علی بلہوری ۴۱۱، ۳۵۸
(شہزادہ) خسرو ۲۸۲
(علامہ) خطابی ۲۱۹

(حضرت مولانا) خلیل احمد سہارنپوری ۳۶۰
(مولانا) خلیل احمد اسرائیلی ۲۲۱
(امیر) خلیل پاشا ۲۲
خلیفہ چلپی ۳۴
(پروفیسر) خلیق احمد نظامی ۱۸۱، ۲۸۷، ۲۸۸
۲۹۶، ۳۰۷، ۳۱۰، ۳۲۰
(امیر) خورد ۶۵
(خواجہ) خورد دیکھئے عبداللہ
(مفتی) خیرالدین ۳۷۷

د ڈ ذ

داتاجی سندھیا ۲۷۶
(مولانا سید) داؤد غزنوی ۳۶۰
(مولوی) دلدار علی مجتہد ۳۶۲
(محقق) دوانی ۳۶، ۱۰۰
(نواب) دوندے خاں روہیلہ ۳۰۷
ڈی پی مہاجن ۴۲
(مولوی) ذکاء اللہ دہلوی ۴۸، ۲۴۹، ۲۷۸
۲۸۹، ۳۰۶، ۳۱۸، ۳۱۹
(استاد) ذوق ۳۵۱

ر

(شیخ) راجح بن داؤد گجراتی ۱۷۹
راجہ رام ۲۸۸
(امام) رازی ۲۴۷
(علامہ) راغب اصفہانی ۳۸۶
رام چہرہ ۲۸۸
رتن چند ۵۰
(راجہ) رتن سنگھ ۵۰
(مولانا) رحیم بخش ۴۰۷
(سلطان شاہ) رُخ مرزا ۲۸
(مولانا) رستم علی قنوجی ۵۹
(مولوی) رشید احمد انصاری ۱۵۸
(حضرت مولانا) رشید احمد گنگوہی ۳۶۰
(مولانا) رشیدالدین دہلوی ۳۸۱
(علامہ سید) رشید رضا مصری ۱۸۳
(سلطان) رفیع الدرجات ابن رفیع القدر ۴۶
۴۷، ۵۴
(سلطان) رفیع الدولہ ابن رفیع القدر ۴۶
۴۷، ۵۴
(شیخ) رفیع الدین چشتی شیرازی ۱۷۹
(شاہ) رفیع الدین دہلوی ۱۰۶، ۱۲۲، ۱۲۸
۱۴۹، ۱۵۰، ۳۴۵، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۸۱
۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۷، ۳۸۹، ۴۰۴
(شیخ) رفیع الدین محمد ۷۳، ۷۹، ۸۲
رگھوبا ۲۸۴
رگھوناتھ راؤ ۲۷۶
(آیۃ اللہ العظمیٰ الامام) روح اللہ الخمینی ۲۵۲
(مہاراجہ) رنجیت سنگھ ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۹

ز

(مرزا قاضی) زاہد ہروی (میرزاہد) ۳۷، ۳۸، ۸۲
(علامہ) زرکلی ۱۱۰

(علامہ) زمخشری ۳۸۶
(علامہ) زیلعی ۱۹۶
(امام) زید بن زین العابدین ۲۴
(نواب) زینت محل ۱۵۷،۳۲۰،۳۲۱
(شیخ مخدوم) زین الدین ملیباری ۱۹۹

(س)

(شیخ) سالم بن عبداللہ بصری ۱۱۳
ساجی سندھیا ۲۷۶
(ڈاکٹر) ستیش چندر ۷۸
(شیخ) ستدو ۶۳
سراج الدولہ ۳۶۷
(شیخ) سعد بن احمد نجدی ۳۶۰
(شیخ) سعدی ۴۴،۱۴۷،۲۶۱
(سلطان) سعود بن عبدالوہاب ۲۱
(شیخ) سعید کوکنی [illegible]
(نواب) سکندر بیگم ۳۵۷
(سلطان) سکندر لودھی ۷۵
(سلطان) سلیم ۲۳
(شیخ) سلیمان بن الاہدل ۳۳
(شاہ) سلیمان چترالی ۳۶۹
(سلطان) سلیمان قانونی ۲۵
(مولانا سید) سلیمان ندوی ۶۴،۱۴۷،۲۹۲
(سلطان) سنان پاشا ۲۵
(ملک) سنجر ۲۶۱
سندھیا ۵۸

(راجہ) سورج مل ۲۸۹،۲۹۶
سیتلا دیوی ۶۳،۱۳۸
(شیخ) سید سابق مصری ۲۲۱
(سلطان العلماء) سید محمد ۳۶۲

(ش)

(امام) شافعی ۲۰۳،۲۰۷،۲۱۳
شاہ جہاں بادشاہ ۴۴،۲۸۲،۲۸۸،۳۲۰
[illegible] ۲۷۷
[illegible] ۲۵۶
[illegible] بن عزیز الدین ۴۶
[illegible] ۴۷،۵۰،۵۸
[illegible] خان گوہر ۲۴۷،۳۱۹،۳۲۰،۳۲۱،۳۶۷
[illegible] ۴۳،۲۴۷
[illegible] ۷۳
شجاع الدولہ ۱۵۷،۲۸۰،۳۰۷
[illegible] ۲۰–۳۱۸،۳۶۳،۳۶۷
(نواب) شجاع الملک ۳۶۸
(امام) شرف الدین ۲۵
(شاہ) شرف الدین ۲۸۱
(امیر) شریف حسین ۲۳
(علامہ سید) شریف علی جرجانی ۱۴۵
(امیر) شکیب ارسلان ۳۹
(مولوی) شمس تبریز خاں ۱۳،۱۴۷
(مولانا) شمس الحق ڈیانوی ۳۶۰
(شیخ) شمس الدین مفتی ۶۹–۶۵

(علامہ) شمس الدین ذہبی ۳۱
شمشیر بہادر ۳۱۹
شنکر راؤ ۲۷۷
(شیخ) شہاب الدین احمد مصری ۱۷۹
(ملک العلماء شیخ) شہاب الدین دولت آبادی ۱۰۰
(سلطان) شہاب الدین غوری ۱۰۶
(علامہ) شہاب الدین محمود آلوسی ۲۷۹
(شیخ) شہاب الدین سہروردی مقتول ۳۶
(مولانا) شیخ الاسلام شارح بخاری دہلوی ۱۸۱، ۱۸۲
شیواجی ۲۷۹

ص ض

(مولانا مفتی) صدر الدین دہلوی ۲۵۴، ۲۵۸، ۳۸۱
(علامہ میر) صدر الدین شیرازی ۳۶، ۱۰۰، ۱۵۲
(امیر الملک نواب سید) صدیق حسن خاں بہادر ۱۹۱، ۲۲۱، ۳۷۵، ۳۸۰، ۴۰۹
(امام) صغانی ۱۷۸
(شیخ) صفۃ اللہ خیر آبادی ۵۹
(نواب) صفدر جنگ ۲۷۶
(شیخ) صلاح الدین بن شاہ عبدالرحیم ۸۸، ۹۷، ۱۰۵
(شیخ) صلۃ بن اشیم العدوی ۱۹۱
(حضرت حافظ) ضامن شہید ۳۷۲
(شیخ) ضیاء الدین مدنی ۱۷۹

ط ظ

طاش کبری زادہ ۳۴
طباطبائی دیکھئے غلام حسین
(شاہ) طہماسپ صفوی ۲۶، ۳۶
(سلطان) ظاہر شاہ ۳۰
(شیخ) ظہور الحق پھلواروی ۳۵۹
(مولوی) ظہور اللہ مراد آبادی ۳۴۷
(سید) ظہیر الدین احمد دہلوی ۳۶۶، ۳۹۹، ۴۰۵

ع

(سیدنا حضرت) عزیرؑ ۱۳۵
(ام المؤمنین حضرت) عائشہؓ ۲۴۲، ۳۶۴
(سیدنا حضرت) عمر فاروقؓ ۲۴، ۶۶، ۲۱۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۳۰۳
(سیدنا حضرت) عثمانؓ ۲۷۱
(سیدنا حضرت) علی مرتضیٰؓ ۲۴، ۲۸، ۷۷، ۲۷۰، ۲۷۱
عالمگیر اعظم دیکھئے اورنگ زیب
(شیخ الاسلام) عارف حکمت بے ۳۶۵
(مولانا سید) عالم علی مراد آبادی ۳۵۹
(شاہ) عباس صفوی ۳۶
(مولوی) عبدالاحد ۳۷۶
(شیخ) عبدالاحد بن خواجہ محمد سعید سرہندی ۱۱۳
(شیخ) عبدالاول حسینی ۱۸۰
(شیخ) عبدالجبار غزنوی ۳۶۰
(مولانا) عبدالحق حقانی ۱۴۵، ۲۲۱، ۲۲۵، ۲۴۸
(شیخ) عبدالحق محدث دہلوی ۹۵، ۱۱۰، ۱۱۸، ۱۸۱
(شیخ) عبدالحکیم بن شیخ وجیہ الدین ۷۴، ۸۰
(ملا) عبدالحکیم سیالکوٹی ۸۱، ۱۱۰

(مولانا) عبدالحلیم لکھنوی ۷۸
(مولانا) عبدالحی بن ہبۃ اللہ بڈھانوی ۳۴۸
۳۵۹، ۳۷۷، ۳۸۵
(شیخ) عبدالحی ۸۰
(مولانا حکیم سید) عبدالحی حسنی ۷۰، ۸۵، ۱۰۱
۱۱۶، ۱۴۲، ۱۷۷، ۱۸۳، ۳۴۶، ۳۶۱
۳۹۰، ۴۰۹
(مولانا) عبدالحی فرنگی محلی ۷۸، ۲۵۱
(پیر) عبدالرحمٰن ۲۸۱
(قاری) عبدالرحمٰن پانی پتی ۳۵۹
(مولانا) عبدالرحمٰن مبارکپوری ۳۶۰
(حضرت شاہ) عبدالرحیم ۳۸، ۶۷، ۷۰، ۷۱
۷۳–۸۹، ۹۷، ۹۸، ۱۰۰، ۱۰۳، ۱۰۴
۱۲۸، ۱۲۹، ۱۴۸، ۳۰۵، ۴۰۱، ۴۰۹، ۴۱۳
(مولوی) عبدالرؤف ۴۱۳
(حضرت سید) عبدالرزاق بانسوی ۶۰
(مولوی) عبدالرزاق کانپوری ۲۵۶
(میر) عبدالسلام بدخشی ۳۹۳
(مولانا) عبدالشکور فاروقی لکھنوی ۲۷۴
(مولوی) عبدالعال احمد (کاتب) ۴۱۱
(شاہ) عبدالعدل دہلوی ۳۸۵
(حضرت شاہ) عبدالعزیز دہلوی ۳۷، ۶۰
۹۲، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۸، ۱۱۱، ۱۱۵–۱۷
۱۲۲، ۱۳۷، ۱۴۲، ۱۵۰، ۱۹۰، ۲۸۶
۲۹۱، ۳۰۷، ۳۲۱، ۳۴۰، ۳۴۵،
۳۴۶، ۳۴۹–۵۶، ۳۶۱، ۳۶۳
۳۶۵، ۳۶۷، ۳۷۱، ۳۷۳، ۳۷۵
۳۷۷، ۳۷۹–۸۲، ۳۸۵–۸۷، ۳۸۹،
۳۹۰، ۳۹۴، ۴۰۷، ۴۰۹، ۴۱۱
(شیخ) عبدالعزیز شکربار ۷۳، ۸۲، ۸۴
۱۲۸، ۴۱۳
(ڈاکٹر) عبدالعظیم الدیب ۲۵۶
(شاہ) عبدالغنی دہلوی ۱۰۶، ۳۴۵
۳۴۸، ۳۸۵، ۳۸۷
(شیخ) عبدالغنی نابلسی ۳۳
(حضرت شاہ) عبدالغنی مجددی مہاجر مدنی
۱۹۱، ۳۶۰
(شیخ) عبدالغنی بن عبدالحکیم ۶۹
(شیخ) عبدالفتاح ابوغدہ ۱۹۵
(سیدنا) عبدالقادر جیلانی ۷۷، ۱۲۸
(مولانا) عبدالقادر خان خالص پوری
۳۹۳
(حضرت شاہ) عبدالقادر دہلوی ۱۰۶
۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۳۴۵
۳۴۸، ۳۴۹، ۳۸۱، ۳۸۵–۸۷، ۴۰۷
(مفتی) عبدالقیوم بڈھانوی ۳۵۹
(خلیفہ سید) عبداللہ ۳۹۸
(مولانا) عبداللہ ۳۷۴
(حافظ سید) عبداللہ ۸۱، ۸۲
(مولانا) عبداللہ آفندی ۳۹۳

(ملا) عبداللہ امیٹھوی ۱۱۸، ۳۹۱
(شیخ) عبداللہ بصری ۱۱۰
(شیخ) عبداللہ بن ادریس حسنی سنوسی ۳۶۰
(شیخ) عبداللہ بن ابراہیم انصاری ۲۵۶
(شیخ) عبداللہ بن حسین السویدی ۳۳
(قطب الملک) عبداللہ خاں (حسن علی) ۵۰، ۵۱، ۵۳
(امیر) عبداللہ بن سعود ۲۱
(شیخ) عبداللہ بن سالم بصری ۱۱۲
(شیخ) عبداللہ بن عبدالباقی (خواجہ خورد) ۸۱، ۸۲، ۴۰۴
(شیخ) عبداللہ سراج مکی ۳۸۰
(شیخ) عبداللہ بن عبدالغنی ۹۹
(شیخ) عبداللہ سلطانپوری ۱۷۹
(مولانا حافظ) عبداللہ غازیپوری ۳۶۰
(عارف باللہ سید) عبداللہ غزنوی امرتسری ۳۵۹
(شیخ) عبداللہ لاہوری ۱۱۰
(شیخ) عبداللہ ملتانی ۱۰۰
(شیخ) عبداللطیف حسینی مصری ۳۹۳
(مولانا) عبدالماجد دریابادی ۳۹۸
(شیخ) عبدالمعطی مکی ۱۷۹
(شیخ) عبدالملک ۶۹
(امام الحرمین ابوالمعالی) عبدالملک الجوینی ۳۵، ۲۵۶
(خلیفہ) عبدالملک بن مروان ۲۷۰
(مولانا) عبدالمنان وزیرآبادی ۳۵۹
(شیخ) عبدالنبی گنگوہی ۱۷۹
(حافظ) عبدالنبی (عبدالرحمن) ۳۹۱
(شیخ) عبدالوہاب متقی ۱۹۹
(شیخ) عبیداللہ ۷۶
(خواجہ) عبیداللہ احرار ۸۳
(شیخ) عبیداللہ پھلتی صدیقی ۱۰۳، ۱۱۳، ۳۹۲
(نواب) عبیداللہ خاں کشمیری ۳۰۵
(مولانا) عبیداللہ سندھی ۱۹۲، ۳۹۰
(مولوی) عتیق احمد ۱۳
(سلطان) عثمان ثالث ۲۰، ۲۱
(شیخ) عجیمی دیکھئے حسن
عرفی (شاعر) ۲۹۹
(شیخ الاسلام) عزالدین بن عبدالسلام ۲۱۹
(سلطان) عزیزالدین عالمگیر بن جہاندار شاہ ۴۶
(شیخ) عزیزاللہ ملتانی ۱۰۰
(مولانا) عطاءاللہ حنیف ۲۲۱
(علامہ) علاءالدین الباجی ۳۱
(علامہ) علال الفاسی مراکشی ۲۱۶
(حضرت شاہ) علم اللہ حسنی ۱۱۸، ۱۱۹
(شاہ) علم الہدیٰ نصیرآبادی ۳۸۷
(شیخ) علی اصغر قنوجی ۵۹
(مولانا مفتی) علی کبیر مچھلی شہری ۳۵۸
(امیر) علی بے ۲۲

(سلطان) علی قلی عادل شاہ ۲۸
(حکیم) علی گیلانی ۱۸
(علامہ ملا) علی قاری ۱۷۵، ۱۹۹
(علامہ) علی متقی برہانپوری ۱۷۴، ۱۷۶، ۱۹۹
(شیخ) علیم اللہ مانڈوی ۱۷۹
(وزیر) عماد الملک ۳۰۵
(خلیفۃ المسلمین) عمر بن عبد العزیز ۹
(مفتی) عنایت احمد کاکوروی ۳۵۹
(قاضی) عیاض رح ۲۴۲

غ

غازی الدین خاں ۱۱۳
غازی میاں ۶۳
(حجۃ الاسلام امام ابو حامد) الغزالی
دیکھیے محمد الغزالی
غلام حسین طباطبائی ۴۷، ۴۹، ۵۲
(مولوی محمد) غفران ندوی ۱۳
(شیخ) غلام حسین مکی ۳۴۷
غلام حیدر خاں ۳۷۰
(مولانا) غلام رسول مہر ۲۸، ۳۷۶
(مولانا) غلام رسول قلعوی ۳۶۰
(مولانا) غلام علی آزاد بلگرامی ۳۶، ۵۹،
۶۱، ۲۷۹
(حضرت شاہ) غلام علی دہلوی ۱۱۶، ۳۵۸
(مولانا سید) مصطفیٰ قاسمی ۴۰۵
غلام قادر روہیلہ ۵۸

(مولانا) غلام نقشبند لکھنوی ۵۹
(حضرت) غوث الاعظم دیکھیے
عبد القادر جیلانی
(میر) غیاث الدین منصور ۳۶، ۱۰۰
(محمد) غیاث الدین ندوی ۱۳

ف

(امیر) فتح اللہ شیرازی ۱۸، ۳۶، ۱۰۰
(شاہ) فخر الدین دہلوی (شاہ فخر) ۶۰
(شاہ) فخر العالم ۱۰۵
(سیدہ) فخر النساء ۹۸
(سلطان محمد) فرخ سیر ابن عظیم الشان
۳۶، ۴۷، ۵۰، ۵۱، ۸۹، ۲۸۴، ۲۹۶
(شیخ) فرید ثانی (پٹنی) ۲۸۱
(مولوی) فضل احمد کراچی ۴۰۵
(مولانا) فضل حق خیرآبادی ۲۵۰، ۳۸۵
(حضرت مولانا) فضل رحمٰن گنج مرادآبادی
۳۵۹
(بابا) فضل اللہ ۱۲۲
(شیخ مخدوم) فقیہ علی مہایمی ۱۹۹
(مسٹر) فریر ۳۱۳
(شیخ) فیروز ۷۱

ق

(میر) قاسم ۵۷
(میر) قاسم علی ۱۲۲
قاسم بن حسین (امام یمن) ۷۵

(شیخ) قاضی خاں ظفرآبادی ۷۳
(شیخ) قرہ بن خالد السدوسی ۱۹۱
(شیخ) قطب الدین ۶۹
(نواب) قطب الدین دہلوی ۳۵۹
(شیخ) قطب الدین احمد ۳۶۳
(خواجہ) قطب الدین بختیار کعکی ۹۸
(شیخ) قطب الدین عباسی گجراتی ۱۷۹
(امیر کبیر سید) قطب الدین نجد المدنی ۹۲
(علامہ) قطب الدین نہروالی (مکی) ۱۲۵، ۱۹۹
(شیخ) قطب العالم ۷۳
(مولانا سید) قطب الہدیٰ حسنی محدث رائے بریلوی
۱۴۲، ۳۲۸، ۳۵۸، ۴۰۹
(نواب) قمر الدین خاں ۵۶، ۶۲
(سید) قمر الدین سونی پتی ۳۴۸

(ک گ)

(شہزادہ) کامران ۳۷۰
(مولانا) کرامت علی جونپوری ۳۷۶
(سلطان) کریم خاں زند ۲۸
(شاہ) کلیم اللہ جہان آبادی ۶۰
(شیخ) کمال الدین مفتی ۶۹
C. COLLIN DAVIES ۳۱۳
(ڈاکٹر) گنڈا سنگھ ۳۱۳
گنگا رام (شاعر) ۲۷۸
گوبند رائے بندیلہ ۲۷۶، ۲۸۳

(ل)

(سلطان) لطف علی ۲۸
(استاذ العلماء مولانا) لطف اللہ علیگڑھی
۳۵۹
(ڈاکٹر) لوتھراپ اسٹاڈرڈ
(LOTHROP STODDARD) ۳۹
(مولانا) لیاقت علی الہ آبادی ۳۷۲
(لارڈ) لیک ۵۸

(م)

سیدنا حضرت مسیح علیہ السلام ۱۳۵
(امام) مالک ۲۰۳، ۳۹۹، ۴۱۲
ماوردی دیکھئے ابوالحسن علی
ماؤنٹ اسٹوارٹ الفنسٹن دیکھئے الفنسٹن
(قاضی) مبارک گوپاموی ۵۹
(میاں) متھا ۲۸۱
(امام ربانی) مجدد الف ثانی (شیخ احمد سرہندی)
۱۰، ۵۱، ۸۳، ۸۴، ۸۸، ۱۳۷، ۳۲۹، ۳۴۴، ۳۴۳، ۳۶۲، ۴۱۲
(نواب) مجد الدولہ بہادر ۳۰۵
(قاضی) محب اللہ بہاری ۵۹، ۳۶۱
(مولانا سید) محبوب علی جعفری ۳۸۶
(علامہ) محسن بن یحییٰ ترہتی ۱۱۰، ۲۵۰، ۳۵۲
۳۶۱، ۳۸۳، ۳۸۴
(امام) محمد ۱۱۲
(مولانا) محمد احسن صدیقی ۲۲۱، ۲۷۳
(مولانا شاہ) محمد اسحاق عمری دہلوی ۱۹۱، ۳۴۸
۳۴۹، ۳۵۵، ۳۶۰-۳۵۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۶

(قاضی) محمد اسلم ہروی کابلی ۴۷

(مولانا شاہ) محمد اسماعیل شہید ۹۱، ۲۸۶، ۳۲۱، ۳۴۰، ۳۴۵، ۳۴۲، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۸۰، ۳۸۵، ۳۸۷

(سلطان) محمد اعظم شاہ ۴۷

(میاں) محمد اعظم عثمانی نصیر آبادی ۱۴۲

(مولانا) محمد اعلیٰ تھانوی ۵۹

(حضرت شاہ) محمد آفاق دہلوی ۳۵۹

(الحاج) محمد افضل ۴۰۹

(شیخ) محمد افضل سیالکوٹی ۱۱۳، ۴۰۹

(مولانا شاہ) محمد افضل عمری ۳۷۹

(پروفیسر) محمد اقبال ۲۸۵

(مولوی) محمد اکرم ندوی ۴۰۴

(حضرت مولانا) محمد الیاس کاندھلوی ۱۱

(ابوالفرید) محمد امام الدین ۳۵۷

(خواجہ) محمد امین ولی اللّٰہی کشمیری (جمال الدین شاہ) ۱۲۲، ۱۲۷، ۱۹۰، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۸۱، ۴۰۳، ۴۰۹

(مولانا) محمد اویس ندوی نگرامی ۱۶۴، ۴۰۳

(ڈاکٹر) محمد باقر ۱۰۶

(مولانا) محمد برہان الدین سنبھلی ۱۳

(مولانا) محمد بشیر سہسوانی ۳۶۰

(مولوی) محمد بشیر الدین صدیقی ۱۱۷

(حضرت) محمد بن ابی بکر الصدیق رض ۳۸۸

(شیخ) محمد بن احمد السفارینی ۳۳

(الامیر) محمد بن اسماعیل الحسنی الصنعانی ۲۵، ۳۳

(شاہ) محمد بن حسن غوثی ملاوی ۶۵

(امیر) محمد بن سعود ۳۹۵

(شیخ) محمد بن شاہ ولی اللہ ۱۰۵، ۲۲۱، ۲۲۵، ۳۵۱

(علامہ) محمد بن عبد الباقی الزرقانی ۳۳

(امیر) محمد بن عبد اللہ ۲۲

(شیخ) محمد بن عبد الوہاب النجدی ۲۱، ۹۷، ۳۹۴

(حضرت سید) محمد بن شاہ علم اللہ ۱۱۸

(علامہ) محمد بن علی الشوکانی ۲۵، ۳۳

(سلطان) محمد بن قلاؤون ۲۹۴

(شیخ) محمد بن ناصر نجدی ۳۶۰

(سردار) محمد بے (ابوالذہب) ۲۲

(شیخ) محمد پھلتی صدیقی ۷۵، ۷۶، ۸۸، ۹۷، ۹۸، ۱۰۷، ۴۰۶

(شیخ سید) محمد ترمذی ۸۲

(شیخ) محمد جاد پھلتی ۱۲۲، ۳۴۷

(مولانا) محمد حسن فرنگی محلی (ملا حسن) ۵۹

(مولوی) محمد حسین آزاد ۳۵۱

(مولانا) محمد حسین بٹالوی ۳۶۰

(مولانا) محمد حیات سندی ۳۲، ۱۹۹

(نواب) محمد خاں عالم خاں بہادر تہور جنگ ۳۷۹

(مولانا حافظ) محمد رحیم بخش دہلوی ۱۶۶، ۴۰۲

(ڈاکٹر) محمد رواس قلعہ جی ۲۷۱

(شیخ الحدیث مولانا) محمد زکریا سہارنپوری ۱۹۲، ۱۹۳، ۳۶۰

محمد ساقی مستعد خاں ۴۳

(پروفیسر) محمد سرور ۴۰۴

(خواجہ) محمد سعید ۳۴۴

(علامہ) محمد سعید السنبل ۳۳
(سلطان) محمد شاہ ابن جہاں شاہ ۱۲۶، ۱۴۷، ۱۵۱
۵۳-۵۷، ۶۱، ۱۱۵، ۲۹۲، ۳۰۳
(سید) محمد صابر چشتی ۳۹۱
(خواجہ) محمد صادق ۳۴۴
(مولانا) محمد صادق مدراسی ۳۱۲
(علامہ) محمد طاہر پٹنی ۱۶۴، ۱۶۷، ۱۶۹
(شیخ) محمد عابد شامی ۶۰
(شیخ) محمد عاشق پھلتی ۷۶، ۱۱۳، ۱۱۵، ۱۲۲
۱۲۶، ۲۲۰، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۳۳، ۳۳۷، ۳۴۸
۳۸۱، ۳۸۴، ۳۸۷، ۳۹۱، ۳۹۴
(شیخ) محمد عاقل ۷۵
(میر) محمد عتیق ۱۳۲
(حضرت سید) محمد عدل (شاہ عدل) ۱۱۹
(مولانا سید) محمد علی حافظ رامپوری ۳۷۶
(حجۃ الاسلام امام ابو حامد) محمد الغزالی ۱۲۵، ۱۲۸
۲۱۹، ۲۲۷، ۲۵۶، ۳۲۳
(شاہ) محمد غوث قادری لاہوری ۶۰
(شیخ) محمد غوث گوالیاری ۱۷۳
(مولانا) محمد فاخر زائر الہ آبادی ۱۹۸
(شیخ) محمد فاکہی حنبلی ۱۷۹
(مولوی) محمد فائق پھلتی ۱۰۷، ۱۲۲
(استاد) محمد فرید المحامی ۲۱
(حضرت مولانا) محمد قاسم نانوتوی ۳۶۰
(مفتی) محمد قلی خان کنتوری ۳۶۲
(حکیم مرزا) محمد کامل دہلوی ۳۶۲
(شیخ) محمد مالکی مصری ۱۷۹
(استاد) محمد المبارک ۲۱۶
(خواجہ) محمد معصوم ۳۴۳-۴۶
(سید) محمد معین (ابن سید محمد ضیاء) ۱۲۷
(مولانا) محمد معین سندھی ۱۹۰
(استاد) محمد المغربی ۱۱۲
(شیخ) محمد میرداد انصاری ۳۹۳
(خواجہ) محمد ناصر عندلیب ۶۰
(مولانا سید) محمد نعمان حسنی ۱۱۸، ۱۴۲
(مولانا) محمد واضح حسنی رائے بریلوی ۳۴۸، ۳۹۴
(شیخ) محمد وفا الشرباکی ۱۱۲، ۱۹۹
(مولوی) محمد ہارون ندوی ۱۳
(خواجہ) محمد یحییٰ ۳۴۴
(مولانا) محمد یحییٰ کاندھلوی ۳۶۰
(مولانا شاہ) محمد یعقوب دہلوی ۸، ۱۲۵، ۱۲۹، ۲۸۰
(شیخ) محمود ۹۹
(سلطان) محمود اول ۳۰، ۳۲
(شیخ الہند مولانا) محمود حسن دیوبندی ۳۶۰
(سلطان) محمود خان خلجی ۲۶
محمود خان محمود بنگلوری ۳۷۴
(سلطان) محمود غزنوی ۲۹، ۳۰، ۱۰۶
(سلطان) محی السنۃ بن کام بخش ۲۶، ۷۷
(شیخ اکبر) محی الدین ابن عربی ۱۸۴، ۲۱۲
مختار عراقی ۲۷۰
المرادی ۳۳، ۳۴

(مولوی سید) مرتضیٰ نقوی ۱۳

(علامہ سید) مرتضیٰ بلگرامی زبیدی ۱۹۰

(فاضل) مرزا جان ۳۶، ۳۸

مرشد قلی خاں (فوجدار) ۲۸۸

(خلیفہ) مروان بن محمد (مروان الحمار) ۳۰۴

(خلیفہ) مسترشد باللہ ۲۶۰

(خلیفہ) مستعصم باللہ ۲۶۰، ۲۶۱، ۳۰۴

مسعود انور علوی علیگ ۳۹۱

(امیر) مسعود بن سعید ۲۳

(سلطان) مسعود سلجوقی ۲۶۰، ۲۶۱

(مولانا) مسعود عالم ندوی ۳۹۵

(سید سالار) مسعود غازی ۳۳۰

(امام) مسلم ۳۵

(سلطان) مصطفیٰ ثانی ۲۰

(سلطان) مصطفیٰ ثالث ۲۰، ۲۱

مصطفیٰ خاں ۲۱

(سید) المطہر ۲۵

(خلیفہ) المطیع للہ ۲۳

(حضرت مرزا) مظہر جان جاناں ۶۰، ۱۱۳، ۱۹۰، ۲۹۰، ۳۴۸، ۳۵۸، ۴۰۲

(حضرت) معاویہؓ ۲۶۵، ۲۷۰

(سلطان) معز الدین جہاندار شاہ ۴۶، ۴۷

(شیخ) معظم ۶۹-۷۱

(شیخ) معمر ابراہیم بن داؤد دانیپوری ۱۷۹

(مخدوم) معین الدین سندھی ۱۱۴

معین الملک (میر منو) ۲۸۴

ملا زادہ ۱۰۰

ملہر راؤ ہلکر ۲۷۶، ۳۰۷، ۳۱۹

(مولانا سید) مناظر احسن گیلانی ۳۲۶

(الحاج) منصور محمد ۴۱۱

(شیخ) منصور ۶۹، ۷۰

(شاہ) منیب اللہ بالاپوری ۶۰

(ملکہ) مہرپرور ۵۴

(امیر قاضی) میر زاہد دیکھئے زاہد

(خواجہ) میر درد ۶۰

(ن)

(سلطان) نادر شاہ افشار ۱۷، ۲۹، ۴۶، ۵۱، ۵۵، ۵۶، ۲۹۱، ۲۹۳

(قاضی) ناصر الدین بیضاوی ۱۰۰

(مولوی سید) ناصر حسین ۳۶۲

(امام) ناصر الدین شہید سونی پتی ۱۰۶، ۱۰۷

(گرو بابا) نانک ۲۸۱، ۲۸۵

(مولوی) نثار الحق ندوی ۱۳

(نواب) نجف علی خاں ۳۶۳

(نواب) نجیب الدولہ ۵۸، ۲۷۶، ۲۸۰، ۲۸۹، ۲۹۷، ۳۰۵-۷، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۲، ۳۱۵، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰

(مولانا سید) نذیر حسین محدث دہلوی (میاں صاحب) ۱۱۲، ۳۵۹

(امام) نسائی ۳۵، ۲۰۷

(شاہ) نصیر ۳۵۱
(مولوی) نصیر الدین (صاحب نجیب التواریخ) ۳۰۵
(حضرت سید) نصیر الدین چراغ دہلی ۳۰۳
(امیر الممالک) نصیر الدین ۱۰۶
(خواجہ) نصیر الدین طوسی ۳۵، ۳۸۸
(سلطان المشائخ خواجہ) نظام الدین اولیاء ۶۵، ۲۷۷، ۳۰۲
(استاذ العلماء ملّا) نظام الدین سہالوی فرنگی محلی ۶۰، ۱۰۱، ۱۸۲
(وزیر) نظام الملک طوسی ۲۵۶
(ملّا) نظام الدین برہانپوری (سرشتۂ تدوین فتاوی عالمگیر) ۸۴، ۸۵
(علامہ سید) نعمان خیر الدین آلوسی بغدادی ۱۱۱، ۳۸۵
(سید) نور الجبار سونی پتی ۷۱
(مولوی) نور الحسن راشد کاندھلوی ۱۳، ۱۲۸، ۲۷۳
(علامہ مفتی) نور الحق دہلوی ۱۸۰، ۱۸۱
(امیر) نور العلماء ۸۲، ۸۳
(مولوی) نور محمد ۱۱۵
(شاہ) نور محمد بدایونی ۶۰
(مولانا) نور اللہ بڈھانوی ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۹۰، ۳۹۲
(امام) نوویؒ ۲۴۲
(میاں) نیاز گل خاں ۳۰۵
(سلطان) نیکو سیر ۳۶

(و)

(شیخ) وجیہ الدین شہیدؒ ۶۲، ۶۸، ۶۹، ۷۱، ۷۶، ۷۳-۸۷، ۹۱
(حکیم الاسلام شاہ) ولی اللہ دہلوی پوری کتاب
(مولانا) ولایت علی عظیم آبادی ۳۴۷، ۳۷۶
ولایتی بیگم ۳۶۸
ولیم ایل لینگر ۲۸
(شیخ) ولی محمد نارنولی ۸۲

(ہ)

(مرزا) ہادی رسوا لکھنوی ۳۶۲
(جنرل) ہارس (HARRIS) ۳۶۷
(خواجہ) ہاشم نقشبندی ۸۰
(سید) ہاشمی فرید آبادی ۵۳، ۵۴، ۶۱، ۶۲
ہرچرن داس ۲۸۸
ہرہردیو ۱۰۶
ہرگووند ۲۸۲، ۲۸۳
(شہنشاہ) ہمایوں ۱۸
ہمر (HEMER) ۲۱
(ملہر راؤ) ہولکر دیکھئے ملہار
ہندو راؤ ۳۶۹

(ی)

یار محمد ۲۸۷
(امام) یحییٰ بن یحییٰ مصمودی ۱۹۳
(مولانا) یحییٰ علی صادقپوری ۳۷۳
(خلیفہ) یزید بن معاویہ ۲۷۰، ۲۷۲
(شیخ) یعقوب بن حسن کشمیری ۱۷۹
یعقوب علی خاں (قلعہ دار) ۲۷۷

کتابیات

قرآن مجید

(الف)

آب حیات ۳۵۱

وفیات الأعیان ۲۵۶

ابن کثیر (البدایہ والنہایہ) ۲۶۱

اتحاف السادۃ المتقین لشرح احیاء علوم الدین ۱۹۰

آثار الصنادید ۱۲۸

الأحکام السلطانیہ والولایات الدینیہ ۲۵۵، ۲۵۷

احیاء علوم الدین ۳۲۳، ۳۲۴

اخبار الأخیار ۶۵

الأربعین ۳۹۸

ارجوزۃ اصمعی ۳۵۴

الارشاد الی مہمات علم الاسناد ۱۰۰، ۱۰۵، ۳۲۸

ارشاد الطالبین ۴۱۳

ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء ۱۲۵، ۵۵-۲۴۹، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۶، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۳، ۲۹۶، ۳۲۱، ۳۴۱، ۳۶۱، ۳۹۹

اسرار المحبۃ (رسالہ) ۳۸۳

الاسفار الأربعہ ۳۶

اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۳، ۳۶۱

اسلامی مزاج وماحول کی تشکیل وحفاظت میں حدیث کا بنیادی کردار (رسالہ) ۱۷۰، ۱۷۶، ۲۱۶

اشراق ہیاکل النور ۳۶

اصول بزدوی ۱۰۰

اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ ۴۰۹

اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم ۳۹۹

الأعلام (زرکلی) ۲۳، ۱۱۰

الأفق المبین ۳۶

ألطاف القدس ۱۲۵، ۳۹۹

الامداد فی مآثر الأجداد ۶۶، ۷۳، ۳۹۹، ۴۰۰

الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ ۳۹۳، ۳۹۹

انسان العین فی مشائخ الحرمین (رسالہ) ۶۶، ۹۷، ۱۲-۱۰۹، ۱۹۹، ۴۰۰

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ۳۱۳

انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم ۲۷، ۲۸

الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف ۱۹۴، ۱۹۵، ۲۰۳، ۴۰۰

انفاس العارفین ۶۶، ۶۷، ۷۷، ۷۸، ۸۰-۸۶، ۸۹، ۹۷، ۹۸، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۲۵، ۲۰۱، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۳، ۴۰۶

الأوائل السنبلیہ فی أوائل کتب الحدیث ۳۳

اوجز المسالک ۱۹۲، ۳۶۰

اہل السنة والجماعة (رسالہ) ۱۶۷

آیات اللہ الکاملہ ۲۲۱

ایضاح الحق الصریح فی احکام المیت والضریح ۳۷۸

AURANGZEB ۴۳-۴۵

AURANGZEB AND HIS AGE ۴۳

AHMAD SHAH DURRANI ۳۱۳

A HISTORY OF THE SIKHS GUARD ۲۸۲

ORME COLLECTIONS ۲۸۸

ب پ

البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع ۳۳

البدور البازغة ۴۰۰

بذل المجہود ۳۶۰

البرق الیمانی فی الفتح العثمانی ۲۵

برہان (رسالہ) ۱۲۸، ۳۹۱

بستان المحدثین ۲۵۳، ۳۵۸

البعث الاسلامی (مجلہ) ۴۰۴

بلوغ المرام ۳۳

بوارق الولایة (رسالہ) ۴۰۰، ۴۰۱

بوستان ۱۳۵

البیان فی علوم القرآن (مقدمہ تفسیر حقانی) ۱۳۵

بیضاوی شریف ۷۷، ۹۹، ۳۵۶

PARTIES AND POLITICS IN THE MUGHAL COURT ۴۸

PORTUGUESES ۲۷۹

ت

تاج العروس ۱۹۰

تاریخ اخبار وآثار ۳۵

تاریخ اورنگ زیب ۲۸۸

تاریخ دعوت وعزیمت ۹، ۱۱، ۱۵، ۱۶، ۲۳، ۴۳، ۶۸، ۹۴، ۱۲۵، ۱۳۶، ۱۴۷، ۲۵۸، ۲۹۴، ۳۲۴، ۳۳۹

تاریخ الدولة العلیة العثمانیہ ۲۱

تاریخ سلطنت خداداد میسور ۳۶۷

تاریخ فیروز شاہی ۶۸

تاریخ المذاہب الاسلامیہ ۲۴

تاریخ نثر اردو ۱۴۸

تاریخ ہند ۵۳، ۵۴، ۶۲، ۲۷۹

تاریخ ہندوستان ۴۵، ۴۸-۵۲، ۵۵، ۵۶، ۵۸، ۲۷۸، ۲۸۰، ۲۸۲، ۲۸۹، ۳۰۶، ۳۰۷، ۲۱۸-۲۰

تاویل الاحادیث ۴۰۱

تبییض المصفی شرح الموطا ۳۸۹

تحفہ اثنا عشریہ ۳۵۳، ۳۶۱، ۳۶۳، ۳۶۴

تحفة الاحوذی ۳۶۰

تحفة الموحدین ۱۴۲، ۱۴۴، ۴۰۲

تحقیق و انصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ (رسالہ) ۳۷۶

تذییل شفاء الغرام لاخبار البلد الحرام ۲۴

تراجم البخاری (رسالہ) ۱۹۳

تراجم ابواب البخاری (رسالہ) ۱۹۳، ۴۰۲

تعبیر رؤیا (رسالہ) ۳۵۴

التعلیق الممجد علی مؤطا الامام محمد ۲۵۱

التفسیرات الاحمدیہ ۵۹

تفسیر تبصیر الرحمٰن وتیسیر المنان ۱۹۹

تفسیر حقانی ۱۳۵، ۲۲۸

تفسیر روح المعانی ۲۶۹

تفسیر زہراوین ۴۰۵

تفسیر فتح الرحمٰن ۱۳۱، ۱۴۲، ۱۳۵، ۱۴۶، ۴۰۰، ۴۱۲

تفسیر فتح العزیز (تفسیر عزیزی۔ بستان التفاسیر) ۳۵۳، ۳۵۶

تفسیر کشاف ۱۰۰

تفسیر مدارک ۹۹

تفسیر مظہری ۱۹۰

التفہیمات الالٰہیہ ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۶۵، ۱۶۸، ۱۸۹، ۳۲۱، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۸، ۳۹۹، ۴۰۲، ۴۱۳

تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار ۳۴۵

تقویۃ الایمان ۳۴۸

تکملہ تفسیر فتح الرحمٰن ۳۵۷

تکمیل الصناعۃ ۳۸۴

تلبیس ابلیس ۳۲۴

التمہید ۳۹۰

تنبیہ الغافلین ۸۷

تنقیح الأنظار توضیح الأفکار ۳۳

التوحید الذی ہو حق اللہ علی العبید ۲۹۲

توضیح وتلویح ۱۰۰

ج چ

جامع الترمذی ۱۸۳، ۳۴۷

جائزہ تراجم قرآنی ۱۳۵، ۱۳۹

الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف ۸۸، ۹۶، ۹۹، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۹، ۱۱۰، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۰، ۴۰
۳۰۲، ۱۳، ۴۰۹

جلاء العینین فی محاکمۃ الاحمدین ۱۱۱
۱۱۲، ۱۶۸

جلالین ۳۵۶، ۳۸۵

جواہر خمسہ ۱۴۷

چہار گلزار شجاعی ۲۸۸

چہل حدیث ولی اللّٰہی (اربعین ولی اللّٰہی) ۳۹۸

ح خ

حاشیہ خیالی ۸۱، ۸۲

حاشیہ شرح عقائد ۸۱

حاشیہ ملا زادہ ۱۰۰

حاشیہ ملا کوسج ۳۵۴

حاضر العالم الاسلامی ۳۹

حجۃ اللّٰہ البالغہ ۱۰۱، ۱۲۵، ۱۵۸، ۱۶۰
۱۲۲، ۱۶۷، ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۹۳، ۱۹۵، ۲۰۱
۲۰۳، ۲۰۵، ۲۰۸، ۲۱۰، ۲۹–۲۱۵، ۲۳۷
۲۳۷–۲۳۹، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۱، ۲۵۴، ۲۷۰
۲۹۹، ۳۲۱، ۳۲۶، ۳۹۹، ۴۰۱، ۴۰۳

حسام الاسلام ۳۶۵

حسامی ۱۰۰

حسرة العالم بوفاة مرجع العالم (رسالہ) ۶۸
حسن العقیدہ دیکھئے العقیدۃ الحسنہ
حفظ الایمان (رسالہ) ۳۹۹
حصن حصین ۳۴۷
الحکومۃ الاسلامیۃ ۲۵۲
حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۱۸۱
حیات ولی ۹۶، ۱۱۴، ۱۲۱، ۴۰۲، ۴۰۷
خلاصۃ الکلام ۲۳
خیالی ۱۰۰
الخیر الکثیر ۲۰۳

(د) (ذ)

دار الحکومت دہلی ۱۱۵
دائرہ معارف اسلامیہ ۲۸۵
دراسات اللبیب فی الأسوۃ الحسنۃ بالحبیب ۱۹۰
الدرّ الثمین فی مبشّرات النبی الامین ۲۲۴
درّ مختار ۳۶۸
الدرر المصنوعات فی الاحادیث الموضوعات ۳۳
دستور الانشاء ۲۸۷
دستور حیات ۱۳۳، ۱۶۵
دمغ الباطل ۳۸۳
دور الحدیث فی تکوین المناخ الاسلامی وتنمیتہ ۱۷۰
دہلی اور اس کے اطراف ۱۱۶، ۱۱۷
دیوان اشعار ۴۰۳
الذکر الجلی فی کرامات السید محمد علی ۳۷۶
ذو الفقار (کتاب) ۳۶۵

(ر) (ز)

الرحیم ۴۰۴
ردّ روافض ۴۰۲
رسالہ ۴۰۴
رسالہ دانشمندی ۴۰۴
رسالہ قطبیہ ۳۷
رسائل نقشبندیہ ۱۰۰
روح البیان فی تفسیر القرآن (تفسیر حقانی) ۳۳
روح المعانی دیکھئے تفسیر روح المعانی
ROLE OF HADITH IN THE PROMOTION OF ISLAMIC CLIMATE & ATTITUDES ۱۷۰
زاد المعاد ۱۶۴
زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث ۳۹۶
زواہد ثلاثہ ۳۷

(س)

سبل السلام ۲۵، ۳۳
سبیل الرشاد ۲۸۹
السرّ الجلیل فی مسئلۃ التفضیل ۳۵۳
سرّ الشہادتین (رسالہ) ۳۵۳
سرود محزون ۴۰۶

سطعات ۴۰۵

سلک الدرر فی أعیان القرن الثانی عشر
۳۳-۳۵

سلّم العلوم ۳۶۱،۵۹

سنن ابن ماجہ ۳۴۷،۱۹۳

سنن ابی داؤد ۳۴۷،۱۸۴

سنن بیہقی ۲۷۲،۱۶۴

سنن النسائی ۳۴۷

سوانح احمدی ۳۷۶

سید احمد شہید (مہر صاحب) ۳۷۶

السیاسة الشرعیة فی اصلاح الراعی والرعیہ
۲۵۷

سیر الاولیاء ۶۵

سیرت سید احمد شہید ۲۸۲،۹۲،۴۱،۳۰،۱۱
۳۷۷،۳۷۶،۳۶۹-۷۱،۳۴۰،۳۲۲

سیر المتاخرین ۲۸۱،۵۲،۴۷-۴۹

سیف ناصری ۳۶۵

(ش)

شافیہ ۱۴۴

شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات ۲۸۷
۳۱۴-۱۷،۳۰۳-۱۰،۳۰۱،۲۹۶،۲۸۸
۳۲۰،۳۱۹

شرح اشارات ابن سینا ۳۵

شرح تراجم ابواب صحیح البخاری ۴۰۶،۱۹۳

شرح تہذیب ۳۷

شرح جامی ۱۰۰،۳۵

شرح دعائے اعتصام ۳۸۹

شرح رباعیات (جامی) ۱۰۰

شرح سلّم (حمد اللہ) ۵۹

شرح سلّم (ملا حسن) ۵۹

شرح سلّم (قاضی) ۵۹

شرح شمسیہ ۱۰۰

شرح عقائد ۱۰۰،۸۱

شرح مطالع ۱۰۰

شرح مواقف ۱۰۰،۸۲،۳۷

شرح وقایہ ۱۰۰،۳۸،۳۷

شرح ہدایة الحکمة ۳۵۴،۱۰۰،۳۶

شفاء العلیل ۴۱۱،۴۱۰،۳۴۸

شفاء القلوب ۴۰۶

شمائل ترمذی ۳۴۷،۱۸۱،۱۰۵،۹۹

شمائل نبوی ۱۱۰

شوارق المعرفة (رسالہ) ۴۰۶،۴۰۰

(ص)

صحاح ستہ ۱۹۲،۱۸۳،۱۷۴،۱۱۲،۳۲
۳۵۸،۳۴۷

صحیح بخاری ۱۹۲،۱۸۱-۸۳،۱۳۹،۱۱۲،۹۹
۴۰۶،۲۵۹،۲۴۷،۲۱۸

صحیحین ۱۱۲

صحیح مسلم ۳۴۷،۱۸۳،۱۷۸،۱۳۹،۹۶

صدرا (شرح ہیاکل النور) ۳۷،۳۶

صراط مستقیم ۳۴۰
صوارم الالٰہیات ۳۶۵
صیانۃ الناس عن وسوسۃ الخناس
۳۷۵، ۳۷۶

(ط) (ظ)

طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ۷۸، ۲۵۶
طریق النجاۃ ۳۶۰
ظفرنامہ شاہجہاں ۴۴

(ع) (غ)

عبقات الانوار فی امامۃ الأئمۃ الأطہار
۳۶۱، ۳۷۸
العجالۃ النافعۃ ۳۵۳، ۳۵۸، ۳۹۰
عرب و دیار ہند ۱۹۹
عزیزیہ (حاشیہ) ۳۵۴
العطیۃ الصمدیہ فی الأنفاس المحمدیۃ
۷۵، ۴۰۰، ۴۰۶
عقائد الاسلام ۲۳۸
عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید
۱۹۵، ۲۱۲، ۴۰۶
العقیدۃ الحسنۃ (حسن العقیدۃ)
۱۶۴، ۱۶۵، ۴۰۳، ۴۰۶
العقیدۃ التسنیہ ۱۶۴، ۴۰۳
العقیدۃ والعبادۃ والسلوک ۱۶۴
علم الکلام ۲۳۸
عنوان المجد ۲۳
عوارف ۱۰۰

غایۃ المقصود ۳۶۰
غرائب القرآن ۱۴۵
غنیۃ الطالبین ۸۷
غیاث الأمم فی التیاث الظلم (الغیاثی)
۲۵۶

(ف)

فتاویٰ عالمگیریہ (الفتاوی الہندیہ) ۳۴۳، ۴۳۱، ۸۴
فتاویٰ عزیزی ۳۶۹
الفتاوی فی المسائل المشکلۃ ۳۵۳
فتح الباری ۱۱۰، ۳۸۰
فتح الخبیر ۴۰۷
فتح الرحمن دیکھئے تفسیر فتح الرحمن
فتح المعین ۱۹۹
فتح الودود لمعرفۃ الجنود ۴۰۷
فتوحات مکیہ ۳۵
الفرقان (رسالہ) ۱۹۲، ۲۹۳، ۳۲۶، ۳۴۱
۳۴۲
فصوص الحکم ۳۵، ۸۴
الفضل المبین فی المسلسل من حدیث
النبی الأمین (رسالہ) ۱۹۳، ۴۰۷
الفوائد المأتۃ ۱۰۰
الفوز الکبیر فی أصول التفسیر ۱۳۹، ۱۴۰
۵۳ — ۱۵۰، ۱۵۶، ۱۵۸، ۳۹۹، ۴۰۷
فیوض الحرمین ۱۱۴، ۱۲۵، ۱۹۸، ۴۰۷
فال آف دی مغل امپائر ۵۴، ۲۷۸، ۳۰۶

ق

قاموس ۱۹۰
قرۃ العین ۲۰۳
قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین ۲۰۷
قصر عارفان ۱۰۶
قوت القلوب ۲۰۵
القول الجلی فی مناقب الولی ۸۸، ۹۷
۹۸، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۳، ۲۹۲، ۳۸۹
القول الجمیل فی بیان سواء السبیل
۲۹۳، ۳۰۸، ۳۰۹

ک

کاروان ایمان و عزیمت ۳۴۰، ۳۷۲، ۳۸۰
کافیہ ۹۹، ۱۰۰، ۱۴۴
کتاب الآثار ۱۱۲
کتاب الخراج ۲۵۵
کشاف اصطلاحات الفنون ۵۹
کشف الخفا و مزیل الالباس عما اشتہر
من الاحادیث علی ألسنۃ الناس ۳۲
کشف الغطاء عن السنۃ البیضاء ۲۷۴
کلکتہ گزٹ ۳۶۷
کلمات طیبات ۷۰، ۱۸۶، ۱۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱
۴۱۳
کمالین ۱۸۱
کنز العمال ۱۶۷، ۱۹۹
کیمبرج ہسٹری آف انڈیا ۴۲
کیمبرج ہسٹری آف دی ورلڈ ۴۲

گرنتھ ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۵
گلزار ابرار ۶۵
گلستان ۱۴۵

ل

لُبّ الالباب ۱۰۰
لسان العرب ۲۲۵
لمعات ۴۱۲
لوائح ۱۰۰
LATER MUGHALS ۲۸۷

م

مآثر الاجداد دیکھئے الامداد فی مآثر الاجداد
مآثر عالمگیری ۴۳
مآثر الکرام ۶۱، ۶۲
مالا بد منہ ۱۹۰
مجمع بحار الأنوار ۱۶۷، ۱۶۹
مجموعہ خمسہ رسائل شاہ ولی اللہ ۳۹۹، ۴۰۰
۴۱۳
مجموعہ رسائل اربعہ ۱۹۳، ۴۰۲
مجموعہ رسائل شاہ ولی اللہ ۶۷، ۱۴۳، ۷۵
۱۲۵
مجموعہ کشف الأستار عن رجال معانی
الآثار ۱۱۰
مجموعہ مکتوبات شاہ عبدالرحیم و شاہ ولی اللہ
۳۰۵
محلّی ۱۸۱

محمد بن عبد الوہاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح ۳۹۵
مختارات ۲۳۵
مختصر المعانی ۳۵، ۱۰۰
المرآۃ الوضیۃ فی النصیحۃ والوصیۃ
(المقالۃ الوضیۃ فی النصیحۃ والوصیۃ)
(وصیت نامہ) ۹۳، ۹۴، ۱۶۵، ۱۹۳، ۴۱۲
مرقاۃ ۱۶۶
مسلسلات (رسالہ) ۱۹۴، ۲۰۲، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰
۴۰۷، ۴۱۳
مسلم الثبوت ۵۹، ۳۶۱
مسند امام احمد ۱۱۰
مسند دارمی ۱۱۴
المسوّی فی احادیث المؤطا ۱۹۴، ۲۴۷
۴۱۲
مشارق الانوار ۱۰۱، ۱۶۸
مشکوٰۃ المصابیح ۱۲، ۷۷، ۸۷، ۹۹، ۱۶۶
۲۷۲، ۳۴۷
مصابیح ۳۹۳
مصابیح السنۃ ۱۶۸
مصباح ۱۰۰
مصفّٰی ۱۹۲، ۲۰۳، ۲۱۳، ۲۱۴، ۴۱۲
مضامین عالمگیر ۴۳
مطول ۱۰۰
مظاہر حق ۳۵۹
مفتاح کنوز السنۃ ۱۸۴
مقاصد الشریعۃ الاسلامیہ ومکارمہا
۲۱۶
مقالات سلیمانی ۹۴
مقالات طریقت ۱۰۵، ۳۴۹، ۳۵۷
۳۶۵
مقامات حریری ۱۰۱، ۱۰۲
مقدمہ ابن خلدون ۲۶، ۲۹۹
المقدمۃ البنیہ فی الانتصار للفرقۃ
السنیۃ ۴۱۲
مقدمہ شرح اللمعات ۱۰۰
المقدمۃ فی قوانین الترجمۃ ۴۱۲
مقدمۃ نقد النصوص ۱۰۰
مکتوبات امام ربانی ۹۵
مکتوبات معہ مناقب امام بخاری وفضیلۃ
ابن تیمیۃ ۴۱۳
المکتوب المدنی ۴۱۲
مکتوب المعارف ۱۰۵، ۱۱۹، ۱۲۷، ۳۹۴
ملفوظات عزیزی ۳۸، ۹۱، ۹۲، ۱۱۱
۱۱۵، ۱۱۸، ۱۲۸، ۲۹۱، ۳۵۶
منار (رسالہ) ۱۰۰
المنار (مجلہ) ۱۸۳
مناقب حیدریہ ۳۵۰
منتہی الکلام ۳۵۷، ۳۸۱
منصب امامت ۳۶۸

منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین ۱۳۵

منصور ۱۲۵

منہاج السنہ ۲۵۸

موجز ۱۰۰

موسوعۃ فقہ عمر بن الخطاب ۲۷۱

موضح القرآن ۱۲۰، ۱۳۱، ۱۴۹، ۳۸۶، ۳۸۷، ۴۰۷

مہر جہاں تاب ۳۸۶

مؤطا امام مالک ۱۱۲، ۱۹۲، ۱۹۳، ۲۰۲، ۳۴۷، ۴۱۲

مؤطا یحیی بن یحیی ۱۱۲، ۱۹۲

MACAUFFE ۲۸۵

مسلم رول ان انڈیا ۴۲

میر زاہد (رسالہ) ۳۵۴

میر زاہد شرح مواقف ۳۵۴

میر زاہد ملا جلال ۳۵۴

میزان البلاغۃ (رسالہ) ۳۵۳

میزان الکلام (رسالہ) ۳۵۳

(ن)

النبذۃ الابریزیۃ فی اللطیفۃ العزیزیۃ ۷۳، ۴۰۰، ۴۱۳

نجوم السماء (کتاب) ۳۶۲

نجیب التواریخ ۳۰۵

نزہۃ الخواطر ۶۰، ۷۳، ۷۶، ۸۲

۱۰۵، ۱۳۱، ۱۱۶، ۱۱۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۸، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۵۴، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۵، ۳۸۷، ۳۹۰، ۳۹۱

نصب الرایۃ فی تخریج احادیث الہدایۃ ۱۹۵

نظام الملک طوسی ۳۵۶

نعمۃ اللہ السابغۃ ۲۲۱، ۲۴۸

النوادر من احادیث سید الاوائل والاواخر ۴۰۴، ۴۱۳

نور الانوار ۵۹

نور العیون فی سیر الامین المامون ۴۰۶

نیل الاوطار ۲۵، ۳۳

نہنگ سنگ سدیس (اخبار) ۲۸۳

جدید دنیائے اسلام (NEW WORLD OF ISLAM) ۳۹، ۴۱

(و)

(رسالہ) وصایا۔ یا۔ وصیت نامہ دیکھئے المرآۃ الوفیہ

وصیت نامہ (فارسی) ۲۰۲، ۳۴۱

وقائع احمدی ۳۷۲

(ہ) (ی)

ہدایہ ۱۰۰

الہواش الستۃ ۳۲

ہواش شرح حزب البحر ۴۱۵

ہمعات ۱۲۵، ۴۱۳
ہندوستان کا نظام درس اور اس کے تغیرات (رسالہ) ۱۰۱
ہسٹری آف دی افغانس (HISTORY OF THE AFGHANS) ۳۱۷
ہیاکل النور ۳۶
ہسٹری آف اورنگ زیب (HISTORY OF AURANGZEB) ۴۳
الیانع الجنی فی أسانید الشیخ عبد الغنی ۲، ۱۰، ۱۱، ۲۵۰، ۲۵۱، ۳۵۲، ۳۶۱، ۳۸۲

مقامات

(الف)
اٹک ۲۷۷
اجمیر ۲۸۷
احمد آباد ۱۷۹
آرہ ۴۰۲
اڑیسہ ۵۶، ۵۷، ۳۶۶
آسام ۴۲
استنبول ۱۱۴
اسلام آباد ۴۰۹
اصفہان ۲۶
اعظم گڑھ ۱۸۳، ۳۶۱
افغانستان ۱۶، ۱۸، ۱۹، ۲۶، ۲۹، ۳۰، ۳۷، ۳۸، ۱۳۷، ۱۴۲، ۱۷۵، ۱۹۹
افریقہ ۱۷۹، ۱۷۶
اکبر آباد ۱۷۹، ۱۸۲
آگرہ ۵۱، ۵۷، ۱۴۴، ۱۸۲، ۱۸۷-۸۹، ۱۹۶
الور ۲۸۹
الہ آباد ۵۸، ۳۲۰، ۳۶۷
امرتسر ۲۸۱، ۲۸۴
امروہہ ۲۷۷
اناطولیہ ۴۲
اندلس ۱۷۶
انڈونیشیا ۳۴
اورنگ آباد ۴۹، ۶۲
اودھ ۵۷، ۹۲، ۲۷۶، ۳۲۰، ۳۶۳
۳۶۳
ایران ۱۷-۱۹، ۲۵-۲۹، ۳۲، ۳۸-۴۵
۴۳، ۵۱، ۶۸، ۹۱، ۱۰۰، ۱۳۷، ۱۴۲
۱۷۶، ۱۷۷، ۲۵۲، ۳۶۳
ایشیائے کوچک ۱۹
(ب)
بارہ بنکی ۷۵

بارہہ ۵۱
بازارجق (TOBULKHIN) ۲۱
بائی کلّہ ۱۴
بجنور ۳۲۵
بحراحمر ۱۰۸
بحرروم ۲۲
بحرہند ۱۰۸
بحیرۂ خزر (CASPIAN SEA) ۲۷
بخارا ۲۷،۱۲۹،۱۶۰،۸۰
بخارسٹ ۲۱
برہانپور ۷۴
بڑھانہ ۱۰۵،۱۲۱،۲۹۲
بریلی ۲۲۱،۲۷۳
بغداد ۳۱،۳۳،۲۵۶،۲۶۰،۲۸۱
بکسر ۵۷،۳۶۷
بلخ ۲۷
بلوچستان ۲۷،۲۹
بمبئی ۱۴،۲۷۹
بنگال ۴۹،۵۶،۵۷،۲۷۸،۳۶۲،۳۶۶
بنگالہ ۴۷،۵۰،۷۳
بہار ۴۹،۵۶،۵۷،۳۶۲،۳۶۶
بھٹکل ۱۹۸
بہرائچ ۳۳۰
بھوپال ۲۲۱،۲۷۳،۳۷۵،۳۸۰،۴۱۲
بیانہ ۲۹۷
بیروت ۲۱،۲۲،۱۹۵

(پ)

پاک پٹن ۲۸۱
پاکستان ۳۹۸،۴۰۱،۴۰۹
پانی پت ۱۷،۵۷،۵۸،۲۷۷،۲۸۰
۲۸۴،۳۱۳،۳۲۰
پشاور ۲۷
پلاسی ۳۶۷
پنجاب ۲۹،۲۷۶،۲۸۱،۲۸۳-۸۵
۳۵۹،۳۷۰
پھلت ۷۵،۷۶،۹۷

(ت) (ٹ)

ترکستان ۱۸،۳۵،۶۸،۹۱،۱۳۷،۱۴۲
۱۷۷،۳۴۵
ترکی ۲۱،۲۴،۳۴،۳۹،۴۳،۳۴۵
توران ۵۲
تونس ۳۳،۱۷۶
ٹونک ۳۷۱،۴۱۲

(ج) (چ)

جدّہ ۱۰۹
الجزائر ۱۷۶
جزیرۃ العرب ۲۱،۹۳،۳۹۵
جمنا ۲۷۶،۲۸۷
جنۃ المعلاۃ ۳۸۰
چتلی قبر (دہلی) ۱۱۶

چٹاگانگ ۴۲

چنبل ۲۸۷

چوک سعداللہ خان (دہلی) ۱۲۲

(ح) (خ)

حجاز مقدس ۱۶، ۲۱–۲۵، ۳۲، ۵۵، ۹۱، ۹۳، ۹۷، ۱۰۲، ۱۰۷، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۵، ۱۷۳، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۸۶، ۱۹۱، ۱۹۹، ۲۰۰، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۷۹، ۳۹۵، ۳۹۸، ۴۰۷، ۴۰۹، ۴۱۲

حدیبیہ ۲۷۶، ۳۹۹

حرمین شریفین ۱۶، ۲۲، ۲۳، ۳۲، ۳۳، ۹۴، ۱۰۷–۱۳، ۱۴۶، ۱۷۴، ۱۷۹، ۱۸۲، ۱۹۱، ۱۹۹، ۲۰۱، ۲۸۱، ۴۰۹

حرم مکی ۱۷۵

حضرموت ۱۷۶

حلب ۳۲

حیدرآباد دکن ۵۲، ۶۲، ۱۷۴، ۱۹۳، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۸۰، ۳۶۸، ۳۷۶، ۳۹۵، ۴۰۶

حیدرآباد (پاکستان) ۴۰۱، ۴۰۴

خراسان ۱۰۶، ۱۷۸

خوارزم (خیوہ) ۲۷

خیبر ۲۶۷، ۲۹۳

(د) (ڈ)

درعیہ ۳۹۵

درۂ بولان ۱۷

درۂ خیبر ۱۷

درگاہ حضرت نظام الدین ۲۷۷

دریائے سندھ ۲۷

دریائے شور ۵۱

دمشق ۲۲، ۳۴، ۸۵، ۳۶۱

دوآبہ ۲۷۶

دہلی ۱۷، ۲۷، ۴۲، ۴۹، ۵۱، ۵۲، ۵۵، ۵۶–۵۸، ۶۱، ۶۶، ۶۸، ۷۴، ۹۲، ۹۴، ۱۰۰، ۱۰۹، ۱۱۱، ۱۱۳–۱۵، ۱۱۸، ۱۲۲، ۱۲۶، ۱۵۰، ۱۸۰–۸۲، ۱۹۰، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۸۲–۸۴، ۲۸۷–۹۳، ۲۹۶، ۲۹۸، ۳۰۷، ۳۱۱، ۳۱۹، ۳۴۱، ۳۵۷، ۳۵۹، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۷، ۳۸۰، ۳۸۵، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۲، ۴۰۷، ۴۱۲

دیوبند ۱۱۰، ۱۴۵

ڈابھیل ۲۷۴، ۳۲۵، ۴۰۴

(ر)

راجپوتانہ ۵۷، ۱۰۸

رامپور ۳۶۸

رام گنگا ۲۷۷

رائے بریلی ۱۱۸

روس ۲۰، ۲۱، ۲۶

روم ۲۷

روہیلکھنڈ ۲۷۶

رُہتک ۶۵-۶۹

(س)

سامانہ قصبہ ۹۵

سڈھو ۷۵

سرحد ۳۷۰

سرنگاپٹم ۳۶۷

سرہند ۲۸۳، ۲۸۴

سکندر آباد ۳۷۶

سکندرہ ۲۸۸

سمرقند ۶

سندھ ۱۰۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۹۰، ۲۰۴

سورت ۱۰۸، ۱۰۹، ۳۲۵

سونی پت ۹۹، ۱۰۶

سیواڑا ۷۴

(ش)

شام ۱۹، ۲۳، ۳۲، ۳۴، ۳۵، ۳۸
۴۳، ۱۳۶، ۱۷۳، ۱۷۶، ۱۸۴، ۲۷۰
۲۹۴

شاہ ابوالخیر مارگ ۱۱۶

شاہجہاں آباد ۱۲۸

شکوہ آباد ۲۹۶

شکوہ پور ۷۰

شیراز ۲۸، ۳۶، ۲۶۱

شیش محل روڈ ۱۲۴

(ص) (ط)

صادق پور ۳۷۲

طائف ۳۹۳

طہران ۳۵

(ع)

عالم اسلام-ممالک اسلامیہ ۹، ۱۱، ۱۵-۱۷
۲۰، ۳۰، ۳۱، ۳۴، ۳۹، ۶۸، ۱۶۳
۱۷۶، ۱۹۵، ۲۱۰، ۲۱۷، ۲۶۰، ۲۶۱

عرب-ممالک عربیہ ۱۹، ۲۷، ۱۱۶، ۱۵۶
۱۵۸-۶۰، ۱۷۴، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۸۳
۱۹۱، ۲۳۲، ۲۳۵، ۲۷۴، ۲۹۵، ۳۴۵
۳۱۳

عراق ۱۹، ۳۲، ۳۵، ۳۸، ۶۸، ۹۱
۱۳۶، ۱۷۶، ۱۸۴، ۲۷۰

علی گڑھ ۴۸، ۲۷۹

عیینہ ۳۹۵

(غ) (ف)

غزنی ۹۲، ۱۰۶، ۱۷۵

غزہ ۲۲

فاس ۳۳

فیروز آباد ۲۹۶

(ق)

قدس ۲۲

قدم شریف (دہلی) ۲۷۷

قسطنطنیہ ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۳۴

قطر ۲۵۶

قلعۂ آگرہ ۲۸۸، ۲۸۹

قلعۂ معلّٰی ۲۷۷، ۳۰۰

قندھار ۱۷، ۲۷، ۲۹، ۳۰، ۴۷، ۳۱۳، ۳۱۹، ۳۲۰

قنوج ۹۴، ۱۰۶

(ک گ)

کابل ۱۷، ۲۷، ۴۷، ۱۷۵

کابلی دروازہ (دہلی) ۳۰۲

کاکوری ۹۸، ۱۰۸، ۱۷۹

کالپی ۸۲

کانپور ۳۱۱

کڑہ ۹۲

کراچی ۲۲۱

کرناٹک ۴۲، ۱۹۸

کرنال ۲۷

کشمیر ۲۹، ۴۲، ۱۹۰

کلاں محل (دہلی) ۱۱۶

کلکتہ ۴۳، ۳۶۷، ۳۹۸، ۴۰۷

کھمبات ۱۰۸

کوچۂ فولاد خاں ۱۱۶

کویت ۳۷۱

کیرالا ۱۹۸

گجرات ۱۰۸، ۱۷۴، ۱۷۶، ۱۷۹، ۱۸۱

گوالیار ۲۸۲، ۳۶۹، ۳۷۰

(ل)

لاہور ۲۷، ۲۸، ۴۹، ۹۷، ۱۱۴، ۱۴۴، ۱۹۴، ۲۲۱، ۲۵۰، ۲۷۴، ۲۷۶، ۲۸۴، ۳۱۱، ۴۰۲، ۴۰۹

لدھیانہ ۲۸۴، ۳۶۱

لکھنؤ ۱۱۸، ۱۲۸، ۱۷۹، ۱۸۲، ۲۷۴، ۳۶۱، ۳۶۴، ۳۶۸، ۳۷۲، ۳۹۸

(م)

مالابار (بلاد المعبر) ۱۹۸، ۱۹۹

مالوہ ۶۵، ۷۲، ۱۰۸، ۳۱۹

مانڈو ۶۵

مانکپور ۹۲

ماوراء النہر ۱۷۸

متھرا ۲۸۸

مدراس ۱۹۸، ۳۹۳

مدینۃ الخلیل ۱۱۹

مدینۂ طیبہ ۱۶، ۱۰۹، ۱۱۱، ۱۱۳، ۲۰۷، ۲۶۵، ۲۷۲، ۳۶۵، ۳۹۳

مراکش ۱۷۶

مشہد ۲۹

مصر ۲۱-۲۳، ۳۲، ۳۳، ۴۳، ۵۹، ۱۳۶، ۱۷۳، ۱۷۶، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۹۲، ۱۹۵، ۲۲۱، ۲۹۴، ۳۸۰، ۴۰۸، ۴۱۱

مظفر نگر ۹۷

مکہ معظمہ ۱۶، ۲۳، ۱۰۹، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۷۰

۲۲۰، ۲۶۶، ۳۵۹، ۳۷۹، ۳۸۰، ۲۸۶
۳۹۳، ۳۹۵، ۴۱۲
ملتان ۱۰۰، ۱۰۶، ۳۱۳
منصورہ ۱۰۶
مہدیان (محلہ) ۱۱۵، ۱۱۷، ۱۲۸
میوات ۲۸۹، ۲۹۶

(ن) (و)

نابلس ۲۲
نجد ۲۱، ۳۹۴
نصیرآباد ۱۱۸
نوہڑیا ۷۴
نیشاپور ۲۵۶
واسط ۱۰۶

(ہ) (ی)

ہرات ۳۷، ۱۷۵
ہرگووندپور ۲۸۲
ہمالیہ ۵۳، ۲۷۷
ہندوستان۔ تقریباً پوری کتاب
ہنڈیا ۷۴
یافہ ۲۲
یمن ۲۴، ۲۵، ۳۲، ۳۳، ۱۷۳، ۱۷۶، ۱۹۹
یونان ۳۷، ۱۶۷، ۱۸۷